زیبا ناروی

احوال و آثار

مقالہ

برائے ایم۔اے اردو

۱۹۸۹ء

مقالہ نگار
تابندہ جبیں
متعلمہ ایم۔اے اردو

نگران
محمد فخر الحق نوری
معلم شعبہ اردو

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

انتساب

والدین کے نام

جن کی بے پایاں شفقتیں اور محبتیں میرے لیے متاعِ بے بہا ہیں



مسیح الکلام سید صغیر حسن زیبا ناروی صاحب (مرحوم)

(طرحی مشاعرہ ۱۷ بیمہ سرور لاہور منعقدہ ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء)

آج پردہ ہی سہی، کل بہ یقیں نظر بھی ہوگا — آئینہ ہے تو کوئی آئینہ گر بھی ہوگا

آسماں سے اتر آئیں گے ہزاروں جگنو — شام ہوتے ہی چراغاں مرے گھر بھی ہوگا

نیند کے بھیس میں آئی ہے شبِ ہجر اجل — دامِ ہر رنگِ زمیں خوابِ سحر بھی ہوگا

قصۂ درد کی سرخی کبھو نمایاں ہوگی — دیدۂ تر سے رواں خونِ جگر بھی ہوگا

نالہ کش ہونے کی مجھ کو ہے اجازت لیکن — یاد رکھنا کہ دعاؤں میں اثر بھی ہوگا

بھولی صورت سے ابھر آئے ہزاروں فتنے — کیا خبر تھی وہ حسیں شعبدہ گر بھی ہوگا

جرأتِ پردہ دری چاہیئے اے ذوقِ نظر — زیبِ مسند وہ پسِ پردۂ در بھی ہوگا

آ ہی جائے گا کوئی راہ پہ آتے آتے — اک نہ اک روز وہ مہماں مرے گھر بھی ہوگا

باہمی ربط ہے گیسو و رخِ جاناں میں عجب — ظلمتِ شب میں تماشائے سحر بھی ہوگا

دیکھ کر مجھ کو لبِ ناز وہ ہنس دیتے ہیں — اے جنوں ان پہ کبھی تیرا اثر بھی ہوگا

سبز پتوں کے مقدر میں کہاں یہ سرخی — شاملِ رنگِ حنا خونِ جگر بھی ہوگا

آپ اٹھئے تو سہی چہرۂ انور سے نقاب — انجمن میں کوئی شائستہ نظر بھی ہوگا

آئیں گے سامنے زیبا وہ ضرور آئیں گے
مطمئن سلسلۂ ذوقِ نظر بھی ہوگا

(عکسِ تحریر)

فہرست مندرجات

پیش لفظ

ایم ۔ اے (اردو) سال اول کے نتیجے کی تاخیر نے میرے صبر و ضبط کا جائزہ امتحان لیا ۔ کیونکہ مجھے میرے ہم جماعتوں کے برعکس (R – L) کی خبر دی گئی ۔ ساری کلاس کے رزلٹ آنے اور مقالہ لینے کے جوش و خروش نے میری رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی ۔ آخر خدا خدا کرکے تقریباً ایک ماہ کے بعد میرا نتیجہ آیا جو خوشیوں اور کامرانیوں کی نوید لایا ، اور یہ کہاوت درست ہوتی ہوئی دکھائی دی :

دیر آید درست آید

مقالے کے نگران کے بارے میں میں نے بہت عرصہ پہلے سے سوچ رکھا تھا ۔ مجھے پہلے دن سے ہی محترم استاد جناب فخرالحق نوری صاحب کی پر کشش اور جاذب نظر شخصیت نے بے حد متاثر کیا تھا ۔ پھر کلاس میں ان کے دوستانہ برتاؤ ، خوش مزاجی اور بے حد محنت اور لگن سے پڑھانے کا انداز میرے دل میں ان کی قدر و منزلت کو مزید بڑھاتا چلا گیا ۔ وہ ایک ایک بات ہمارے ذہنوں میں یوں ڈالتے کہ وہ کانوں کے راستے روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی کبھی نہ بھولنے کیلئے ۔ ان سب باتوں کے

پیش نظر میرا خیال یہ تھا کہ میرے مقالے کیلئے وہ بہتر نگران ثابت ہوں گے ۔ چنانچہ
مقالے کیلئے نگران کا مسئلہ آتے ہی میں نے بغیر کسی غور و خوض کے جناب نوری صاحب
کا نام دے دیا ۔ موضوع کا انتخاب بھی ان کی پسند سے تھا جسے میں نے آنکھیں بند
کرکے قبول کر لیا ۔ حالانکہ موضوع میرے لیے ایسا ہی تھا کہ دید نہ شنید ۔

میرے مقالے کیلئے مواد کا حاصل کرنا ایک انتہائی مشکل مسئلہ تھا ، کیونکہ زیبا
ایک اچھے شاعر ہونے کے باوجود گمنامی کے عمیق غار میں پڑے تھے ۔ ان کی کوئی تخلیق
بھی کتابی شکل میں موجود نہ تھی ۔ دراصل زیبا صاحب گوشہ نشین انسان تھے اور نمود
و نمائش سے احتراز برتتے تھے ۔ اس صورتحال نے وقتی طور پر مجھے بہت پریشان رکھا ۔
لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے محترم استاد کی نگرانی میں کام کرتی رہی ۔ استاد
محترم نوری صاحب نے میرے کام کو بہت توجہ اور ذمہ داری سے دیکھا اور ہر مشکل موقع
پر مجھے سہارا دیا ۔ میں یقیناً ان کی رہنمائی کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ
سکتی تھی ۔ ان کی توجہ اور حوصلہ افزائی نے میرے اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے
میں بنیادی کردار ادا کیا ۔ جس کیلئے میں ان کی احسان مند ہوں ۔ بعض اوقات میں
ان کے غصے سے بے پناہ ڈر بھی گئی لیکن ان کی ڈانٹ نے میرے لیے مہمیز کا کام کیا اور
انہوں نے میری کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود بڑی محنت ، لگن اور جانفشانی سے میرے
مقالے کو بہتر بنانے کی کوشش کی ، اور یہ سچ ہے کہ میں نے اس مقالے کو لکھتے ہوئے
بہت کچھ سیکھا ہے ۔

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلا باب زیبا ناروی کی سوانح و شخصیت سے

متعلق ہے، دوسرے باب میں ان کی غزل گوئی کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب ان کی مذہبی نگارشات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ۔ چوتھا باب دیگر اصناف سخن پر محیط ہے۔ پانچویں باب میں متفرقات کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ جبکہ چھٹے اور آخری باب میں زیبا صاحب کا ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان ابواب میں صرف زیبا صاحب کی تخلیقات کو ہی موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ مختلف اصناف سخن کے حوالے سے اردو شاعری کی تاریخ اور ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ، تاکہ زیبا صاحب کی شاعرانہ عظمت اور فنکارانہ صلاحیت کو اجاگر کیا جا سکے ۔

زیر نظر مقالہ میری اولین تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے، یقیناً اس میں بہت سی خامیاں ہوں گی جنہیں میری کم علمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک وسیع و ہمہ گیر شخصیت کا مختلف حیثیتوں سے احاطہ کرنے کی ایک ادنیٰ سی سعی کی ہے۔

میرے اس مقالے کی تکمیل میں بہت سے کرم فرماؤں نے خاطر خواہ طریقے سے میری مدد کی ۔ لہذا ایک اچھی اور پسندیدہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے میں ان تمام مشفق رہنماؤں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ سب سے پہلے تو میں خدائے بزرگ و برتر کے حضور سپاس گزار ہوں کہ اس کے فضل و کرم اور مہربانی کے صدقے میرا یہ کام بخیر و عافیت اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد مجھے اپنے نگران استاد محترم فخرالحق نوری صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں اپنے مقالے کو مکمل نہ کر سکتی تھی۔ میں اپنے محترم اساتذہ کرام ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب، ڈاکٹر سہیل احمد خاں صاحب، ڈاکٹر عبداللہ خاں صاحب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب، ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب،

اور جناب مرغوب حسین طاہر صاحب کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے مجھے اپنے قیمتی مشوروں اور قابل قدر آراء سے نوازا اور مشکل مراحل میں میری دستگیری کی۔ شعبہ فارسی کے استاد جناب اکرم شاہ صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر واجب ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور زیبا صاحب کے متعلق معلومات فراہم کیں۔

میں اس وقت تک اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک زیبا صاحب کے اہل خانہ کا شکریہ ادا نہ کرتی چلوں۔ انہوں نے جس اپنائیت کا اظہار کیا اور مجھے اپنے گھر کے ایک فرد کی طرح سمجھا، اس کے اظہار کیلئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں۔ خاص طور پر زیبا صاحب کے داماد انجم زیبائی صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ ہر ممکنہ تعاون کیا اور زیبا ناروی کے حالات و کوائف سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ تمام تر غیر مطبوعہ مواد فراہم کیا۔ میں مطلوب احمد صاحب اور ان کے گھر والوں کی بھی تہہ دل سے ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے ہر قسم کی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اپنے ذاتی ذخیرے سے بہت سی کتابیں اور رسائل بھی عطا کیے۔ مجھے اپنی دوست نائلہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جس نے میری مدد کی اور اپنے مشوروں سے مستفید کیا۔

مجھے اس مقالے کے معیاری ہونے کا دعویٰ تو نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کے فضل، اپنے استاد کی رہنمائی اور اپنی محنت پر اعتماد ہے اور اس بات پر فخر کہ میں نے ایک گمنام شاعر کو مشہور و معروف لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور یہی میرے مقالے کا مقصود تھا۔

تابندہ جبیں

متعلمہ ایم۔اے اردو

26 دسمبر 1989ء

باب اوّل :

زیبا ساروی ------ ایک تعارف

(الف) سوانح

(ب) شخصیت

(ج) تخلیقات

(الــق)

ســـــــو انــــح

زندگی میں کسی مخصوص نصب العین کو اپنانا اور عمر بھر اس کے حصول میں کوشاں رہنا بڑی ہمت کا کام ہے ۔ ایسے افراد ہر دور میں خال خال ہی ہوا کرتے ہیں ۔ زمانہ ان کی قدر کرے یا نہ کرے خواہ زندگی میں انہیں اپنا جائز مقام میسر آئے یا نہیں ، انہیں اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کی راہیں متعین ہوتی ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے ان کی سرفروشانہ جد و جہد ہمیشہ جاری رہتی ہے ۔ یہ لوگ کسی صلے، انعام کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ رہبر ہونے کا دعوی کرتے ہیں ۔ ان کی مثال ایسے بے غرض سپاہی کے مانند ہوتی ہے جو راہ طلب میں سردینا جانتا ہے ۔ یہ جانباز سپاہی ملک و ملت پر وہ احسان عظیم کر جاتے ہیں جو رہتی دنیا تک یاد گار رہتا ہے ۔ زیبا ناروی کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے ۔ ان کے سوانح اور شخصیت سے پردہ اٹھانے کیلئے راقمہ نے ان کے اعزہ و اقارب اور دوستوں سے ملاقات کی ہے اور ان سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ان کے حالات کچھ اس طرح سے سامنے آتے ہیں ۔

خاندان :-1

زیبا ناروی نارے کے مشہور و معروف خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کے اجداد مشہد کے رہنے والے تھے ۔ ان کا سلسلہ نسب امام موسی رضا کاظمی سے جا ملتا ہے، جس کی بنا پر بعض

1- زیبا ناروی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے بارے میں مطبوعہ مواد بہت ہی کم ہے ۔ نہ تو انہوں نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے اور نہ کسی اور نے بہ تفصیل ان کی سیرت و سوانح پر قلم اٹھایا ہے ۔ لہذا راقمہ نے اس باب کو زیبا ناروی کے بھائی سید محمد طیب ، بیٹے ابوالبشر بیٹی ممتاز ملکہ ، داماد انجم زیبائی ، دوست و شاگرد مطلوب احمد اور پیر بھائی سید محمد اکرم شاہ سے کیے گئے انٹرویوز کی مدد سے ترتیب دیا ہے ۔ بہت سی باتیں تمام انٹرویوز میں مشترک ہیں، مگر جگہ جگہ تمام انٹرویوز کا حوالہ نہیں دیا گیا ۔ مزید یہ کہ بعض مطبوعہ تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔

لوگ انہیں شیعہ بھی سمجھتے رہے، لیکن زیبا ناروی اور ان کے اہل خاندان سنی العقیدہ اور تصوف و اہل تصوف سے متعلق تھے ۔ ان کے اجداد ہندوستان کے بادشاہ علاؤالدین خلجی کی دعوت پر کاظمین شریف سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے ۔ اسی لیے آپ کا خاندان کاظمی کہلاتا ہے ۔ اسی خاندان کے مشہور صوفی خواجہ کـڑک صاحب موضع کڑا مانک پور ضلع آلہ آباد میں مقیم رہے جن کی درگاہ آج بھی موجع خلائق ہے ۔[1]

زیبا ناروی کا خاندان نوابوں کا خاندان تھا ۔ ان کے والد کے پردادا ایک زمیندار تھے اور کافی زمین کے مالک تھے ، اور لوگوں پر ان کا بہت رعب و دبدبہ تھا ۔ عام لوگوں کو ان کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی ۔ وہ ایک دن اپنی زمینوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتفاقاً ان کے سامنے سے ایک آدمی جو ذات کا بھاٹ تھا گھوڑے پر سوار گزرا ۔ چنانچہ انہیں بہت غصہ آیا کہ یہ میری بے عزتی ہے کہ وہ میرے سامنے گھوڑے پر چڑھ کر گزرے ۔ انہوں نے اپنے نوکروں کو بلوا کر اسے گھوڑے سے نیچے اتارا اور خوب پٹائی کی ۔ وہ بھاٹ بھی کسی امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا ، اس نے مقابلے کیلئے اپنے خاندان کے افراد کو جمع کیا اور رات کے وقت ان کے گھر پر حملہ کر دیا ۔ لڑائی اس قدر شدید تھی کہ زیبا ناروی کے خاندان کا کوئی شخص بھی جو وہاں موجود تھا، زندہ نہ بچ سکا ۔ صرف ان کے والد کی پردادی جو اپنے میکے گئی تھیں زندہ رہیں ۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا ، جس سے یہ خاندان آگے بڑھا ۔ یہ گاؤں نارہ تھا جو زیبا ناروی کا خاندانی علاقہ بنا ۔

1- زیبا ناروی کے اجداد میں سے ایک بزرگ علامہ سید ابوالحسن کاظمی ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ وہ علم و فضل میں یکتائے روز گار تھے ۔ انہوں نے طلب دنیا کے بجائے تبلیغ دین اور درس و تدریس میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی ۔

اس لڑکے[1] کے تین بیٹے پیدا ہوئے -

1- بنی حسن

2- احمد حسن

3- محمد حسن

بنی حسن کے دو بچے تھے - ایک بیٹی[2] اور ایک بیٹا " امیر حسن " - امیر حسن صوفی منش آدمی تھے اور فارسی اور اردو کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے - وہ بے حد ادبی ذوق رکھتے تھے اور شعر و شاعری میں بہت دلچسپی لیتے تھے - اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم تھے، لکھنے پڑھنے میں انہیں مہارت حاصل تھی - گذشتہ صدی کی آخری دہائی اور اس صدی کے اوائل کے معروف شعراء کی آپ کے یہاں آمد و رفت رہتی تھی - انتہائی مہمان نواز اور وضع دار بزرگ تھے - امیر تخلص فرماتے تھے -

امیر حسن نے دو شادیاں کی تھیں - پہلی شادی انہوں نے عالیہ بی بی سے کی جن کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے -

1- انوری بیگم 2- منور حسن (زیبا ناروی)

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد امیر حسن نے دوسری شادی عزیز النساء سے کی ، ان کے چار بچے تھے - ایک بیٹی اور تین بیٹے -

---

1- یہ لڑکا زیبا ناروی کا پردادا تھا ، اور باوجود کوشش کے راقمہ کو اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا - کیونکہ زیبا ناروی کے خاندان میں کوئی شخص بھی ایسا موجود نہیں جو ان کے خاندان کے بارے میں تفصیل سے بتا سکے -

2- باوجود کوشش کے راقمہ کو ان کی بیٹی کا نام معلوم نہیں ہو سکا -

1- عائشہ　　2- مختار احمد　　3- سید محمد طاہر　　4- سید محمد طیب

امیر حسن کی دوسری بیوی نے ان کے پہلے دو بچوں کو بھی حقیقی والدہ کا پیار دیا، اور کبھی سوتیلے پن کا اظہار نہ کیا - تمام بچے سگے بہن بھائیوں کی طرح رہتے اور ان کے دل میں اس بات کا احساس کبھی پیدا نہ ہو سکا کہ وہ دو ماؤں کے بچے ہیں -[1]

زیبا ناروی کے والد امیر حسن اپنے زمانے کے اکابر علماء میں سے تھے - وہ حکیم تھے اور عربی، انگریزی علوم پر گہرا عبور رکھتے تھے - ادب و شعر سے انہیں گہرا لگاؤ تھا - زیبا ناروی کے خاندان میں بعض اور بھی قابل ذکر افراد گزرے ہیں - ان میں " سید نعمت اللہ شاہ " کا نام بہت اہم ہے - یہ حضرت پیر مہر علی شاہ کے زمانے میں گولڑہ شریف میں مفتی اعظم رہے - ان کا انتقال 1955ء میں ہوا اور گولڑہ شریف میں مدفون ہوئے - نعمت اللہ شاہ جید عالم تھے - اب ان کے صاحبزادے نور اللہ شاہ وہاں مفتی ہیں -[2]

ولادت ، نام ، تخلص :

زیبا ناروی 1894ء[3] میں بمقام قصبہ نارہ پرگنہ کرامانک پور ضلع الہ آباد ، یو پی میں پیدا ہوئے - آپ کا نام سید صغیر حسن ، عرفیت محمد اطہر اور تخلص زیبا تھا - آپ امیر حسن کی سب سے پہلی نرینہ اولاد تھے ، لہذا آپ کی ولادت پر بے پناہ خوشیاں منائی گئیں - ان کا نام ان کے

1- انجم زیبائی داماد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان -
2- مولوی نعمت اللہ شاہ رشتے میں زیبا ناروی کے بھائی لگتے تھے نیز استاد بھائی بھی تھے -
3- زیبا ناروی کے سن ولادت کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں ، کسی جگہ 1882ء لکھا گیا ہے اور کسی جگہ 1892ء - لیکن ان کے شناختی کارڈ کے مطابق ان کی پیدائش 1894ء میں ہوئی اور یہی تاریخ خود زیبا ناروی نے اپنے داماد انجم زیبائی صاحب کو بتائی تھی - لہذا ان کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی منسلک کی گئی ہے -

والد نے رکھا جبکہ ان کی والدہ انہیں گھر میں پیار سے میاں اطھو کہہ کر پکارتیں ۔

تعلیم و تربیت :

زیبا نا روی زیادہ عرصے تک نا رے ہی میں رہے اور قدیم شرفا کے دستور کے مطابق درس نظامی پڑھا ۔[1] اپنے والد سے تحصیل علم و حکمت و دینی نصاب ، درس نظامیہ عربیہ ، فقہ وحدیث ، ہندسہ منطق ، ہئیت، فلسفہ اور تصوف میں کمال حاصل کیا ۔ سید امیر حسن ملازمت کے سلسلے میں زیادہ عرصہ ہاتھرس ضلع علیگڑھ میں قیام پذیر رہے اس لیے موصوف کی تعلیم و تربیت کا زمانہ زیادہ تر یہیں گزرا اور ان سے عربی اور فارسی میں مہارت پائی ۔

گھریلو تعلیم کے علاوہ حضرت مولانا یوسف علی خاں صاحب کا سگنجوی سے بھی اکتساب علم کیا۔ مولوی منصب داد خاں صاحب منصب متوطن قصبہ دادوں نے بھی حصول علم میں امداد دی۔

زیبا نے طبیہ کالج دھلی سے طب کی تعلیم حاصل کی ۔ طب میں ان کے استاد حکیم حیدر حسن ، حکیم عبدالقوی صاحب ، حکیم کریم الدین خاں صاحب و حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی تھے ۔ طب کی سند 1941ء میں حاصل کی ۔[2]

زیبا نا روی کا خاندانی پیشہ طبابت تھا ۔ اس لیے دم آخر تک پیشہ طبابت سے منسلک رہے۔ طبابت میں آپ نے اپنے والد محترم اور اپنے زمانے کے جید حکما سے اکتساب فیض کیا جن کی نظیر اس

1۔ زیبا نا روی نے درس نظامی ہاتھرس میں دارالعلوم حنفیہ میں حاصل کیا تھا۔

2۔ زیبا نا روی نے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ ایک سند یافتہ حکیم تھے اور 13 جون 1968ء کو " یونانی " اور " ایور ویدک " طریقہ علاج کی طرف سے آپ کو طبیب کی حیثیت سے باقاعدہ کام کرنے کی سند عطا کی گئی ، جس کی نقل منسلک کی جا رہی ہے ۔



273 00 052295

نام حکیم سید صفدر حسن

والد کا نام حکیم سید امیر حسن مرحوم

پتہ مکان نمبر ۱۵ حسینیہ سٹریٹ نمبر 21 اسلام پورہ

کرشن نگر

لاہور

1894

دائیں پاؤں پر پھوڑے کا نشان

۱۰، ۲۲، ۴

oard of Unani And Ayurvedic Systems of Medi

PAKISTAN

Certificate of Registration

CATEGORY A B

This is to certify tha

Hakim/Vaid Syed Saghir Hassan,

son/daughter of Hakim Syed Amir Hassan,

resident of House No.10, Aishwar Street No.82, Krishan N

District Lahore,

Practising at As above,

is a Registered Practitioner within the meanings of "

Unani, Ayurvedic & Homoeopathic Practitioners Act, 196

(II of 1965). Section 25(i)

Registration No. E-18119 CAT

This certificate is issued under the seal of the Board.

(S. MASROOF

(Hakim Mohammad Hassa

Shif

President.

Manzoor Husain

Registrar

Dated Rawalpindi, the 196 .

زمانے میں مشکل سے ہی نظر آتی ہے ۔ حکمت میں آپ نے مسیح طب حکیم حشمت علی خاں جو کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی صاحب کے پھوپھا تھے اور حکیم نابینا صاحب سے تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ زیبا ناروی نے طب کی تعلیم عربی میں حاصل کی تھی ۔

اس کے علاوہ اگرچہ انہوں نے سکول اور کالج کی تعلیم حاصل نہیں کی ۔ ان کی تعلیم کا دائرہ یہیں تک محدود ہے ۔ لیکن وہ ان علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے جو انہوں نے حاصل کیے تھے ۔

بچپن :

زیبا ناروی کو بچپن ہی سے ایسا ماحول ملا جس نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو نشوونما دی۔ وہ گھر میں منعقد ہونے والی شعری مجالس میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے اور سات، آٹھ برس کی عمر ہی سے شعر کہہ لیتے تھے ۔ ان کی والدہ بتایا کرتی تھیں کہ زیبا چھت پر ٹہلتے رہتے اور منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتے رہتے ۔

زیبا بچپن میں اپنی بات نہ ماننے پر ناراض ہو جایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے اور جو پیسے وہ گھر سے لے گئے ، انہیں اپنی ٹوپی میں چھپا لیا ۔ چلتے چلتے اسٹیشن پہنچے تو رات ہو چکی تھی ، لہذا وہیں سو گئے ۔ سوتے میں ٹوپی کھل گئی اور کوئی چور روپے لے اڑا ۔ اب جب زیبا کی آنکھ کھلی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا ، چنانچہ مجبوراً گھر واپس آنا پڑا ۔

زیبا اپنی ایک ہمشیرہ کے علاوہ باقی سب بہن بھائیوں سے بڑے تھے ۔ اس لیے چھوٹے بہن بھائی

ان کی بات ہمیشہ مانتے اور جو وہ کہہ دیتے اس سے انکار کرنے کی کسی کو جرات نہ ہوتی ۔ ادھر زیبا بھی ان کی ہر خواہش کو پورا کرتے اور بلا وجہ کسی کو نہ ڈانٹتے ۔ زیبا ناروی کے خاندان میں بڑے چھوٹے کا لحاظ موجود تھا اور کوئی شخص بھی اپنے سے بڑے کے آگے بول نہیں سکتا تھا اور نہ اس کی حکم عدولی کا تصور ہی کر سکتا تھا ۔[1]

ملازمت :

اوائل عمر میں جب آپ علیگڑھ میں مقیم تھے تو آپ نے محکمہ جنگلات میں ملازمت اختیار کی ، اور اسی محکمے کی طرف سے آپ نو سال تک گورکھ پور کے جنگلوں میں مقیم رہے ۔ مگر افتاد طبع سے مجبور ہو کر نوکری کو خیرباد کہہ کر واپس آ گئے اور ہاتھرس ضلع علیگڑہ میں جہاں آپ کے والد صاحب مقیم تھے، سکونت اختیار کی ۔ کچھ عرصے بعد آپ علیگڑھ سے کلکتہ چلے گئے اور ایک عرصے تک وہاں رہے ۔ پھر آپ دھلی چلے گئے ۔ مشق سخن اس دوران میں بھی جاری رہی ۔ دھلی میں آپ سبزی منڈی میں 1931ء تک یونانی شفاخانے میں انچارج طبیب کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔[2]

ابتدائی ملازمت کے چند سالوں کے علاوہ انہوں نے بقیہ ساری عمر کوئی ملازمت نہیں کی ۔ وہ اپنے آپ کو ملازمت کا پابند نہیں بنانا چاہتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ قید ملازمت میں وہ اپنی شعری صلاحیتوں کو خاطر خواہ طریقے سے اجاگر نہیں کر پائیں گے ۔ ان کے والد سید امیر حسن کے بہت سے ایسے لوگوں سے تعلقات تھے جو ان کے بیٹے کو کسی اچھی جگہ ملازمت دلوا سکتے تھے، لیکن زیبا اس کے لیے تیار نہ ہوتے ۔

1۔ سید محمد طیب برادر زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات 89-1-1 اور ان کا بیان

2۔ زیبا ناروی کی پہلی برسی کے موقع پر 28 ستمبر 1988ء کو چائینز لنچ ہوم میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں مطلوب احمد مطلوب نے زیبا ناروی کی شخصیت و فن کے متعلق ایک مقالہ پڑھا ۔ یہ مقالہ غیر مطبوعہ ہے اور راقمہ کو مطلوب احمد صاحب سے حاصل ہوا ۔

1925ء میں زیبا ناروی کے والد امیر حسن کا انتقال ہو گیا ۔ ان کی وفات کے بعد تو زیبا بالکل آزاد ہو گئے ۔ گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا انہیں زیادہ احساس نہ تھا ۔ وہ اس معاملے میں بہت لاپروا تھے ۔ اب وہ اپنے ماموں سید جمیل حسن کے زیر کفالت آ گئے ۔ ان کی والدہ اور ماموں کی جائداد مشترکہ تھی اس لیے گھر کا خرچہ بآسانی چلتا رہا ۔

شادی و اولاد :

زیبا ناروی کی شادی 1928ء میں علیگڑھ کی ایک مشہور شخصیت اکبر حسین کی صاحبزادی " اکبری بیگم " سے ہوئی ۔ اکبر حسین اس زمانے میں ریلوے میں گارڈ تھے اور ناروی کہلاتے تھے، اگرچہ یہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر علیگڑھ ہی میں رہے ۔ اکبر حسین نے دو شادیاں کی تھیں ۔ پہلی بیوی سے ان کی کوئی اولاد نہ تھی ، اس لیے انہوں نے دوسری شادی کر لی جن سے ان کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا ۔ اکبری بیگم سب بہن بھائیوں میں سے بڑی تھیں۔

سید امیر حسن اور اکبر حسین[1] آپس میں گہرے دوست تھے ۔ چنانچہ انہوں نے باہمی رضامندی سے اپنے بچوں کی شادی کر دی ۔ زیبا کے ہاں اولاد تو بہت ہوئی لیکن کئی بچے بچپن ہی میں وفات پا گئے ۔ اب ان کی ایک بیٹی ممتاز ملکہ اور ایک بیٹا ابوالبشر کاظمی حیات ہیں ۔ ابوالبشر کاظمی تربیلا میں انجنیئر ہیں اور بیس برس سے وہیں مقیم ہیں ۔ البتہ ان کے بیوی بچے لاہور میں سکونت پذیر ہیں ۔ زیبا ناروی کی صاحبزادی گرین ٹاؤن میں رہتی ہیں اور شعر و شاعری کا خاصا ذوق رکھتی ہیں ۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ ان کے شوہر انجم زیبائی بہت اچھے شاعر اور زیبا ناروی کے شاگرد ہیں ۔

1۔ اکبر حسین اکبر اپنے زمانے کے مشہور شاعر، بلند پایہ صحافی اور نثر نگار تھے ۔ وہ علیگڑھ میں رہتے تھے ۔ انہوں نے 31 اگست 1889ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا ۔ نارمل اسکول میں

مدرس اول رہے ۔ 12 دسمبر 1893ء میں پرو پرائیٹر آگرہ پنچ نے تعریفی سند عطا کی ۔ اکبر حسین مزاحیہ انداز کے اشعار کہا کرتے تھے اور انہیں " ظریف الملک " بھی کہا جاتا تھا ۔ ان کی نثری کتابوں میں رفیق النساء، عبرت ، تازیانہ شوق ، خیالی پلاؤ شامل ہیں ۔ یہ کتابیں خاص طور سے عورتوں کیلئے لکھی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ اکبر حسین کئی اخبارات مثلاً آوازہ خلق بنارس ، ستارہ ہند ، آگرہ پنچ ، قنوج پنچ اور ظریف پنچ کے ایڈیٹر رہے ۔ اداریے لکھنے کی ایسی قدر ہوئی اور عزت بخشی گئی کہ مالکان اخبار نے آپ کو کئی تمغے عطا کیے ۔ اخبار آوازہ خلق بنارس کی دوسری سالگرہ منعقدہ 31 جنوری 1904ء میں نامہ نگاری میں اول آئے اور تمغہ حاصل کیا ۔

اکبر حسین کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نوح ناروی کو ابتدا میں اصلاح دیا کرتے ہے۔ مگر جب نوح ناروی داغ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تو اکبر حسین نے باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کر لی ۔

آپ نے پہلے سررشتہ تعلیم میں نائب مدرس اور بعد میں مغربی ہندوستان ریلوے میں ملازمت کر لی اور ریلوے گارڈ کے عہدے تک پہنچے ۔ ان کا شعری مجموعہ " مذاق اکبر" کے نام سے قلمی شکل میں اب تک محفوظ ہے ۔

انہی کی اولاد میں ڈاکٹر رضوان جو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں صدر شعبہ سنی تھیالوجی تھے، 1982ء میں ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت پر پاکستان آئے تھے اور انہوں نے " قرآن ناسخ و منسوخ " کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا ۔

راقمہ کو یہ تمام معلومات رہبا ناروی کے داماد انجم زیباٹی سے حاصل ہوئیں۔ اکبر حسین کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجئیے ۔

اقرار سے اں ہوں کبھی انکار سے اں ہے ں
ہر باتمیں ہم سنتے ہیں سرکار سے اں ہوں
پوچھا جو کبھی میں نے مزاج آپ کا خوش ہے
گردن کو جھکا کر کہا کس پیار سے اں ہوں

تصدق ہو گیا ہے جب سے دل انگریزی فیشن پر
حقارت کی نگاہیں ڈالتا ہوں اپنی پشن پر

اکبر کو اپنی شوخ بیانی پہ ناز تھا
اب سامنے وہ شوخ کے خاموش ہو گئے

علمی و ادبی سرگرمیاں :

زیبا ناروی کو اوائل عمر سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا ۔ لہذا شروع سے ادبی محفلوں میں حصہ لیتے تھے ۔ وہ نامور شعراء مثلاً حضرت بے خود دہلوی ، حضرت سائل دہلوی ، ادیب الملک اور جناب نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کے مشاعروں میں برابر شریک ہوتے اور با عزت گردانے جاتے تھے ۔ آپ تین زبانوں یعنی اردو، فارسی اور عربی میں مہارت تامہ رکھتے تھے ۔

حکیم سید امیر حسن علم دوست بزرگ تھے اور ان کے علامہ شبلی نعمانی ، سیماب اکبر آبادی مولانا نظام بدایونی ، قاضی محمد حسین ، بری مارہروی ، امیر دریا آبادی اور حکیم عبدالواحد اجینی وغیرہ سے گہرے روابط تھے ۔ ان ذی علم ہستیوں کی خدمت میں حاضر رہنے سے زیبا کو علم و ادب کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوئی ۔ 1911ء میں انہوں نے باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا ۔ فن شاعری میں ان کے استاد حضرت نوح ناروی تھے ۔ لہذا انہوں نے اپنے عم محترم نوح ناروی جانشین داغ دہلوی کے پہلے دیوان " سفینۂ نوح " کو زیر مطالعہ رکھا اور 1913ء کے آخر میں اپنی پہلی غزل نوح صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی ۔ 1917ء میں باضابطہ پہلی مرتبہ " مین پوری " کے مشاعرے میں غزل پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ 1921ء سے 1923ء تک مستقل طور پر نارہ میں رہ کر نوح ناروی سے استفادہ کیا ۔ 1926ء میں مستقلاً دہلی چلے آئے اور اس ادب گاہ اردو میں بیخود دہلوی ، سائل دہلوی ، آغا شاعر قزلباش اور پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی صحبتوں نے ذوق شعری کے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ۔ 1936ء میں آپ کی ادبی و شعری خدمات کے پیش نظر اہل ذوق نے دلی میں " بزم زیبا " کی تشکیل کی جو 1947ء تک ادبی سرگرمیوں میں معروف رہی ۔ 1938ء میں دارالعلوم عثمانیہ دہلی نے نظام دکن کی سرپرستی میں اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک عظیم الشان اردو و فارسی

مشاعرے کا اہتمام کیا ۔ اس تقریب میں دارالعلوم کی جانب سے زیبا ناروی کو " مسیح الکلام " کا خطاب عطا کیا گیا ۔[1]

اس تقریب کی خبر ہفتہ وار رسالے " جمیل " کے شمارے میں اس نظم کے ساتھ شائع ہوئی جو زیبا ناروی نے گولڈن جوبلی کے اجلاس میں پڑھی ۔

ایڈیٹر نے لکھا ۔

" حضرت زیبا ناروی ، ناخدائے سخن ، تاج الشعراء ، فصیح العصر ، حضرت نوح ناروی مدظلہ ، کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ آپ کا کلام محتاج دادیا آپ کی ہستی محتاج تعارف نہیں ۔ آپ کو دسمبر 1937ء میں دارالعلوم شعمانیہ دہلی کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں بزم ادب دارالعلوم شعمانیہ دہلی کی طرف سے مسیح الکلام کا خطاب مرحمت ہوا ہے ۔ گولڈن جوبلی کے اجلاس میں آپ نے جو نظم پڑھی ہے وہ ذیل میں شائع کی جاتی ہے ۔یہ وہ موثر نظم ہے جس نے محفل میں بلا کا ہنگامہ برپا کر دیا تھا ۔ لوگ بے چین ہو ہو گئے ۔ سینکڑوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ گئے ۔ اثر لینے والے حضرات پر ایک خاص قسم کا جوش طاری تھا ۔ ہمارے ناظرین بھی پڑھیں اور لطف اندوز ہوں ، سبق لینے والے سبق حاصل کریں "۔[2]

1۔ نوح ناروی کی وفات کے بعد زیبا ناروی کو ان کا جانشین منتخب کیا گیا ۔ اس موقعہ پر اربابِ اردو پاکستان " نے ایک کتابچہ بھی شائع کیا جو 1962ء میں " تقریب جانشینی کے عنوان سے شائع ہوا ۔ اس میں " نصرت قریشی " کے مضمون سے یہ معلومات اخذ کی گئی ہیں۔

2۔ ہفت روزہ " جمیل " دہلی 28 جنوری 1938ء

۷۸۶

قائم شدہ
سنہ ۱۳۰۰ھ



بہ سلسلہ اجلاس گولڈن جوبلی
منجانب بزم ادب دار العلوم نعمانیہ دہلی

نشان مجاریہ ۔ ۱/۲۶۳

در عہد اعلیحضرت بندگان حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و محکمہ تعلیمات صوبہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج مورخہ ۲۲ ماہ شوال سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۶ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو
اردو ادب کی خدمات کے سلسلے میں بزم ادب دار العلوم نعمانیہ دہلی
کی طرف سے بیادگار ملک الشعراء خاقانیٔ ہند حضرت ذوق مرحوم چھپن سالہ اجلاس
کے مشاعرہ میں جناب سید منیر حسن صاحب [illegible] تلمیذ رشید [illegible]
کے لئے فصیح الملک کا خطاب تجویز کیا گیا۔ اور دیا گیا۔ امید کی جاتی ہے
کہ اردو ادب کی تاریخ میں آپ کا نام اردو ادب کی خدمات کے زمرہ میں
نمایاں ترقیوں کا عنوان ثابت ہوگا فقط

دستخط مہتمم دار العلوم نعمانیہ دہلی

[illegible]

علم و عمل :

(1)

کچھ اپنی تباہی پہ تجھے غور نہیں ہے   تیرا وہ زمانہ وہ ترا دور نہیں ہے
وہ ڈھنگ نہیں رنگ نہیں طور نہیں ہے   کہنے کو فقط تو ہے وہی اور نہیں ہے
دستور سے اسلاف کے تو دور ہے بے حد
بیگانہ ہے بیگانوں میں مشہور ہے بے حد

(2)

ہنستا ہے تجھے دیکھ کے اب سارا زمانہ   لازم ہے کہ تو یاد کرے اگلا فسانہ
تھا درس حقیقت ترا ایک ایک ترانہ   یہ سینہ ترا علم و ہنر کا تھا خزانہ
دنیا کو جگا دے وہ تری چال نہیں اب
ہیں لائق تقلید وہ اعمال نہیں اب

(3)

باقی نہیں اب تجھ میں تمیز حق و باطل   اب شان نہیں ہے تری کچھ فخر کے قابل
غافل یہ روش اور بڑھا دے گی مراحل   آ ہوش میں ، آ ہوش میں گم کردۂ منزل
رخ تیرا کہیں ، منزل مقصود کہیں ہے
جس راہ پہ تو ہے وہ تری راہ نہیں ہے

(4)

واقف نہیں تو چین سے، آرام سے، کل سے   ہر بات پہ شکوہ تجھے قسام ازل سے

محفل تری بے کار کسی، بے کار کسے جلسے   دعوے ترے جتنے ہیں وہ خالی ہیں عمل سے

کیوں کام میں داخل کوئی تدبیر نہیں ہے

یہ کیا ہے اگر شومئ تقدیر نہیں ہے

(5)

اب علم و ہنر سے بھی تہی دست ہے تو ہی   اب تیغ و تبر سے بھی تہی دست ہے تو ہی

اب لعل و گہر سے بھی تہی دست ہے تو ہی   زر بھی نہیں، زر سے بھی تہی دست ہے تو ہی

کچھ جہل و فلاکت کے سوا پاس نہیں ہے

اے مرد مسلماں تجھے احساس نہیں ہے

(6)

اب بھی نہیں کچھ دور قدم بوس ہو عظمت   ممکن ہے کہ پھر ہو تجھے حاصل وہی عفت

دشوار نہیں کھوئی ہوئی پھر ملے عزت   سب کچھ ہے ترے پاس جو ہو علم کی دولت

جو شے ہے مؤدب پئے تسلیم کھڑی ہے

کونین میں ذی علم کی توقیر بڑی ہے

(7)

یہ علم ترقی کیلئے خوب ہے زینہ   یہ علم سکھاتا ہے اخوت کا قرینہ

یہ علم حقیقت میں ہے انمول نگینہ   یہ علم نہیں جس میں وہ سینہ نہیں سینہ

بے شبہ وہ جو علم کی دولت سے ہے خالی
کہنے کو بشر ہے، بشریت سے ہے خالی

(8)

عالم کے لیے فرض ہے یہ بھی کہ ہو عامل — خالی جو عمل سے ہو تو کیا علم سے حاصل
بس منزل مقصد ہے یہی منزل مقصد — ہے شمع عمل باعث سرگرمی محفل
لازم ہے کہ ہو علم کے ہمراہ عمل بھی
سرسبز جو اشجار ہیں وہ رکھتے ہیں پھل بھی

(9)

دو مختلف الفاظ ہیں استاد برابر — کیوں کر نہ کہیں دونوں کی ایجاد برابر
حالی کا یہ نکتہ ہے ہمیں یاد برابر — ہیں علم و عمل دونوں کے اعداد برابر
زیبا یہی قدرت کے عطیے ہیں ازل سے
انسان کی تکمیل ہوئی علم و عمل سے

زیبا ناروی عالم شباب میں ہی استادی کے مرتبے پر فائز ہو چکے تھے ۔ ان کی جوانی کا بیشتر زمانہ دہلی ، کانپور اور کلکتہ میں گزارا ۔ اس کے علاوہ الہ آباد میں بھی کچھ عرصہ گزارا ۔ طباعت کے سلسلے میں زیادہ تر دہلی رہے ۔ جوانی میں شعر و شاعری میں زیادہ وقت صرف کرتے، اور ہندوستان میں ہونے والے تمام مشاعروں میں حصہ لیتے ۔

زیبا نے مختلف رسائل کی ادارت بھی کی ۔ وہ " فلم لائٹ[1] " کے سب ایڈیٹر اور رسالہ " ممتاز " دھلی کے ایڈیٹر رھے ۔ زیبا ناروی روایتی شاعر تھے لیکن اگر کوئی جدید شاعر ان کے پاس اپنا کلام لے کر آتا تو وہ اس کے مطابق اصلاح دیتے اور اس میں اپنا رنگ شامل نہ کرتے ۔ زیبا دھلی میں " بزم تیموریہ " کے ساتھ منسلک رھے ۔ آپ وھاں سیکرٹری کے عہدے پر فائز رھے ۔

1940ء میں زیبا نے " حسن افکار" کے نام سے اپنے کلام کی تدوین کی اور " آئینہ افکار " کے نام سے رباعیات مرتب کیں ۔ 1946ء میں دونوں کی کتابت شروع ھو چکی تھی کہ 1947ء کا خونیں انقلاب رونما ھو گیا اور یہ تمام سرمایہ حادثہ سبزی منڈی دھلی کی نظر ھو گیا ۔ ان کی تاریخ ھادی ھارون قادری نے کہی تھی ۔

مجھے تاریخ کی تھی فکر اے انصاف ملہم نے
کہا دیکھو یہ ھے دلکش کلام حضرت زیبا

لیکن یہ دیوان چھپ نہ سکے ۔ پاکستان کے قیام پر ھم نے بہت کچھ لٹوایا ھے، اس تاخت وتاراج میں ادبی سرمایہ کا عظیم ضیاع بھی شامل ھے ۔ اس نقصان میں زیبا صاحب کی ادبی متاع گرانمایہ کو بھی شمار کر لیجئیے ۔

ھجرت کے بعد کے حالات :

1947ء میں تقسیم ھند کے بعد زیبا ناروی دھلی سے لاھور چلے آئے اور لاھور ھی میں مستقل

---

1 ۔ ماہ نامہ " فلم لائٹ " گیتا بھون نسبت روڈ لاھور سے نکلتا تھا ۔ اس کے ایڈیٹر خان عیسی غزنوی تھے ۔ زیبا ناروی حصہ نظم کے انچارج تھے ۔ راقمہ کو یہ معلومات زیبا ناروی کے داماد انجم زیبائی سے حاصل ھوئیں ۔

سکونت اختیار کر لی ۔ سبزی منڈی دھلی میں بد ترین مسلم کش فسادات ہوئے اور زیبا ناروی کے گھر کو آگ لگا دی گئی ۔ وہ بڑے مشکل حالات میں اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر لاھور پہنچے اور والٹن کیمپ میں قیام پذیر ھوئے ۔ ان کی بیٹی ممتاز ملکہ اپنی دادی کے پاس الہ آباد گئی ھوئی تھیں ۔ زیبا ناروی کے بھائی طاھر اس زمانے میں نائب تحصیلدار تھے ۔ انھیں بہت پریشانی تھی کہ نہ جانے وہ زندہ بھی ھیں یا نہیں ، اور اگر پاکستان پہنچ چکے ھیں تو کہاں اور کس حال میں ھیں؟ ان دنوں زیبا ناروی کے سب سے چھوٹے بھائی محمد طیب کے دماغ میں سیر کا سودا سمایا اور انہوں نے سوچا کہ پاکستان گھوم پھر کر آنا چاھئیے ۔ لہذا وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کراچی آ گئے ۔ یہاں سے میر پور پہنچے لیکن گھر خط باقاعدگی سے لکھتے رھے ۔ طیب چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لیے ان کی والدہ ان سے بہت پیار کرتی تھیں ۔ طیب بھی زندگی میں پہلی بار والدہ سے جدا ھوئے تھے اس لیے بہت اداس ھو گئے ۔ بالآخر میر پور خاص میں انھیں بڑے بھائی طاھر کا خط ملا جس میں انھوں نے ڈانٹا کہ بغیر پوچھے گھر سے کیوں گئے اور اگر نکلے ھی تھے تو کچھ روپیہ ، پیسہ لے کر نکلتے ۔ دوسری طرف زیبا ناروی کا ایک خط طاھر کو مل چکا تھا جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ ھم خیریت سے پاکستان پہنچ گئے ھیں اور اب والٹن کیمپ میں مقیم ھیں ۔ چنانچہ طاھر نے طیب کو لکھا کہ تم ان سے ملو ۔ طیب لاھور آئے ۔ ان دنوں زیبا ناروی پرانی انار کلی میں مقیم تھے ۔ ان سے ملنے کے بعد طیب واپس ھندوستان گئے اور اپنی والدہ کے علاوہ اپنا ساز و سامان بھی لے آئے اور یہ دونوں یہاں رھنے لگے ۔

زیبا نے 1948ء سے 1950ء تک چوک میو ھسپتال میں مطب کیا ۔ اس کے بعد تقریباً 60 یا

61ء میں جب انہیں انار کلی میں مکان الاٹ ہوا تو انہوں نے وہاں " جہانگیری دواخانہ " کے نام سے مطب کھول لیا ۔ بعد ازاں وہ اسلام پورہ " چشتیہ سٹریٹ " میں مقیم ہو گئے اور اپنی وفات تک یہاں مطب کرتے رہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ باقاعدگی سے گھر میں مشاعرے بھی کرواتے تھے اور ادبی محفلیں منعقد کرواتے تھے ۔[1]

<u>زیبا ناروی کے پیر و مرشد :</u>

زیبا کے پیر و مرشد شاہ محمد عبدالشکور ہیں ۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ ابوالعلائیہ جہانگیریہ کے ممتاز ترین بزرگوں میں سے ہیں ۔ لکھنو میں پیدا ہوئے ۔ مدرسہ فرنگی محل لکھنو سے ظاہری تعلیم پائی ۔ اوائل عمر ہی سے طبیعت عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھی ۔ حضرت شیخ فخر العارفین محمد عبدالحیؒ چاٹگام کے خلیفہ قطب دوراں حضرت شاہ بنی رضا کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوئے اور تھوڑی مدت کے بعد خرقہ خلافت پایا ۔ اپنے پیر و مرشد کے ارشاد کے مطابق وطن مالوف کو ترک کیا اور نصیر آباد متصل اجمیر شریف یعنی حضرت خواجہ غریب نواز کے دامن پر برکت میں سکونت اختیار فرمائی ۔ یہاں آپ شب و روز فروغ دین میں مشغول رہے ۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آئے اور گارڈن ٹاون لاہور میں سلسلہ رشد و ہدایت کی ترویج میں مصروف ہوئے ۔[2]

زیبا ناروی شاہ محمد عبدالشکور کے معالج کی حیثیت سے ان کے آستانے پر آتے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ زیبا ایک تو طبیب تھے دوسرے وہ ایک معروف شاعر تھے اور شاہ محمد عبدالشکور کو

1۔ سید محمد طیب برادر زیبا ناروی سے 89-1-1 کو راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

2۔ " مدینۃالاولیاء" تحقیق و تالیف مورخ لاہور محمد دین کلیم قادری ، ص 313

شعر سے خاص تعلق تھا ۔ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے ، لیکن شعر پر گہری نگاہ رکھتے تھے ۔ انہیں شعر سننے کا بہت شوق تھا اس لیے ان کے یہاں شعراء کثرت سے جمع رہتے اور مریدوں میں بھی شعر کا ذوق جاری و ساری رہتا ۔ حضرت عبدالشکور مشاعرے کرواتے جن میں شعراء اتنی کثرت سے شرکت کرتے کہ صبح کی اذان ہو جاتی اور کئی افراد کی باری نہ آتی[1]۔

زیبا ناروی اپنے زمانے کے ممتاز علماء حق اور صوفی مشائخ کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور طریقت میں بھی ممتاز مقام حاصل کیا ۔ آپ نے پیر طریقت تاج الاولیا حضرت شاہ عبدالشکور قدس سرہ العزیز سے سلوک کی تعلیم حاصل کی جو کہ اپنے وقت کے روشن ضمیر بزرگ تھے اور تصفیہ دل اور تزکیۂ باطن کی نعمت سے سرفراز اور بہرہ مند ہوئے ، اور بڑی رفعت وعظمت حاصل کی اور ان کے خلیفہ بنے ۔

زیبا ناروی 1952ء میں حضرت شاہ محمد عبدالشکور کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے ۔ اور اس کے بعد بھی حضرت کے علاج کے نقطہ نظر سے ۔ وہ اکثر و بیشتر اس دربار میں مقیم رہتے تھے ، اگر کبھی رخصت حاصل کرکے چلے جاتے تو ۔ اپنی مرضی سے پھر آ جاتے ۔ اور یہاں پر ہونے والے تمام مشاعروں میں شرکت کرتے ۔ ایک شاعر اور طبیب کے علاوہ آپ کے مرید کی حیثیت سے زیبا شاہ محمد عبدالشکور کے دربار سے ان کی وفات تک اور اس کے بعد بھی منسلک رہے ۔ حضرت عبدالشکور کے مزار پر تاریخ وفات کا جو کتبہ نصب ہے وہ بھی زیبا ناروی کا لکھا ہوا ہے[2]۔

<u>نوح ناروی کی وفات اور زیبا کی جانشینی :</u>

فن شاعری میں آپ کے استاد محمد نوح جو کہ نوح ناروی کے نام سے مشہور تھے ، داغ دہلوی

1۔ محمد اکرم شاہ صاحب استاد شعبہ فارسی اورینٹل کالج و پیر بھائی زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان ۔

2۔ ایضاً

کے شاگرد رشید اور ان کے جانشین تھے ۔ اسی طرح زیبا ناروی بھی جانشین نوح ناروی تھے ، چونکہ استاد الشعراء حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید تھے اس لیے شعر و شاعری کا نکتہ داں ان سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا ۔ زندگی بھر داغ اسکول کا نام روشن کرتے رہے ۔ نوح ناروی نے 10 اکتوبر 1962ء مطابق 1382 ھ شام کے پونے سات بجے اپنے وطن قصبہ نارہ ضلع الہ آباد میں دو چار یوم عارضہ بخار میں مبتلا رہ کر 83 سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[1] زیبا ناروی نے " آہ ناخدائے سخن" کہہ کر تاریخ نکالی جس سے 1382ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔

نوح ناروی کی وفات کے بعد زیبا ناروی ان کے جانشین منتخب ہوئے ۔ مسیح الکلام حضرت زیبا ناروی کو فصیح العصر نا خدائے سخن حضرت نوح ناروی کے جانشین منتخب ہونے کی خوشی میں احباب اردو پاکستان کے زیر اہتمام ایک خاص " بزم سخن " بتاریخ 15 دسمبر 1962ء بروز ہفتہ بوقت سات بجے شب زیر صدارت چوھدری علی محمد صاحب جالندھری مینجر اردو پریس ، بمقام رسول چیمبرز چوک پرانی انار کلی لاھور منعقد ھوئی ۔ جناب نصرت قریشی ، جناب شفق الہ آبادی ، سید قابل گلاؤ ٹھوی نے زیبا ناروی کے حالات زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھے ۔ حضرت یوسف علی گڑھی ، ظفر بریلوی ، دوست جالندھری ، شمس پنسوی اور قمر صدیقی نے قطعات تاریخ و مبارکباد پیش کیے اور حضرت صوفی میرٹھی کا ارسال کردہ قطعہ پڑھ کر سنایا گیا ۔ اس کے بعد طرحی مشاعرہ شروع ہوا ۔ شاعرے سے پیشتر حضرت نوح ناروی کیلئے قرار داد تعزیت پاس کی گئی اور ان کے جانشین کی حیثیت سے حضرت زیبا ناروی کی دستار بندی کی گئی ۔[2]

1۔ " نوح ناروی " نمبر ماھنامہ " عکس نو" میں پروفیسر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کا مضمون ۔

2۔ " تقریب جانشینی " لاھور ، ارباب اردو پاکستان ، 1962ء

جو قطعات اس موقعہ پر پڑھے گئے ان میں سے چند ذیل میں دیکھئیے ۔ شمس پنسوی کا قطعہ یہ ہے۔

مہک اٹھے گی زمانے میں پھر فضائے سخن
ملی ہے زیبا کو اب جائے ناخدائے سخن
عوام ان کو " مسیح الکلام " کہتے ہیں
میں شمس کہہ دوں نہ زیبا کو رہنمائے سخن

دوست جالندھری نے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا۔

اس طرح استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی ہے
جس طرح وابستگی ہوتی ہے جسم و روح کی
جوش نے بھی ہند سے اس بات کی تائید کی
آپ کو زیبا مبارک جانشینی نوح کی

نوح ناروی کے بے شمار شاگرد تھے ، لیکن خود نوح کی یہ خواہش تھی کہ زیبا ناروی ان کے شاگرد ہوں ۔ زیبا بھی اپنے استاد کی توقعات پر پورا اترے اور ان کے دبستان اور انداز کو آگے بڑھانے کیلئے ساری عمر کوشاں رہے ۔

1962ء میں نوح ناروی کی یاد میں " سفینۂ اردو " پاکستان کا قیام عمل میں آیا ۔ اس کا مرکزی دفتر لاہور میں قائم ہوا ۔ اس ادارے کے زیر اہتمام طرحی مشاعرے ہوتے اور سالانہ مشاعرہ مرحوم کی برسی کے موقع پر منعقد ہوتا ۔

" پاکستان میں نوح ناروی کی پہلی برسی 5 اپریل 1964ء کو منائی گئی تھی - " انجمن ارباب اردو پاکستان " نے اس موقع پر ایک کتابچہ شائع کیا تھا - زیبا ناروی جنہوں نے یہ تعارفی کتابچہ بعنوان " نوح ناروی " تصنیف فرمایا تھا ، وہی سفینہ اردو کے سرپرست بھی تھے - اور اپنے مرحوم استاد کی طرح ادب اردو کی خدمت میں مصروف رہے " 1

ہر چند کہ زیبا شعر و شاعری کے سلسلے میں تقریباً گوشہ گیر رہے مگر احباب ادب کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ حلقہ شعرائے اہلبیت پاکستان لاہور کے منتخب صدر تھے اور اپنی ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی نبھاتے - آپ کی قائم کردہ بزم " سفینہ اردو پاکستان " کے زیر اہتمام ہر ماہ معیاری طور پر طرحی مشاعرے منعقد ہوتے اور ہر سال عظیم الشان سالانہ محفل مشاعرہ ترتیب دے کر مقامی اور غیر مقامی ہر مکتبہ فکر کے شعرائے کرام کو دعوت شرکت پیش کی جاتی -

فوج سے وابستگی :

زیبا ناروی ہماری فوج سے بھی بحیثیت شاعر وابستہ تھے، اور انہیں کرنل کمانڈ کا اعزازی عہدہ بھی ملا تھا - آپ ہر سال مشاعرے میں 11 ستمبر کو " چونڈہ " جایا کرتے تھے - جہاں بھی رجمنٹ ہوتی تھی ، خواہ کھاریاں ، یا ملتان ، زیبا ناروی ان کے ساتھ جاتے تھے - انہیں لینے کیلئے کوئی کرنل یا لیفٹیننٹ جنرل ان کے گھر آتا تھا - 1965ء میں پاکستان اور بھارت کی جنگ کے سلسلے میں سرزمین " چونڈہ " پر بمقام پھلورا ، مشہور زمانہ ٹینکوں کی عظیم لڑائی پر ایک تاریخی نظم لکھی جس کے صلے میں " آرمی ایوارڈ " بھی حاصل کیا - فوج کی ون - ایس پی فیلڈ رجمنٹ

1- " عکس نو " نوح ناروی نمبر میں ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کا مضمون " نوح ناروی "

کی طرف سے آپ کے فن کے اعتراف میں ایک شیلڈ بھی ملی ۔ سول میں پورے پاکستان میں وہ واحد آدمی تھے جنہیں فوجی شیلڈ ملی ۔ اس کے علاوہ آپ کو 1983ء میں فوجی اعزاز اور کرنل کا ڈنڈا بھی ملا تھا ۔ آپ توپ خانے کے مہمان خصوصی ہوتے تھے ۔ آخری دفعہ 1986ء میں گئے فوج کی طرف سے 1983ء میں آپ کو اعزازی خط بھی بھیجا گیا ۔ زیبا کا اعزاز یہ تھا کہ جرنلز کھانے پر بعد میں جایا کرتے اور آپ کو پہلے بلایا جاتا ۔[1]

<u>والدہ کا انتقال :</u>

زیبا ناروی کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی ۔ دراصل ان کی پہلی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا اور والد صاحب بھی ان کے تقریباً 17، 18 سال بعد وفات پا گئے تھے ۔ اس لیے والدہ کے ساتھ ان کا پیار اور محبت بڑھتی چلی گئی ۔ ان کی والدہ زیادہ تر اپنے چھوٹے بیٹے طیب کے پاس انار کلی میں رہتی تھیں ۔ اور کبھی کبھار ملنے ان کے یہاں بھی آ جاتی تھیں۔ 1969ء میں زیبا ناروی انہیں جنوبی ھانہ میں عبدالشکور صاحب کے آستانے پر لے کر گئے ۔ دوسرے دن شب برات تھی ۔ طیب انہیں لینے کیلئے آئے تو زیبا نے کہا کہ ہمیشہ تمہارے پاس ہی رہتی ہیں آج ہمارے گھر رہنے دو ۔ چنانچہ وہ رات یہیں رہ گئیں اور رات بھر عبادت کرتی رہیں ۔ صبح کو سوجی کا حلوہ بنانے کیلئے باورچی خانے میں گئیں ۔ ابھی سوجی کو بھوننا شروع کیا ہی تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے اور سارے جسم پر فالج کا حملہ ہو گیا ۔ زیبا نے گھر میں دوا بنا کر انہیں

1۔ مطلوب احمد مطلوب شاگرد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان ۔ زیبا ناروی کو فوجی اعزازات کے ساتھ ایک سند عطا کی گئی تھی جس کی نقل یہاں منسلک کی گئی ہے ۔

Major General Mohammad Aslam,
Ist (SP) Field Regiment Artil
Multan Cantonment
Telephone - Military - 323
Number: 213/1/A/LO
12 September 1983

Mr Zeba Narvi

My dear Zeba Sahib,

On behalf of all ranks of 'The First' and my behalf as Colonel of The Regiment, we would like to express deep appreciation and thanks to you. Your commendable cont of verse for 'The First' and myself, are imbedded deep in c and shall keep our memories fresh of the historic day.

We sincerely hope to see you with us for many more on Phillaura Day and pray to Allah for your health and hap

As a token of our appreciation I am presenting yo two mementos of 'The First', a Pendant and the unit Insign sure these will be accepted by you with our thanks for you to the unit as our Regimental Poet.

with deepest regards

Yours Sincerely

Aslam

دی اور خود جیون ھانہ چلے گئے ۔ شام کو واپس آئے تو ان کی حالت زیادہ بگڑ چکی تھی ۔ چنانچہ ڈاکٹر کو بلایا گیا اس نے کئی دن علاج کیا لیکن وہ تندرست نہ ہو سکیں ، اور تقریباً 40 روز بیمار رہیں ۔ طبیب سے بہت پیار کرتی تھیں اس لیے انہیں کہنے لگیں کہ مجھے گھر لے چلو ۔ لہذا انہیں گھر لے جا کر ان کے کمرے میں لٹا دیا گیا تو ان کی گھبراہٹ اور بے چینی دور ہو گئی ، اور وہ اسی رات وفات پا گئیں ۔ وہ ہر وقت یہ دعا کرتی تھیں کہ اللہ میاں مجھے رمضان کے اس بابرکت مہینے میں اٹھا لے ۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ 6 دسمبر 1969ء 25 رمضان المبارک کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں ۔

زیبا ناروی کو اپنی والدہ کی وفات کا بے حد دکھ پہنچا اور وہ کئی دن اداس رہے، لیکن آہستہ آہستہ وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھنا شروع کیا اور وہ پھر سے اپنی ادبی و شعری سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے ۔[1]

سیاسی و نیم سیاسی سرگرمیاں :

زیبا ناروی سیاسی طور پر مسلم لیگ کے نمایاں کارکن رہے، اور قیام پاکستان کے سلسلے میں ہونے والی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے ۔ قائداعظم سے دلی محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جو اجلاس منعقد ہوتے ان میں زیبا باالتزام شرکت کرتے ۔ اپنی عمر کے آخری لمحے تک وہ مسلم لیگ ہی سے وابستہ رہے، لیکن وہ عملی سیاست میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے اور اپنی شعر و شاعری کی دنیا میں ہی مگن و مست رہتے ۔[2]

1۔ زیبا ناروی کی صاحبزادی ممتاز ملکہ سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

2۔ زیبا ناروی کے صاحبزادے ابوالبشر کاظمی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

علالت :

زیبا ناروی کی صحت بہت اچھی تھی - پوری زندگی میں بہت کم بیمار ہوئے، اگر کبھی تھوڑا بہت بیمار ہو جاتے تو خود دوا بنا کر کھا لیتے اور تندرست ہو جاتے - اپنی عمر کے آخری دنوں تک ہوش و حواس میں رہے اور شعر بھی کہتے رہے - زیبا تقریباً تین مہینے بیمار رہے - اس سے پہلے انہیں دوبارہ دل کا دورہ پڑ چکا تھا - رمضان کے مہینے میں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور منہ میں چھالے نکل آئے جس کے باعث انہیں کھانے پینے میں بہت دقت ہونے لگی - ڈاکٹروں نے بتایا کہ روح کی بیماری ہے ، اور وہ اس کے مطابق علاج کرتے رہے - ان تین مہینوں میں ان کی بیٹی ان کے پاس رہیں - اگر کبھی وہ جانے کا ارادہ کرتیں تو انہیں روک لیتے کہ تم کہیں نہ جاؤ - میرے پاس رہو - وہ کہتیں کہ میری نند وہاں اکیلی ہیں تو کہتے کہ انہیں بھی یہیں بلوا لو مگر تم نہ جاؤ - چنانچہ ان کی بیٹی ملکہ ہر وقت ان کے پاس رہتیں اور انہیں جس چیز کی ضرورت ہوتی فوراً لا کر حاضر کرتیں - ان کے بیٹے اور بہو بھی ہر وقت ان کی خدمت میں لگے رہتے 1

بیماری کے دوران میں زیبا لوگوں سے بہت کم ملتے تھے - ادبی محفلیں بھی چھوڑ دی تھی - اگر کسی مشاعرے میں شرکت کیلئے انہیں لینے کیلئے دروازے پر گاڑی بھی آ جاتی تو نہ جاتے - بیماری میں وہ ٹہلنا چاہتے تھے لیکن ٹہل نہیں سکتے تھے - انہیں سیر کی بہت عادت تھی لیکن اب وہ سیر بھی چھٹ گئی تھی - ان تمام باتوں کے باوجود وہ مریضوں کو آنے سے منع نہیں کرتے تھے، اور ان کے علاج معالجے کی غرض سے بدقت اٹھتے اور انہیں دوا بنا کر دیتے تھے - یہاں تک کہ وفات سے تین دن پہلے تک وہ مریض کیلئے دوائیں بنا کر رکھ گئے تھے - وہ اکثر لیٹے ہوئے کہتے کہ

1- زیبا ناروی کی صاحبزادی ممتاز ملکہ سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

میرے بعد حکمت کون سنبھالے گا ؟ میری کتابیں کون پڑھے گا؟ اصل میں ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے پوتوں میں سے کوئی ایک حکمت یا شاعری کرے، لیکن ان کے پوتوں میں سے کسی کو شاعری یا حکمت سے دلچسپی نہیں، جس کا انہیں افسوس تھا۔ شاعری اور حکمت ان کا خاندانی پیشہ تھا جو زیبا ناروی کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ۔ زیبا ایلوپیتھی دوائیں بہت کم استعمال کرتے تھے، لیکن اب وہ ایسا بھی کرنے لگے تھے ، اور بہت زیادہ پرہیز کرتے تھے ۔ کچھ روز اتفاق ہسپتال میں داخل رہے لیکن پھر گھر آ گئے ۔ انہوں نے اپنی وفات سے چند دن پہلے 11 ستمبر 1987ء کو اپنی آخری نظم کہی ، جو فوج کے " فلورا دن " سے متعلق تھی۔[1]

" نظم " .

سلام شوق وطن کے جری نشانوں کو　　سلام شوق ہے دی فرسٹ کے جوانوں کو

ہمیشہ عہد کے جلسوں میں آ کر شامل ہوں　　گیارہ سال سے میں بھی شریک محفل ہوں

مگر نہ ابکی برس ہو سکا یہاں آنا　　سبب ہوا مرا بیمار ہو کے رہ جانا

دعائیں آپ کی سب کی مگر سنبھال گئیں　　تمام دکھ مرے تن میں جو تھے نکال گئیں

غرض کہ یہ ہے حقیقت مری کہانی میں　　سفر، محال ہوا مجھ کو ناتوانی میں

دعا ہے دل سے کہ دائم یہ شان ممکن ہو　　مبارک آپ کو تجدید عہد کا دن ہو

ہمیشہ فتح و شجاعت تمھارے نام رہے　　خدا کا فضل و کرم تم پہ صبح و شام رہے

وطن کی لاج کے تم ہو نشان تابندہ　　امید ہے کہ ملاقات ہو گی آئندہ

1۔ زیبا ناروی کے داماد انجم زیبائی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

نظر سے، دل سے، زباں سے کلام کر لوں گا

رہا جو زندہ ۔ پھر آ کر سلام کرلوں گا

لیکن موت نے انہیں سلام کرنے کی مہلت نہ دی اور وہ اسی سال اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

وفات :

موت اس کائنات میں ہر ذی روح کا مقدر ہے ، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مر کے بھی نہیں مرتے اور اپنی تخلیقات ، اپنے یادگار کارناموں کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ۔ زیبا ناروی بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہیں ، جو نہ صرف اپنی زندگی میں شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہے، بلکہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی اپنی شاعری کے روپ میں زندہ ہیں۔

زیبا ناروی تین مہینے بیمار رہنے کے بعد تقریباً 93 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ مکمل آرام کرتے اور دوا کھاتے ۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کچھ عرصہ مزید جی سکیں ۔ اکثر کہا کرتے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور اپنی عمر کے سو سال پورے کروں گا ، لیکن افسوس کہ ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور وہ اپنی شاعری کو عین درمیان میں بے سہارا چھوڑ کر رخصت ہو گئے ۔ 28 ستمبر 1987ء کو آدھی رات کے وقت زیبا ناروی کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ۔ انہیں دل کا تیسرا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا ۔ ان کی بیوی ، بیٹا اور بیٹی سب ان کے پاس موجود تھے ۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ مجھے اٹھاؤ، وہ انہیں اٹھا کر کھڑا کر رہے تھے کہ (وہ لڑکھڑا رہے تھے کہ) وہ لڑ کھڑا گئے ۔ انہیں جلدی سے لٹا دیا گیا اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے اور صبح چار بجے کے قریب انہوں نے اپنی جان جان۔آفریں کے سپرد کر دی ۔ اس وقت بڑی تیز آندھی اور

بارش ہو رہی تھی ۔ شاید ان کی اجل اس روپ میں انہیں لینے کیلئے آئی تھی ۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ انہیں ہسپتال لے جانے کی بھی نوبت نہیں آئی اور انہوں نے اپنے گھر میں اپنے سب چاہنے والوں کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا ۔

ان کی بیوی نے ان کی وفات کا اتنا اثر لیا کہ ٹھیک ایک سال بعد زیبا ناروی کی برسی کے دن ان کی طبعیت خراب ہوئی اور 25 دسمبر 1988ء کو وہ بھی مالک حقیقی سے جا ملیں۔

زیبا ناروی کو چوبرجی لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا ۔

زیبا ناروی کی وفات کی اطلاع ان کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں کو تو فوراً مل گئی لیکن ان کے اکثر احباب جو دوسرے شہروں میں مقیم تھے ، ان تک وفات کی خبر بر وقت نہ پہنچ سکی ۔ اس لیے وہ بعد میں آتے رہے اور بعض نے اطلاع ملنے پر وہیں سے اپنے خطوط تعزیت ارسال کر دیئے ۔

روز نامہ جنگ لاہور میں زیبا ناروی کے انتقال کی خبر اس طرح سے شائع ہوئی۔

* آہ استاد زیبا ناروی *

" گذشتہ دنوں ادبی حلقوں میں یہ خبر بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ سنی گئی کہ بزرگ شاعر استاد حکیم زیبا ناروی حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے ۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 98 سال تھی ۔ وہ استاد نوح ناروی کے شاگرد تھے ۔ اس طرح ان کا سلسلہ تلمذ استاد داغ دھلوی سے جا ملتا ہے ۔ استاد زیبا ناروی اس روایتی دبستان شاعری کے آخری چراغ تھے ۔ وہ آخری عمر تک مشاعروں میں باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ وہ بڑے گھن گھرج کے ساتھ شعر سناتے تھے ۔ استاد زیبا ناروی نہایت ملنسار

مخلص، خوش باش انسان تھے ۔ ان کی صحت قابل رشک تھی ، لیکن
گذشتہ دو تین ماہ سے وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کی بنا پر اچانک
انتقال کر گئے ۔ ان کی وفات سے ہم ایک منفرد حیثیت کے شاعر سے محروم
ہو گئے ہیں ۔ دعا ہے اللہ تعالی مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا
فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے"۔[1]

" نوائے وقت " میں " ابراھیم عالم " نے زیبا ناروی کی وفات پر ایک نظم کی صورت میں بھی
اپنے جذبات کا اظہار کیا ۔

* زیبا ناروی کی یاد میں *

شاعری کا وقار تھے زیبا
گوھر تابدار تھے زیبا
جانشین نوح ناروی تسلیم
اور حقیقت شعار تھے زیبا
شعر پڑھتے تو پھول جھڑتے تھے
اک سراپا بہار تھے زیبا
شاعری اوڑھنا بچھونا تھی
شہرت کا شکار تھے زیبا

1۔ روزنامہ " جنگ " لاھور 20 اکتوبر 1987ء

کبھی دست طلب نہ پھیلایا

کس قدر وضعدار تھے زیبا

سچ ہے عالم کہاں وہ رعنائی

شاعری کی بہار تھے زیبا [1]

زیبا ناروی کی وفات پر مختلف شخصیات کے خطوط :

زیبا ناروی کی وفات پر مختلف شخصیات نے ان کے صاحبزادے ابوالبشر کاظمی کے نام خطوط میں اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ۔

لیفٹیننٹ جنرل " سید رفاقت " ایوان صدر اسلام آباد سے لکھتے ہیں ۔۔

" عزیزم سید ابوالبشر کاظمی "

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آج جبکہ آپ کا خط جناب زیبا ناروی صاحب کی رسم چہلم میں شرکت کرنے کے لیے ملا تو مجھے پہلی بار ان کی رحلت کا پتہ چلا ۔ بہت دکھ ہوا ۔ زیادہ افسوس اس لحاظ سے بھی کہ میں آپ کے دکھ میں اس قدر تاخیر سے شریک ہو رہا ہوں ۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل بخشے ۔

مرحوم اپنے زمانہ کی ایک دانشور اور مدبر شخصیت تھے ۔ ان کی شخصیت نے نمایاں اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں ۔ انہوں نے دوستوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ حلقہ ارباب ان کی مغفرت کیلئے دعاؤں میں اہل خانہ کے ساتھ شامل تھا ۔ ان کی وفات سے

1- " نوائے وقت " ۔ لاہور 15 اکتوبر 1987ء

یقیناً ان کے بیشمار دوستوں ، مداحوں اور عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ دی فسٹ (ایس پی) میڈیم رجمنٹ کے تمام افسران سردار صاحبان اور جوان سوگوار ہو گئے ہیں ۔ ان کی دی فسٹ کے ساتھ محبت اور وابستگی اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ مرحوم ایک حساس شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرد مجاہد بھی تھے ، اور ان کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا جس نے محمود غزنوی شہاب الدین غوری جیسے مجاہدوں اور اقبال جیسے مفکروں کی رگ و جان کی آبیاری کی ۔

میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ میری طرف سے اور دی فسٹ کے تمام افسران ، سردار صاحبان اور جوانوں کی طرف سے یہ چند تعزیتی الفاظ قبول فرمائیں ۔[1]

والسلام

رفاقت

اس کے علاوہ جناب فوق زیبائی نے بھی ایک خط میں جناب زیبا ناروی کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا اور لکھا کہ استاد مرحوم ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی موت سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے پر کرنا نہایت مشکل امر ہے، کیونکہ داغ مرحوم کے مدرسے کے آخری شاعر استاد مرحوم ہی تھے۔ جنھوں نے اس دور میں غزل کو زندہ رکھا اور اساتذہ سے اپنا لوہا منوایا ۔ ایسے فطرتی شاعر کم پیدا ہوتے ہیں ۔[2]

1۔ لیفٹیننٹ جنرل سید رفاقت کا خط بنام ابوالبشر ، بتاریخ 8 ربیع الاول 1408 ھ نومبر 1987ء

2۔ فوق زیبائی کا خط بنام ابوالبشر بتاریخ 11 اکتوبر 1987ء

" دی فسٹ " کی طرف سے بھی ایک تعزیتی خط ان کے بیٹے کے نام ارسال کیا گیا ۔ یہ خط فرسٹ کرنل آف دی رجمنٹ میجر جنرل محمد اسلم نے لکھا ۔ جس میں انہوں نے زیبا صاحب کی وفات کو ایک بھاری نقصان قرار دیا اور کہا کہ زیبا صاحب پچھلے گیارہ سال سے رجمنٹ کے " فلوادن " میں تسلسل سے شریک ہوتے رہے اور ہماری ہمت اور حوصلے کو بڑھانے کیلئے ہمیں خوب جوش دلاتے ، اور اب مجھے یقین نہیں آ رہا کہ زیبا صاحب ہم سے دور چلے گئے ہیں ۔

انہوں نے لکھا کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب میں " دی فسٹ " کا پہلا کرنل نامزد ہوا تو زیبا صاحب بے تحاشا خوش ہوئے تھے اور انہوں نے اس موقع پر ایک نظم پڑھی تھی جس میں فوج میں میری اور میرے خاندان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ۔ میں اس نظم کو آج تک اپنی زندگی کی نہایت قیمتی متاع سمجھ کر سنبھالے ہوئے ہوں ۔[1]

زیبا ناروی کے انتقال پر کئی ادیبوں اور شاعروں نے مضامین لکھے ، جن میں زیبا کے سوانح اور ان کی شعری خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

"خالد بزمی " نے اپنے مضمون میں لکھا ۔

استاد زیبا ناروی مرحوم غالباً مرزا داغ دہلوی مرحوم کے مکتبۂ فکر کے آخری اردو شاعر تھے ، جو گذشتہ دنوں تقریباً 97 سال کی عمر میں انتقال کر گئے ۔ وہ انتقال سے پہلے ایک دو ماہ تک صاحب فراش رہے اور صرف یہی وقفہ ایسا تھا جب وہ کسی مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے ورنہ وہ صحیح معنوں میں مشاعرہ باز بلکہ مشاعرہ ساز شاعر تھے ۔ بالکل قدیم اساتذۂ سخن کی طرح وہ جب کسی مشاعرے میں جاتے تو ان کے شاگردوں کی ایک مناسب تعداد بھی ان کی ساتھ ہوتی تھی ۔

1۔ میجر جنرل محمد اسلم کا خط بنام ابوالبشر ، بتاریخ 25 اکتوبر 1987ء

استاد زیبا ناروی کے کلام کا رنگ اپنے استاد سے بہت ملتا جلتا تھا ۔ زیبا ناروی مرحوم کا شعر پڑھنے کا انداز بھی منفرد اور نہایت دلکش تھا ۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ان کی آواز میں وہی کھنک اور کھنک تھی ۔ میں نے زیبا ناروی سے ان کا کلام مخدومی دواخانہ نسبت روڈ لاہور میں ماہورمشاعرے میں پہلی مرتبہ سنا ۔ زیبا صاحب کو اس وقت بھی استاد تسلیم کیا جاتا تھا ۔ خواجہ محمد شفیع نے ان کا تعارف کراتے ہوئے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے کہ :

" حضرات! اب میں حضرت نوح ناروی کے تلمیذ ارشد اور جانشین
جناب حکیم منور حسن صاحب زیبا ناروی مدظلہ العالی کو زحمت کلام
دے رہا ہوں "۔

زیبا صاحب سٹیج پر آئے تو ان کے انتہائی سادہ رنگ کو دیکھ کر بعض احمق زیر لب مسکرائے بھی لیکن ان کے جاننے والوں نے ان کیلئے دیدہ و دل فرش راہ کیے ۔ پھر جب زیبا ناروی مرحوم نے اپنی غزل شروع کی تو جھوم جھوم کر سامعین کا برا حال تھا ۔ لوگ ہر شعر پر لوٹ پوٹ ہوئے جارہے تھے ۔ اس مشاعرے کے بعد مجھے جناب زیبا ناروی کے کلام سے دلچسپی ہو گئی اور میں ان کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شامل ہوتا رہا ۔

جن دنوں میں نے تاج کمپنی لاہور میں باقاعدہ ماہوار نعتیہ مشاعرے شروع کرائے تو زیبا ناروی مرحوم ان میں نہایت محبت و عقیدت سے شامل ہوتے تھے ، بلکہ اپنے ساتھ حسب روایت اپنے شاگردوں کو بھی لایا کرتے تھے جس سے مشاعرے میں ان کی آمد کے بعد رونق دوبالا ہو جاتی تھی ۔ اس مشاعرے کے بعد ہم نے قرآن کمپنی اردو بازار لاہور میں بھی اسی قسم کا ماہوار نعتیہ مشاعرہ شروع کرایا تو زیبا ان مشاعروں میں بھی بالالتزام شریک ہوتے تھے ۔

استاد زیبا ناروی مرحوم نے سفینۂ ادب کے نام سے اپنی بھی ایک بزم قائم کر رکھی تھی جو عام طور پر طرحی مشاعرے کراتی تھی ۔ یہ طرحی مشاعرے نعتیہ اور غزلیہ دونوں طرح کے ہوتے تھے ۔ استاد زیبا ناروی مرحوم کے ایک دوست جناب منظور عثمانی املی والا انار کلی بازار لاہور میں باقاعدگی سے ماہوار مشاعرہ کراتے تھے ۔ وہ فوت ہو گئے تو ان کی بزم انجمن مخلصین ادب کی سرپرستی بھی زیبا مرحوم کے سپرد ہو گئی اور اس طرح وہ ادب و شعر کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتے رہے۔

ایک بار ایک مشاعرے میں بہت لطف آیا ۔ سٹیج سیکرٹری کو یہ معلوم نہ تھا کہ ناروی وہ ضلع نارہ کی نسبت سے ہیں ۔ اس نے ان کا نام پکارنے سے پہلے کہا :

" حضرات! یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ وہ ناروے تک پہنچ گئی ہے۔ ثبوت کے طور پر جناب زیبا ناروی کا کلام سماعت فرمائیں" ان الفاظ سے سامعین کے علاوہ زیبا ناروی بھی بہت محظوظ ہوئے ۔[1]

ایک بار زیبا مرحوم کی وجہ سے بڑا لطیفہ پیش آیا ۔ واقعہ یہی ہے کہ ریلوے والوں نے ایک مشاعرہ کرایا ۔ سٹیج سیکرٹری ریلوے کے کوئی افسر تھے جو شاعروں کے ناموں اور ان کی شخصیات سے بالکل ناواقف تھے ۔ انہوں نے ایک تو مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ ہی دیر بعد زیبا صاحب کا نام پکاردیا ۔ پھر لطیفہ یہ ہوا کہ انہوں نے زیبا صاحب کو خاتون سمجھ لیا تھا کیونکہ اسی نام سے فلمی دنیا کی ایک اداکارہ بھی ان دنوں خاصی معروف بلکہ مقبول بھی تھی۔ سٹیج سیکرٹری نے نہایت

1۔ اسی طرح مرحوم زیبا ناروی کے بارے میں ادبی حلقوں میں ایک شعر کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، جسے جوش ملیح آبادی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ وثوق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال شعر سنئیے ۔

ناروے سے نار سے یا نا روا عادات سے کچھ تو کہئیے آپ زیبا ناروی کیسے ہوئے

احترام اور اہتمام کے ساتھ یوں اعلان کیا کہ " خواتین و حضرات ! اب آپ کے سامنے محترمہ زیبا ناروی صاحبہ اپنا کلام پیش فرمائیں گی" ۔ یہ اعلان سنتے ہی زیبا صاحب کو جاننے والے تو پہلے ہی ہنس دئیے ۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں اس نام کے ساتھ کسی حسین اور شوخ و شنگ کا تصور تھا انہوں نے جب ایک سانولے رنگ کے باریش شاعر کو سٹیج کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنسے بغیر نہ رہ سکے ۔ اب زیبا صاحب کو اپنے نام کی ایسی توہین پر غصہ آ گیا تھا ۔ انہوں نے جتنے بھی اشعار سنائے وہ ایک تو نظریہ تھے دوسرے وہ سٹیج سیکرٹری افسر کی طرف اشارے کرکے سنا رہے تھے ۔اس پر بھی سامعین کو مزید ہنسنے اور خوش ہونے کا موقع مل گیا ۔ ادھر اس اچانک اور " غیر ارادی " شرمندگی سے سٹیج سیکرٹری کا جو حال تھا ، وہ بھی دیدنی تھا ۔

زیبا ناروی مرحوم کے حسب ذیل اشعار سے ان کے کلام کا انداز معلوم ہو سکتا ہے ۔

ہم بھی دو دن کو ہوئے گلشن میں مہمان بہار
حبذا حسن گل تر ، مرحبا شان بہار

پھول برسا دے قفس پر کوئی دوران بہار
ہم سمجھ لیں گے کہ ساعت ہے یہی جان بہار

کس پر قربان ہوں نگاہیں ، کس پہ وارفتہ ہو دل
غنچے بلقیس چمن ہیں ، گل سلیمان بہار

ساقی فطرت نے ہم اندھوں کے حق میں لکھ دیا
جوش بادہ ، بوئے گل ، رنگ چمن ، شان بہار

میں ہوں اے زیبا! جناب نوح کے گلشن کا پھول

کیوں نہ آ جائے مرے قابو میں طوفان بہار[1]

برسی کے موقع پر مختلف ادیبوں کے خیالات :

حلقہ تصنیف ادب کے سیکرٹری غضنفر علی ندیم نے زیبا ناروی کی ایک سالہ برسی کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا ۔ تقریب کی صدارت "ڈاکٹر تبسم رضوانی" نے کی ۔ استاد زیبا ناروی کے داماد انجم زیبائی اور شاگرد سلامت علی خیال مہمان خصوصی تھے ۔ جن حضرات نے استاد زیبا ناروی کے حوالے سے تقریریں کیں ، ان میں ڈاکٹر تبسم رضوانی ، اسماعیل عاطف ، مطلوب احمد خاں مطلوب ، انجم زیبائی اور غضنفر علی ندیم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ سلامت علی خیال اور اویس احمد اویس نے منظوم ہدیہ عقیدت پیش کیا ۔ اویس احمد اویس نے کہا ۔

منفرد ، صاحب شعر زیبا

صاحب شعر ، باخبر زیبا

صاحب علم ، صاحب اخلاق

نکتہ دانوں میں معتبر زیبا

" مطلوب خاں مطلوب" کے خیال میں ،

جو زیبا ناروی کے شاگرد ہیں ، مرحوم کے اسلوب نگارش کو اپنا کر فخر کرتے ہیں اور اپنے استاد کے گھن گھرج کے لہجے میں کلام سناتے ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ مرحوم فصاحت و بلاغت میں اپنے معاصرین میں بلند مقام پر فائز تھے اور سب شعراء ان کا احترام کرتے تھے ۔ فلسفہ ، تصوف، طب

1۔ مضمون خالد بزمی " آہ استاد زیبا ناروی مرحوم " روزنامہ نوائے وقت لاہور 22 اکتوبر 1987ء

اور شعر و ادب کے استاد تھے۔

"غضنفر علی ندیم"

زیبا ناروی ایک بڑی شخصیت تھے ۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے زیبا ناروی کو ایک مخلص اور عظیم الشان پایا ۔ استاد زیبا ناروی استاد ہونے کے باوجود خود کو استاد نہیں کہتے تھے ۔ زیبا ناروی کا کلام بھی ان کے مزاج کی طرح خوبصورت ہے ۔

"اسماعیل عاطف" نے کہا کہ زیبا ناروی نہ صرف استاد بلکہ استادوں کے بھی استاد تھے ۔ مرحوم شفیق ، ملنسار اور قادر الکلام شاعر تھے اور نایاب گوہر تھے۔

" انجم زیبائش" نے زیبا ناروی کے عقیدت مندوں کو یقین دلایا کہ انشاء اللہ آئندہ زیبا مرحوم کی برسی شایان شان طریقے سے منائی جائے گی ۔

" ڈاکٹر تبسم رضوانی" نے کہا کہ استاد زیبا ناروی قادر الکلام شاعر تھے ۔ ان کی حیات میں ان پر گل و بلبل کے لہجے کا شاعر ہونے کا اعتراض وارد ہوا تھا اور استاد جواب دیا کرتے تھے کہ مجھ پر فرسودہ شاعر ہونے کا الزام بالکل غلط ہے ۔ دراصل لوگوں کو ان کی رواداری کا علم نہ تھا ۔ یعنی وہ رواداری استاد داغ کی ہے ۔ جس طرح رواداری داغ نے قائم کی تھی اس کو آگے استاد زیبا بھی بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔[1]

زیبا ناروی کی یاد میں ان کے شاگرد " فوق زیبائی " نے منظوم ہدیہ پیش کیا --

---

1- " انجمن انجمن " استاد زیبا ناروی کی پہلی برسی کی تقریب ، تحریر نثار اکبر آبادی ، ہفت روزہ استقلال ۔9 تا 18 اکتوبر 1988ء

شاعر فطرت مرے استاد زیبا ناروی

ہو گئے ہیں خلد میں آباد زیبا ناروی

شاعران خوش نوا کیونکر کہیں گے بزم میں

کھٹیے پھر کھٹیے ارشاد زیبا ناروی

کان میں کیا گفتگو کرو بیاں فرما گئے

مہر تاباں کی شعاعوں کو پسینے آ گئے

طائر لاھوت کیا بادیدہ نم کہہ گیا

چلچلاتی دھوپ کا چہرہ اتر کر رہ گیا

ہر طرف چھائی اداسی جل گئے شام و سحر

برق بن کر گر پڑی زیبا کی رحلت کی خبر

اے مرے استاد اے مرحوم زیبا ناروی

تو تھا پھولوں کی طرح معصوم زیبا ناروی

شاعر رنگیں بیاں اردو ادب کے آفتاب

تیرے دم سے بزم فکر و فن میں آیا انقلاب

شاعری تیری بہار بے خزاں کا روپ ہے

اور قدرت شعر کی صبح چمن کی دھوپ ہے

اے کہ تیری ذات تھی شعر و سخن کی انجمن

اے کہ تیری شاعری ہے مہر تاباں کی کرن

درحقیقت شعر گوئی ہی تیرا ایمان تھی

محفل شعر و سخن میں تیرے دم سے جان تھی

تیرے اٹھ جانے سے بزم داغ ویراں ہو گئی

نوح کی طبع رسا تڑپ تڑپ کر سو گئی

شعر کہہ کر انجمن میں رنگ بکھرائے گا ،کون

شہر خاموشاں سے تجھکو ڈھونڈ کر لائے گا کون

گلشن افکار کا ہر گل ہے تیرے سوگ میں

زیست کے شغلات کا بلبل ہے تیرے سوگ میں

سوگ میں مہر منور سوگ میں صبح حسیں

سوگ میں شام شفق ہے سوگ میں ماہ جبیں

سوگ میں ہفت آسماں ہیں سوگ میں چرخ آں واں

شہر کے بازار میں مغموم تیرے سوگ میں

مرثیے ہونے لگے مرقوم تیرے سوگ میں

سوگ میں تیرے گریباں چاک ہیں شمس و قمر

پتہ پتہ سوگ میں ہے سوگ میں شاخ شجر

سوگ میں دیوار و در ہیں سوگ میں ہے رہگذر [1]

1۔ اس بند میں چوتھا مصرعہ ہونا چاہئیے تھا لیکن راقمہ کو جو منظوم ہدیہ ملا اس میں یہ تین ہی مصرعے ہیں ۔

ماھیٔ بے آب کی صورت ہے اب بزم غزل

چرخ نیلی فام لا سکتا نہیں تیرا بدل

تو کہ تھا سر تا قدم رنگیں بیانی کی کتاب

تیرا ہر اک شعر شرح زندگانی کی کتاب

مصرعہ ، مصرعہ ہے حیات جاودانی کی کتاب

عہد پیری میں لکھی عہد جوانی کی کتاب

فوق زیبائی کہ تیرے در کا ہے ادنیٰ غلام

جس کے ہر اک سانس میں روشن ہے تیرا احترام

جس کے ہونٹوں پر دعائے مغفرت ہے صبح و شام

قربت حق ہو مقدر ، خلد ہو تیرا مقام (آمین) 1

" علامہ نوقی مظفر نگری " نے قطعہ سنِ وفات لکھا ۔

جس سے تھی بزم سخن میں روشنی

بجھ گیا ہے وہ چراغ شاعری

اہل فن کو مدتوں یاد آئے گا

جانشین نوح زیبا ناروی ؁

زیبا ناروی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی شعر و سخن کی آبیاری میں گزار دی اور اپنے آپ کو شاعری کیلئے وقف کر دیا ۔ انہوں نے اپنے ذریعہ آمدنی طباعت

1۔ یہ منظوم ہدیہ فوق زیبائی نے پیش کیا جو غیر مطبوعہ ہے اور راقمہ کو زیبا ناروی کے داماد انجم زیبائی سے حاصل ہوا ۔

کو بھی اتنی اھمیت نہیں دی ۔ اگر وہ چاھتے تو اسے زیادہ وقت دے کر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے شاعری کو اپنا اوڑھنا ، بچھونا بنایا تھا اور تا حیات اس سے منسلک رھے ۔ ان کا اپنا ایک شعر ان پر صادق آتا ھے کہ انسان فانی ھے ، صرف اس کی یاد باقی رہ جاتی ھے ۔

زندگی کے خواب کی تعبیر باقی رہ گئی
پیکر خاکی مٹا ، تصویر باقی رہ گئی

(ب)

شخصيت

حلیہ اور لباس :

زیبا ناروی کا قد 5 فٹ 6 انچ تھا۔ سفید داڑی تھی اور پٹے رکھے ہوئے تھے ۔ ان کا رنگ سانولا تھا لیکن شخصیت میں وجاہت تھی ۔ جسم نسبتاً بھاری تھا ۔

زیبا ناروی کا پسندیدہ لباس شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ تھا ۔ عام طور پر مشاعروں میں یہی لباس پہن کر جاتے، البتہ کبھی کبھار کرتہ اور پاجامہ بھی پہنتے ۔ سر پر کالے رنگ کی ٹوپی ضرور ہوتی جو رامپوری ٹوپی کہلاتی ہے ۔ جوتا ہمیشہ بند پہنتے تھے اور سفید موزے ہوتے ۔ آخری عمر میں آ کر شلوار قمیض اور دھوتی بھی پہن لیتے تھے ۔ لباس کے معاملے میں بہت شوقین تھے، انہیں سفید لباس زیادہ پسند تھا ۔ نفاست اس قدر زیادہ تھی کہ دھوبی کے استری کیے ہوئے کپڑے دوبارہ خود استری کرتے ۔ دوسروں کا کیا ہوا کام انہیں پسند نہ آتا تھا ۔ اس لیے اپنا بیشتر کام خود کرتے اور اکثر اس صفائی اور لباس کی تیاری میں مشاعروں میں دیر سے پہنچتے تھے ۔[1]

خوراک :

زیبا خوراک کے معاملے میں بہت تکلف سے کام لیتے تھے ۔ عمدہ کھانا کھانے کے شوقین تھے ۔ کوفتے اور قیمہ کریلے شوق سے کھاتے اور اپنی بہو سے فرمائش کرکے پکواتے ۔ ماش کی دال اور پالک کے ساتھ ابلے ہوئے چاول انہیں بے حد مرغوب تھے ۔ کھانے کے بعد قہوہ ضرور پیتے اور یوں بھی سارا دن وقفے وقفے سے قہوہ پیتے رہتے ۔ قہوہ میں دودھ کبھی نہ ملاتے ۔ کہتے تھے کہ دودھ ملانے سے اس کی تاثیر بدل جاتی ہے ۔ کھانے میں جو بھی سامنے آتا، کھا لیتے لیکن اس بات کا خیال رکھتے

1۔ مطلوب احمد مطلوب شاگرد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

کہ کھانا گرم ہو اور وقت پر کھایا جائے ۔ وہ چاہتے تھے کہ کھلانے والا ان کے پاس بیٹھا رہے اور باتیں کرتا رہے ۔ زیبا کبھی اکیلے کھانا نہ کھاتے بلکہ کسی نہ کسی شخص کو ساتھ بٹھا کر اسے بھی کھلاتے اور خود بھی کھاتے ۔ دراصل وہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے ۔

عادات و خصائل :

زیبا ناروی بہت صبح اٹھنے کے عادی اور نماز کے پابند تھے ۔ رات کافی دیر تک جاگتے رہتے ۔ اس کے باوجود صبح سے پہلے ہی ان کی آنکھ کھل جاتی ۔ ان کی بیٹھک میں ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا ، چونکہ طب بھی گھر ہی میں کرتے تھے ۔ اس لیے اکثر مریض دوا لینے کیلئے آتے اور رات گئے تک بیٹھے رہتے ۔ کچھ شاگرد اصلاح لینے کی غرض سے موجود رہتے ۔ کسی مہمان کو کبھی کچھ کھائے پئے بغیر نہ جانے دیتے ۔ قہوہ پلاتے ، کھانا کھلاتے ۔ ان کی بیٹھک ہر وقت کھلی رہتی تھی ۔ ایک سلسلہ حکمت کا تھا ، دوسرا شاعری کا اور یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے ۔ اور طبابت کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ حکمت کا فن پیغمبروں والا فن ہے ۔[1]

زیبا بے حد با مروت آدمی تھے ۔ لوگ رات کو بارہ ، ایک بجے تک ان کے یہاں بیٹھے رہتے اور وہ کبھی انہیں جانے کیلئے نہ کہتے ۔

زیبا ناروی مطالعے کا بہت شوق رکھتے تھے ۔ انہیں اسلامی اور تاریخی علوم پر عبور حاصل تھا ۔ اگر کوئی بحث چھڑ جاتی تو کوئی ان سے جیت نہ سکتا تھا ۔ کسی بھی مسئلے پر بات چھیڑ دی جاتی وہ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے اور بڑی تفصیل سے سمجھاتے اور دوسرے کو مطمئن کرکے چھوڑتے ۔ اسی طرح اگر کسی کتاب کو ایک دفعہ پڑھنا شروع کر دیتے تو خواہ کتنی ہی رات کیوں نہ

1۔ زیبا ناروی کے شاگرد اور ساتھی مطلوب احمد سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

بیٹ جائے ، جب تک وہ ختم نہ ہو جاتی ، اسے نہ چھوڑتے۔[1]

زیبا اپنی اولاد سے پیار اور محبت سے پیش آتے تھے ، کبھی کسی سے تلخی سے بات نہ کرتے ۔ ہر ایک سے خوش اسلوبی کا برتاؤ کرتے ۔ ایک دفعہ کوئی ان سے مل لیتا تو گرویدہ ہو جاتا اور دوبارہ ملنے کی خواہش کرتا ۔ بے حد مہمان نواز تھے ۔ ان کے دستر خوان پر کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا تھا ۔کھانے کے وقت کوئی آ جاتا تو انہیں بھوک لگتی اور اگر نہ آتا تو وہ بھی کھانا نہ کھاتے ۔ اکثر اوقات ایسا ہوا کہ ان کیلئے کھانا لگایا گیا اور کوئی مہمان آ گیا ، مزید کھانا موجود نہیں تو زیبا نے وہ کھانا مہمان کو کھلا دیا اور خود بھوکے رہے ۔ اس بات پر اکثر ان کی اپنی بیوی سے لڑائی ہو جاتی ۔ وہ اس بات کو پسند نہ کرتیں ، لیکن زیبا پروا نہ کرتے ۔

انہیں غصہ صرف اس وقت آتا جب ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو جاتا ۔ مثلاً وہ اپنی چیزوں کو ادھر سے ادھر ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے ، اور نہ وہ اس بات کو برداشت کرتے کہ کوئی ان کی کتابیں یا کاغذات کو ہاتھ لگائے ۔ وہ خود کسی قسم کا کاغذ ضائع نہیں کرتے ہے ، حتی کہ پان کھاتے تو اس کے کاغذ بھی تہہ کرکے رکھ لیتے ۔ دوستوں کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت کرتے تھے اور ہر ایک کے خط کو سنبھال کر رکھتے تھے ۔[2]

زیبا اپنی اولاد کو بہت چاہتے تھے ۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتے ، البتہ جب کسی بات کے متعلق انہیں گمان گزرتا کہ یہ بات صحیح نہیں تو اس سے منع ضرور کرتے اور اس کی وجہ بتاتے تاکہ ان کی تسلی ہو جائے ۔

1۔ انجم زیبائی داماد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

2۔ ایضاً

زیبا صبح سویرے اٹھ کر ساری گلی میں چھڑکاؤ کیا کرتے تاکہ صفائی رہے ۔ اپنے پوتے، پوتیوں سے بڑی محبت کرتے تھے ۔ ایک دفعہ ان کے پوتے نے آدھی رات کو لڈو مانگے، سب گھر والوں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا اس وقت لڈو کہاں سے ملیں گے، صبح لے لینا ، لیکن زیبا ناروی رات کے دو بجے رکشے میں لے گئے اور مٹھائی لے کر آئے ۔ اسی طرح سے ایک دفعہ زیبا کی بیٹی کراچی گئیں تو ان کا پوتا بہت ضد کرتا کہ میں بھی پھو پھو جان کے ساتھ جاؤں گا ۔ زیبا سارا دن اسے رکشے میں لے کر پھرتے رہتے تاکہ اس کا دل بہل جائے ۔ زیبا ناروی اپنے بہن بھائیوں اور والدہ سے بھی بہت پیار کرتے تھے اور ان کی بات ضرور مانتے تھے ۔[1]

زیبا ناروی کچھ لاپروا طبیعت کے مالک تھے ، اکثر وعدہ کرکے بھول جاتے ۔ وہ اپنے پیر و مرشد کے علاج کیلئے ان کے دربار میں جایا کرتے تھے، لیکن جب کبھی ان سے رخصت حاصل کرکے آتے اپنی گوناگوں مصروفیات میں اس قدر محو ہو جاتے کہ انہیں یہ یاد نہ رہتا کہ وہاں بھی جانا ہے اور شاہ محمد عبدالشکور بغرض علاج ان کے منتظر رہتے ۔ ایک دفعہ حضرت قبلہ شاہ محمد عبدالشکور نے اکرم شاہ صاحب سے کہا کہ بھائی تمہارے استاد وعدے کے ٹھیک آدمی نہیں ہیں ۔[2]

زیبا بہت خود دار تھے ، کسی معاملے میں سفارش سے کام نہ لیتے اور کہتے کہ آدمی کو اپنی ہمت اور قابلیت سے ہی سب کچھ حاصل کرنا چاہئیے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے کبھی اپنی اولاد سے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے اس چیز کی ضرورت ہے ، بلکہ وہ خود ہی جو کچھ دیتے، لے لیتے ۔ وہ نہایت وضعدار تھے ۔

1۔ عالیہ نسیم پوتی زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

2۔ اکرم شاہ صاحب پیر بھائی زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

زیبا ناروی مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے ۔ مزاج میں حلم تھا ،قوت برداشت تھی ۔ حوصلہ افزائی کا جذبہ تھا ، ان کا دستر خوان کشادہ تھا اور حسب توفیق کرم فرمائی کرتے تھے ۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ ان کی وضعداری کا بھی ملاحظہ فرمائیے ۔ مشاعروں کے اختتام پر شعرائے کرام کی تواضع کرنا عام اخلاقی رسم ہے ۔ دیکھئیے وہ اس رسم کو کہاں تک نبھاتے ہیں ۔ زیبا صاحب نے ایک انجمن سفینۂ ادب پاکستان (لاہور) قائم کی تھی جس کے زیر اہتمام اوسطاً ہر ماہ طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایک شعتبہ طرحی مشاعرہ "نام ہے، کلام ہے" کے انعقاد کے دعوت نامے جاری ہوئے ۔ تاریخ مقررہ پر شعرائے کرام تشریف لائے ۔ جب محفل مکمل ہو گئی تو زیبا صاحب نے اعلان فرمایا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر آج مشاعرہ نہ ہو سکے گا ۔ پھر بھی شعرائے کرام کی تواضع اسی روایتی انداز پر فرمائی ۔ لطف یہ ہے کہ یہ تجربہ شعرائے کرام کو ایک سے زیادہ بار ہوا ۔[1]

زیبا ناروی پیدل چلنے کے بہت زیادہ عادی تھے، اور اکثر مشاعروں میں دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی پہنچ جاتے ۔ چار، پانچ میل کا فاصلہ تو ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا ۔ زیادہ تر سفر بغیر سواری کے کرتے تھے ۔

ان کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ ہمیشہ بغیر گھر بتائے، اپنا ایک اٹیچی اٹھاتے اور چلے جاتے ۔ چھ چھ ماہ تک پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں گئے ہیں ۔ کوئی کہتا کہ میں نے فلاں جگہ دیکھا ہے تو کوئی بتاتا کہ میں نے فلاں شہر میں دیکھا ہے ۔ اس بات کا کسی کو پتہ نہ ہوتا ، حتی کہ اپنی بیوی اور قریبی دوستوں کو بھی نہ بتاتے ۔ اور پھر جب دل چاہتا

1۔ زیبا ناروی کے قریبی ساتھی وحید خیال کے تاثرات

واپس آ جاتے ہے[1]

زیبا بڑے تساہل مزاج تھے اور ہر کام کو " پھر کر لیں گے" کہہ کر ٹال دیتے تھے ۔ روپے، پیسے سے انہیں ذرا دلچسپی نہ تھی ۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی ساری توجہ اور اپنا سارا وقت طبابت میں لگا کر روپے کما سکتے تھے لیکن انہیں اس بات کا لالچ نہیں تھا ۔ کبھی کسی مریض سے پیسے نہ مانگتے، بلکہ جو وہ دے جاتے، بخوشی قبول کر لیتے ۔ اس کے باوجود شاہ خرچ تھے ۔ جب پیسہ ہاتھ آیا ، فوراً اڑا دیا ، اور جب نہیں تو کوئی پروا نہیں ۔[2]

وہ حکیم اور شاعر ہونے کے مقابلے میں " انسان " زیادہ تھے ۔ وہ انسانیت کے مقابلے میں دوسری ہر چیز کو نظر انداز کر سکتے تھے ۔ ان کی زندگی کے اس ایک پہلو ہی سے ان کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ زیبا ناروی کسی معاملے میں کسی وقت کے پابند نہیں تھے ۔ وہ ہر کام اپنی صوابدید پر کرتے تھے ۔ مثلاً ایک نعتیہ مشاعرے میں آپ کو صدارت فرمانا تھی ۔ مشاعرہ سات بجے شام کو شروع ہونا تھا ۔ جب آپ صدارت کیلئے پہنچے تو شعرائے کرام الوداعی چائے پی رہے تھے ۔ آپ گیارہ بجے رات کو تشریف لائے تھے ۔ جناب وحید خیال نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ زیبا ناروی میرے " بے تکلف محترم" تھے ۔ میں ان کے دربار میں بہت گستاخ تھا ۔ اس کے باوجود خدا جانے انہیں میری کون سی بات پسند تھی کہ وہ میری ہر بات کو مسکرا کر نظر انداز کر دیتے تھے یا پھر وہ مجھے نادان سمجھتے تھے۔

1- زیبا ناروی صوفی منش تھے اور اکثر صوفیاء کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے ۔ اس مقصد کیلئے وہ دوسرے شہروں میں بھی جاتے ۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر حصے میں ان کے ساتھی اور مداح قیام پذیر تھے اس لیے زیبا جب کبھی ان کے پاس جاتے تو کئی کئی دن وہیں گزار دیتے اور اپنے حلقۂ احباب میں مگن اس بات کو بھول جاتے کہ کتنا عرصہ گزر گیا ہے ۔ یہ بات مطلوب احمد صاحب نے راقمہ کو بتائی ۔

2- مطلوب احمد مطلوب شاگرد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

چنانچہ دوسرے دن میں علی الصبح ان کی جناب میں پہنچ گیا اور رات کی صدارت کے معاملہ میں لڑنا شروع کر دیا اس لڑائی کی وجہ صرف تاخیر ہی نہیں تھی بلکہ ذات کے مشاعرے میں شریک بعض شعراء نے مجھے ہدف تنقید بنا لیا تھا ۔ شاہنداں کو میرے باھمی تعلق کا علم تھا ۔ میں نے پوچھا " مولانا صاحب ! آپ کی رات والی حرکت کا کیا جواز تھا" فرمانے لگے " آپ کا کیا خیال ہے ۔ میری حرکت شعوری تھی یا لا شعوری ؟ " میرے ذھن نے جھٹکا کھایا اور قریب تھا کہ میں کوئی جواب دیتا ، اچانک محلے کے ایک بزرگ تشریف لائے اور رات میں ان کی مریضہ بیوی پر حکیمانہ توجہ دینے پر زیبا ناروی کا شکریہ ادا کرنے لگے ۔ انہیں ساری بات سمجھ گیا [1]۔

زیبا ناروی درویش منش آدمی تھے ۔ اس درجے تک کہ انہوں نے اپنے کلام کو کتابی شکل میں سامنے لانے کیلئے بھی کوئی کوشش نہ کی ۔ ان کے کئی شاگردوں کے شعری مجموعے کتابی شکل میں مرتب ہو کر بازار میں آ چکے ہیں لیکن ان کو اصلاح دینے والے ، ان کو اس قابل بنانے والے کا کوئی ایک دیوان بھی نہ چھپ سکا ۔ ان کے شاگرد پیر نصیر الدین اکثر کہتے کہ آپ اپنا کلام جمع کرکے دیں میں انہیں چھپواؤں گا ، لیکن زیبا اس معاملے میں قدرے بے نیاز واقع ہوئے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بے شمار ہے لیکن بکھری پڑی ہے ۔

زیبا سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے انہیں غصہ آتا تو صرف اپنی بیوی پر ، لیکن چند لمحوں بعد پھر ایک ہو جاتے ۔ وہ خود تو انہیں جو چاہے کہہ لیتے لیکن کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ حرف زنی کر سکے ۔ ان کی بیوی بھی وقتی طور پر جھگڑ پڑتیں مگر تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ بھول بھال کر ویسے ہی ہو جاتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ زیبا کے انتقال

1- زیبا ناروی کے قریبی دوست و ساتھی وحید خیال کے تاثرات

پر انہیں ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ صرف ایک سال بعد ہی وفات پا گئیں ۔[1]

انہیں لڑکیوں سے زیادہ پیار تھا ۔ کبھی پیار سے اپنی بیٹی کو کہتے " ملک قہوہ پلاؤ گی "۔ ان کی بہو اپنے سسر کی بہت خدمت اور احترام کرتی تھیں اور زیبا بھی انہیں بیٹیوں کی طرح چاہتے اور دلہن کہہ کر پکارتے تھے ۔ زیبا اپنی بیٹی سے زیادہ بہو کا خیال رکھتے تھے ۔

ان کی طبیعت میں استغناء ، قناعت حد سے زیادہ تھی ۔ انہوں نے ساری زندگی سادگی کے ساتھ گزار دی ۔ پاکستان آنے کے بعد اوائل میں مالی آسودگی نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ہشاش بشاش رہے اور غم روزگار کا رونا نہیں رویا ۔ دل و دماغ کو طلب دنیا کی آلودگیوں سے ہمیشہ پاک رکھا ۔

ہندوستان کے تقریباً تمام ہی معروف شعراء کا زیبا ناروی کے گھر آنا جانا رہتا تھا اور یہ سلسلہ پاکستان آنے کے بعد بھی تا دم مرگ جاری رہا ۔ پاکستان کے کسی بھی شہر سے یا ہندوستان سے کوئی معروف شاعر اپنے کام سے لاہور آتا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ زیبا ناروی کے دولتکدہ پر حاضر نہ ہو ۔ پھر فوری طور پر مہمان شاعر کے اعزاز میں شعری نشست کا انتظام کرنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ جس محبت اور عقیدت سے شاعر حضرات ملتے تھے اور جواباً زیبا ناروی کا مشفقانہ برتاؤ احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔ پرانی اقدار اور وضع داری نبھانا زیبا پر ختم تھا ۔ زیبا ناروی میں اپنے اسلاف کی مروت اور سخاوت کے ساتھ ساتھ اسلاف کی نجابت اور سماحت بدرجہ اتم موجود تھی ۔

زیبا ہر قسم کے ماحول میں خود کو ڈھال لیتے تھے ۔ بڑوں کے ساتھ بڑے اور بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے تھے ۔ لوگوں کے ساتھ اتنے اچھے طریقے سے پیش آتے تھے کہ لوگ ان پر ہی اعتقاد رکھتے اور دور دراز سے علاج کروانے ان کے پاس آتے ۔ یہاں تک کہ جب زیبا گھر پہ موجود نہ ہوتے، تب

1- انجم زیبائی داماد زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

بھی وہ انتظار کرتے رہتے کہ حکیم صاحب آئیں گے تو انہی سے دوا لیں گے ۔ دراصل بات یہ تھی کہ ان کا حلقۂ احباب اتنا وسیع تھا کہ جہاں جاتے تھے ، وہاں سے ان کا چھٹکارا مشکل ہو جاتا تھا۔1

وہ آزادی پسند تھے اس لیے خود کو کسی ملازمت کا پابند نہیں کر سکتے تھے ۔ پاکستان میں آنے کے بعد انہیں اچھی سے اچھی ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے انکار کر دیا ۔

شـــاعــری :

زیبا ناروی ایک ایسے چمن زاد سخن تھے جن کے گل مہکتے تھے اور بلبل چہکتے تھے ۔ آپ پورے ہندوستان میں ہونے والے مشاعروں میں گھومتے اور ہر شعری محفل میں شریک ہوتے تھے ۔ دہلی میں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ہاں مشاعرے ہوتے تھے جن کے بانی سید آل رضا تھے ۔ زیبا ان مشاعروں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے ۔ یہاں اکثر ایسی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جو دن اور رات جاری رہتیں اور ان میں کثیر تعداد میں استاد شعراء شرکت کرتے تھے ۔ جھانسی ، گوالیار ، مین پوری ، بنارس اور پٹنہ وغیرہ میں بھی اہتمامی مشاعرے ہوتے جو تین دن اور /رات چلتے تھے ۔ ان میں کھانے کا انتظام بھی ہوتا اور نذرانے بھی ملا کرتے تھے ۔ لائل پور کاٹن مل کے مشاعروں میں ایک لٹھے یا ململ کا تھان اور پانچ سو روپے دیئے جاتے تھے ۔2

زیبا ناروی نے 1917ء میں مین پوری کے مشاعرے میں پہلی بار اپنی غزل پڑھی ، تب سے اپنی وفات تک مشاعرے کی روایت سے وابستہ رہے ۔ نوح ناروی کی زندگی میں یہ مشق سخن شروع ہوئی اور

1۔ نسیم بیگم بہو زیبا ناروی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

2۔ مطلوب احمد مطلوب شاگرد و ساتھی زیبا/ سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان

ان کی زندگی ہی میں فارغ التحصیل ہو کر دہلی آئے ۔ دہلی میں ہونے والے مشاعروں نے ان کی شعری صلاحیتوں کی پرداخت کی ۔ زیبا ناروی طرحی مشاعروں کے شاعر تھے ۔ وہ خود بھی طرحی غزل کہتے اور اپنے شاگردوں کو بھی کئی کئی غزلیں دیتے تھے ۔ یوں طرحی مشاعروں کی کامیابی کا سہرا استاد زیبا ناروی کے سر ہوتا ۔

قیام پاکستان کے بعد جب زیبا ناروی دلی سے لاہور آئے تو یہاں طرحی مشاعروں کا سلسلہ شروع کرایا ۔ 1950ء کے بعد صدر چھاؤنی کے مشاعرے ، باغبانپورہ کے مشاعرے، رشسی بھون برانڈرتھ روڈ کے مشاعرے ، مخدومی دیا خانہ شبت روڈ کے مشاعرے اور پھر سفینہ اردو پاکستان کرشن نگر کے مشاعرے، یہ سب کے سب مشاعرے طرحی ہوتے تھے ۔ ایک ماہ پیشتر یا پندرہ روز پیشتر مصرعہ طرح کا اعلان کر دیا جاتا تھا ۔ ان عظیم الشان اور یادگار مشاعروں میں حکیم نیر واسطی ، احسان دانش ، صوفی وارث رسا جالندھری ، ایف ڈی گوہر، سیف زلفی ، پروفیسر محمد شوق ، چاندپوری ، یوسف علی گوھی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی وغیرہ بھی شرکت کرتے ہے ۔[1]

ان کے علاوہ لاہور میں ہونے والے مشاعرے ، جن میں زیبا کی شرکت بالالتزام ہوتی تھی ان میں " انجمن محمدی " میں ہونے والا خالصتاً مذہبی مشاعرہ ، مجددیہ سالانہ عرس کا مشاعرہ، تکیہ املی والا کا مشاعرہ ورلڈ ڈائجسٹ کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعرے ، منشی چیمبرز چوک پرانی انار کلی میں ہونے والے مشاعرے ، شیزان ریسٹورنٹ شاہراہ قائداعظم کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں کے علاوہ مانکی صاحب اور آغا مسعود رضا خاکی کے ہاں ہونے والے مشاعرے بھی شامل ہیں ۔ اس کے علاوہ زیبا ناروی " انجمن شعرائے اہل بیت " کے صدر تھے ۔

1- مضمون " نثار اکبر آبادی " ہفت روزہ استقلال 18 اکتوبر 1988ء

زیبا ناروی ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ اپنے گھر میں بھی منعقد کیا کرتے تھے ۔ جس دن ان کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا ، گلی میں بلب لگ جاتا تھا ، عجیب طرح کی رونق ہوتی تھی ۔ قدرت نے زیبا کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا ۔ ایک طرف تو انہیں سخنوری عطا کی تھی ، تو ساتھ ہی انہیں مضبوط پھیپھڑے بھی دے رکھے تھے ۔ بڑے بڑے بولنے والے ان کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے ۔ زیبا مشاعرہ لوٹنے کا فن جانتے تھے ۔ اکثر اوقات جب کسی مشاعرے میں ان سے پہلے کسی عمدہ شاعر کو دعوت دی جاتی اور پھر زیبا کی باری آتی تو وہ عموماً رباعیات منتخب کرتے کہ سامعین بے خود ہو جاتے اور زیبا خوب داد سمیٹتے ۔ مشاعرے میں شریک ہونے والے ان کے کلام کی شعلہ نوائی کو ضرور محسوس کرتے جو محفل کو گرما کر دلوں کی دھڑکن تیز کر دیتی تھی ۔

زیبا ناروی کے منعقد کردہ مشاعروں میں شرکت کرنے کیلئے شعراء دور دور سے آتے تھے ۔ ان تمام مشاعروں کی جان زیبا ہوتے تھے ۔ ان کی موجودگی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی ۔[1] یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر نثار اکبرآبادی نے لکھا کہ :

" اب تو شاید زندگی میں کبھی طرحی مشاعرہ نہیں ہو سکے گا ، کیونکہ طرحی مشاعروں کا بادشاہ اور شہنشاہ غزل سب کو چھوڑ کر اپنی اصلی دنیا میں جا چکا ہے ۔ اب وہ جنت میں فرشتوں اور حوروں کی محفل میں طرحی غزل سنا رہا ہوگا ۔ احسان دانش ، حکیم منیر واسطی اور صوفی وارثی کے ساتھ وہ بلبل خوش نوا شاخ سے اڑ چکا ہے ۔ اب چہکار کی آواز آئے تو کہاں سے آئے " ۔[2]

1۔ مطلوب احمد ساتھی زیبا ناروی سے انٹرویو

2۔ " ہفت روزہ استقلال " نثار اکبر آبادی ص9 ، 18 اکتوبر 1988ء

زیبا ناروی کی شاعری شروع ہی سے بڑی سنجیدہ ، سادہ ، فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کی خوبیوں کی حامل تھی ۔ وہ پہلے پہل نوح ناروی کو اپنی غزلیں اصلاح کیلئے بھیجا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد ہی نوح ناروی نے کہا کہ آپ کی غزلوں کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے ۔ چنانچہ ایک دفعہ زیبا ناروی نے اپنی کچھ غزلیں اپنے پیر بھائی محمد اکرم شاہ صاحب کو دکھائیں جو انہوں نے نوح ناروی کو اصلاح کیلئے بھیجی تھیں اور انہوں نے محض ایک لفظ کی اصلاح کی تھی اور یہ لکھا تھا کہ آپ کی غزلوں میں اصلاح کی مطلق گنجائش نہیں ہے ۔ بس آپ کی دلجمعی کے لیے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لگا رہا ہوں ۔[1]

زیبا ناروی غزلیات کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ۔ انہوں نے نظم ، مخمس ، قطعات ، نعتیں ، منقبت ، سہرے سلام ، مرثیے سبھی اصناف میں اپنی طبع کے جوہر دکھائے ہیں ۔ ان کا اکثر کلام مختلف ادبی جریدوں میں شائع ہوتا رہا ۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوسروں کو بھی بہت کچھ لکھ کر دیا ۔ خاص طور پر ہجرت کے بعد وہ کٹھن حالات سے گزرے ، جس کے باعث انہوں نے اپنا بیشتر کلام فروخت کر دیا ۔ انہوں نے ایک بہت طویل مثنوی لکھی تھی جو صرف دو ہزار میں فروخت کر دی اور خریدنے والے شخص نے اسے اپنے نام سے چھپوا لیا ۔[2]

زیبا ناروی کو کلام کی شان و شوکت ، استعارات کی طرفگی ، بندش کی چستی ، مضامین کی نزاکت خیالات کی رفعت اور فقروں کی درستی میں بدرجہ اتم کمال حاصل تھا ، اور اسی وجہ سے ہر محفل میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ نہایت خوش فکر تھے اور عروض کمال کی حد تک جانتے

1۔ یہ بات اکرم شاہ صاحب نے راقمہ کو بتائی ۔

2۔ زیبا ناروی نے یہ مثنوی " پس چہ باید کرد پاکستانیاں " کے عنوان سے لکھی تھی لیکن غلام غوث صمدانی نے ان سے مثنوی خرید کر " مثنوی صمدانی " کے نام سے چھپوا لی تھی ۔ اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے ۔

تھے ۔ اپنی غزلوں میں اچھوتے مضامین پیش کرتے تھے ۔ آپ اپنے شیریں و رنگین کلام کی وجہ سے تمام ھندوستان اور پاکستان میں مشہور تھے ۔ آپ ذھین ، پرگو اور ذی علم شاعر تھے ۔ عیب جوئی اور ھجو گوئی کبھی نہ کرتے تھے ۔ آپ کا حافظہ بڑی قوی تھا ۔ حافظے کا عالم یہ تھا کہ رات بھر مشاعرہ سنتے تھے اور صبح کو اچھے شعر سنا دیتے تھے ۔

زیبا ناروی کی شعر کہنے کی صلاحیت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ان کے قریبی ساتھی وحید خیال صاحب نے بتایا کہ ۔ ۔

زیبا صاحب کس رفتار سے شعر کہہ سکتے تھے اس کا اندازہ مجھے یوں ھے کہ ایک نعتیہ مشاعرے میں ان کی صدارت تھی ۔ مشاعرے کی ابتدائی کارروائی سے پہلے زیبا صاحب نے اعلان کیا کہ وہ مشاعرے کی صدارت نہیں کر سکتے ۔ اس عذر پر کہ انہوں نے طرح مصرعہ میں نعت نہیں لکھی ھے اور صدارت کیلئے میرے نام کا اعلان کر دیا ۔ مشاعرہ شروع ھو گیا ۔ زیبا مرحوم دوسرے شعراء کے ساتھ بیٹھ گئے ۔ دوران مشاعرہ میں نے اندازہ لگایا کہ زیبا کچھ لکھ رہے ھیں ۔ میں خاموش رھا ۔ جب آخری شاعر کی باری آنے والی تھی میں نے جوابی اعلان کیا " جس بات پر زیبا صاحب نے صدارت سے معذوری ظاھر کی تھی اب ان کا وہ عذر ختم ھو گیا ھے لہذا میں کرسی صدارت زیبا صاحب کو واپس کرتا ھوں اور یہ کہہ کر صف شعراء میں آ کر بیٹھ گیا ۔ انہوں نے نعت پڑھی ایسی کہ صدارتی منصب کا حق ادا کر دیا ۔

اسی طرح ایک بیرونی مشاعرے کے سفر کے دوران بس میں طرحی منقبت کے شعر کہہ لیے تھے۔

زیبا اگر طرح مصرعہ سے مجبور نہ ھوتے تو بہت کم تازہ شعر کہتے تھے ۔ وہ عام طور پر خستہ بیاضوں سے کلام پڑھتے تھے جو نئے سامعین کیلئے تو تازہ ھوتا تھا مگر پرانے سامعین کیلئے باسی ۔

مشاعروں میں غزل تحت اللفظ پڑھتے مگر مشاعرے پر چھا جاتے ۔

مذہب :

زیبا ناروی مذہبی انسان تھے ۔ ان کا مسلک حنفی اور بریلوی تھا ۔ یعنی نیاز اور نذر کو مانتے تھے ، اور گھر میں اس قسم کی مجالس کا انعقاد کراتے ۔ انہیں مذہب سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور وہ مذہبی اور دینی افکار کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے ۔ نماز پابندی سے پڑھتے ہے ۔ روزے اگرچہ پورے نہ رکھ پاتے لیکن رمضان کے مہینے کا بہت زیادہ احترام کرتے اور گھر میں بھی اس کی تلقین کرتے ۔ ان کے دل میں حج کرنے کی آرزو شدت سے موجود تھی اور انہوں نے اس مقصد کیلئے مسلسل تین سال تک اپنا نام بھیجا لیکن قرعہ اندازی میں ان کا نام نہ نکل سکا ۔

زیبا متعصب بالکل نہ تھے ، اور شیعہ ، سنی میں کچھ فرق نہ کرتے تھے ۔ وہ وسیع القلب تھے اور حقیقت کو مانتے تھے ۔ اس لیے شیعہ حضرات کی مجالس میں بھی من و عن شریک ہوتے اور اپنے محلے کی شیعہ کمیٹی کے صدر تھے ۔ ان کی مجالس میں مرثیے اور سلام پڑھتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے[1]

بحیثیت استاد :

زیبا ناروی اپنے استاد کی زندگی ہی میں استادی کا مقام حاصل کر چکے تھے ۔ وہ نہایت بلند پایہ استاد تھے ۔ فی البدیہہ شعر کہتے ۔ شاگردوں کے ساتھ شفقت کا برتاو کرتے اور ہر آدمی کو اس کی ذہنی قابلیت کے مطابق اصلاح دیتے ۔ اکثر و بیشتر شعراء کے ناقص اشعار کی خوشی خوشی اصلاح کرتے اور انہیں بڑی خوبصورتی سے عمدہ شعروں میں تبدیل کر دیتے ۔ بہت کم شاعر ایسے اشعار

1- زیبا ناروی کے صاحبزادے ابوالبشر کاظمی اور داماد انجم زیبائی سے ملاقات کے دوران میں راقمہ کو یہ باتیں معلوم ہوئیں ۔

کی اصلاح کرنے میں ایسی استادی دکھا سکتے ہیں جیسی زیبا دکھاتے تھے ۔ وہ ایک ناکارہ آدمی کو شاعر بنا دیتے تھے ۔ آپ حلیم طبیعت کے مالک تھے ، اور ملنسار اور خوش باش تھے ۔ وہ نئے شعراء کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ۔

فوق زیبائی ، ھارون رشید اختر، شائق زیدی ، اسماعیل عاطف ، موج زیبائی ، لطیف ساحل، نصیر الدین شاہ سجادہ نشین گولڑہ شریف ، اکرم زیبائی ، عارف زیبائی ، مطلوب احمد خاں مطلوب ، قمر صدیقی ، انجم زیبائی،اصغر علی رانا ، مظفر نگری ، محمد ایوب بزمی ، عاصم بزمی ۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب وہ اپنے شاگردوں کے اکھاڑے کو ساتھ لے کر چلتے تھے بالکل اس طرح جیسے کسی دور میں انیس و دبیر اپنے اپنے اکھاڑوں کے ساتھ چلتے تھے ۔ زیبا ناروی کا اکھاڑا تلاش معاش میں بکھر گیا اور بعض نے اپنا رنگ کلام اپنے دور کے مطابق کر لیا اور یوں بھی ہر شاگرد ہمیشہ استاد کے سامنے ہی تو بیٹھا نہیں رہ سکتا ۔ آخر غلامی اور آزادی کی خصوصیات میں فرق تو ہوتا ہے ۔

زیبا ناروی اپنے شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح تو کیا کرتے تھے، غزل ہی دے دیتے تھے ۔ مزید یہ کہ شاگرد کچھ غزل رواں کرنے میں مدد نہیں دیتے ہے اس کا نتیجہ بھرے مشاعرے میں ظاہر ہو جاتا تھا ۔[1]

مزاح و ظرافت :

زیبا ناروی خوش طبع و شگفتہ مزاج تھے ۔ گھر میں سب کے ساتھ ھنسی مزاق میں مشغول رہتے

1۔ زیبا ناروی کے ساتھی وحید خیال کے تاثرات

تھے ۔ انہیں سنجیدہ رہنے کی عادت نہیں تھی ۔ ان کے ارد گرد بچے جمع ہو جاتے اور وہ ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ۔ بچوں کو کبھی نہ ڈانٹتے اور نہ ان سے سخت لہجے میں بات ہی کرتے ۔ بلکہ نرم روی اور محبت بھرے انداز سے پیش آتے ۔ اور ان کی سطح پر اتر کر ان کے کھیلوں میں شریک ہو جاتے ۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ زیبا سائیکل پر سوار ہو کر کہیں جا رہے ہے کہ ان کے دوست اکرم شاہ صاحب نے انہیں دیکھ لیا اور ان سے کہا کہ میری کچھ اشعار اور غزلیں ہیں ان کی اصلاح کر دیجئیے ۔ زیبا سائیکل سے نیچے اتر آئے اور ان کے ساتھ پیدل چلنے لگے ، اور کہا کہ راستے میں ایک پلاٹ ہے وہاں دھوپ میں بیٹھ کر تمہارے شعر دیکھیں گے ۔ سردی کا موسم تھا ، جب وہاں پہنچے تو پلاٹ میں بڑی بڑی بھینسیں تھیں ، زیبا نے انہیں دیکھا تو کہا کہ یہاں تو ہم سے بھی بڑے بڑے شعراء بیٹھے ہوئے ہیں ۔[1]

زیبا اکثر اوقات مزاحیہ اشعار بھی کہہ لیتے تھے ۔ اس قسم کا ایک واقعہ ان کے چھوٹے بھائی سید محمد طیب نے بیان کیا ہے ۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی اور ہم اتار گلی والے مکان میں اکٹھے رہتے تھے ۔ وہاں میرا سالا اشفاق آیا کرتا تھا ۔ ہمارے ساتھ والے مکان میں ایک لڑکی زبیدہ رہتی تھی اور ہم دونوں نے اسے چھیڑنے کیلئے شرارت سے اس کا نام شبو رکھ دیا تھا ۔ ایک دن ہم زیبا صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ اشفاق نے زیبا صاحب سے کہا چچا ایک شعر لکھ دیں جس میں "شبو" کا لفظ آتا ہو ۔ انہوں نے کہا اچھا بیٹھو لکھتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے یہ شعر کہا ۔

1۔ یہ واقعہ اکرم شاہ صاحب نے بیان کیا ۔

خوش ہے میاں اشفاق ، قہقہہ مارنے لگے میاں طیب

گال زبیدہ کے یوں پھولے ہیں جیسے پھولے گل شبو [1]

مشاغل :

زیبا ناروی علی الصبح اٹھتے اور اپنے کمرے کی خود صفائی کرتے ۔ پھر صبح سے لے کر دس بجے تک مطب کا وقت ہوتا تھا ۔ اس کے بعد ان کے شاگرد یا دوسرے لوگ اپنی غزلوں کی اصلاح کرانے کے لیے آتے ۔ شام کو کسی نہ کسی ادبی محفل میں شرکت کرتے یا گھر میں کسی تقریب کا اہتمام کرتے ۔ شاعری ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا ۔ اس کے علاوہ مطالعہ کا بے حد شوق رکھتے تھے ۔ تاریخی اور اسلامی کتابیں خریدتے اور اپنی ذاتی لائبریری میں جمع کرتے ۔ پرندوں اور جانوروں سے انہیں خاص انس تھا ۔ انہوں نے گھر میں آسٹریلوی طوطے پال رکھے تھے جن کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے [2]

زیبا ناروی کے قریبی ساتھی وحید خیال صاحب نے ان کے مطالعہ کے بارے میں بتایا کہ زیبا ناروی بدلتے دور کے اشعار ، دواوین ، کتب اور رسائل وغیرہ پڑھنے کے قائل معلوم نہیں ہوتے تھے ۔ جو رسائل یا مجموعہ کلام بطور نذرانہ ڈاک سے انہیں موصول ہوتے تھے وہ مہینوں جوں کے توں پڑے رہتے تھے یا دوسرے پڑھنے کیلئے اٹھا لے جاتے تھے ۔ میرے سوال پر ایک بار فرمایا " ان کا کیا پڑھنا ، اس میں میرے کام کا کیا ہو گا " [3]

1- یہ واقعہ زیبا ناروی کے بھائی سید محمد طیب نے بیان کیا ۔

2- ابوالبشر صاحبزادہ زیبا ناروی نے یہ باتیں راقمہ کو بتائیں ۔

3- زیبا ناروی کے مقرب دوست وحید خیال صاحب کے تاثرات

نفاست پسندی :

زیبا ناروی بڑی نفاست والے انسان تھے ۔ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتے ، ہمیشہ ستھرا لباس پہنتے ۔ ان کے مزاج کی نفاست ان کے ہر کام میں جھلکتی تھی ۔ لکھتے ہوئے حاشیے کھینچ کر دلکش انداز میں اپنے خیالات کو ضابطۂ تحریر میں لاتے ۔ یہاں تک کہ اپنی کتابوں اور کاغذات کو ایک ترتیب سے رکھتے ، اور بے ترتیبی برداشت نہ کر پاتے ۔ ان کی خواہش ہوتی کہ جہاں سے کوئی چیز اٹھائی جائے ، وہیں پر رکھ دی جائے ۔ ان کی زندگی میں کوئی ان کی اشیاء کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا ۔ اگر کوئی گندا بچہ ان کے قریب آتا تو کہتے کہ چلو صاف ہو کر ، اچھے کپڑے پہن کر آؤ ۔

زیبا ناروی انتہائی خوش خط تھے ۔ 1983ء میں ایک دفعہ ہیضے کا شکار ہوئے مگر اللہ تعالی نے انہیں صحت عطا کی ۔ اس کے بعد سے ایک یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ ان کے ہاتھ لکھتے وقت لرزتے تھے جس سے تحریر میں پہلی سی خوش خطی نہ رہی ۔

(ج)

تخليقات

زیبا ناروی نے لا تعداد اشعار کہے ہیں ۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ حتی کہ زندگی کے آخری ایام تک ان کے شعر کہنے کی صلاحیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ نہ صرف یہ کہ ان کی شعری صلاحیت میں فرق نہیں آیا تھا بلکہ زور گوئی بھی پہلے کی طرح برقرار تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری سرمایا ایک کثیر تعداد پر مبنی ہے ۔

زیبا ناروی کی نگارشات 1935 ء سے 1980ء تک مختلف ادبی وغیرہ ادبی رسائل میں تو چھپتی رہیں اور وہ اکثر مشاعروں یا ادبی مجلسوں اور محفلوں میں بھی انہیں پیش کرتے رہے، لیکن کسی مجموعے کی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکیں ۔ اس کی ایک وجہ تو زیبا ناروی کی درویش طبع تھی ، جو انہیں ایسے کاموں میں دلچسپی لینے سے روکتی تھی ۔ وہ اپنے آپ کو نمود و نمائش سے بچانا چاہتے تھے ۔ دوسرے ان کی مالی استطاعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنے کلام کو منظر عام پر لا سکیں ۔ اگرچہ ان کے بعض شاگردوں اور ساتھیوں نے ان سے باوہا کہا کہ وہ اپنے دیوان مرتب کرکے انہیں دیں تاکہ وہ انہیں شائع کروا دیں ، لیکن زیبا اس معاملے میں قدرے بے نیاز ثابت ہوئے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کی موت کا وقت آ گیا اور ان کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعہ سامنے نہ آ سکا ۔

ان کی تخلیقات جن رسائل میں شائع ہوتی رہیں ، ان میں سے جو راقمہ کو دستیاب ہو سکیں، ذیل میں ان کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے ۔ جس کیلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر صنف کے آگے اس رسالے کا نام درج کیا گیا ہے جس میں وہ چھپی اور ساتھ ہی اس کا سن یا تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے ۔ غزلیات کے سلسلے میں ہر غزل کا پہلا مصرعہ تحریر کیا گیا ہے ۔

نمبر شمار	غزلیات	رسائل
1	وجہ نشاط دل غم جاناں بنا دیا	1935ء ہفتہ وار " جمیل " دہلی
2	دیکھئیے کیا کیا دکھائے انقلاب روز گار	1937ء روز نامہ " پنچ " دہلی
3	یہ مطلب ہے کہ دو دل رہ نہیں سکتے کبھی مل کے	1938ء " " "
4	طوفان بہار ارمان بہار	1940ء ہفتہ وار" برق "
5	جگر کانپ اٹھا ،لرزنے لگا دل ،نظر تھرتھرائی ،قدم ڈگمگائے	1940ء ماہنامہ " تصویر " رامپور
6	نہ کارواں ہے نہ جادۂ نہ گردش زمانہ	1942ء " رہنمائے تعلیم " دہلی
7	مرنے کی گھڑی جب آئے گی مرنے سے نہ پیچھا چھوٹے گا	1945ء رہنمائے تعلیم
8	نہ شوق میں ہے ،نہ ذوق میں ہے ،نہ سوز میں ،نہ ساز میں ہے	1945ء ماہ نامہ " مشہور " دہلی
9	پرشوق نگاہیں رک نہ سکیں ہر بند سے رشتے	1945ء رہنمائے تعلیم
10	توبہ کو ہم بھی گھونٹ کے ساغر میں پئیں گے	1946ء صدائے دنیا
11	گئی گزری حیات کتنی تھی	1946ء ماہنامہ "پریم " جموں و کشمیر
12	سوز غم سے کچھ نہ کچھ ہر آدمی جلتا رہا	1946ء رہنمائے تعلیم
13	آج ایک نغمہ بیدار سنائی تو دیا	1946ء ماہنامہ " تصویر"
14	ہماری عمر گھٹتی جا رہی ہے	1946ء رہنمائے تعلیم
15	سورج کی کرن جو مسکرائی	1947ء ماہنامہ "عالمگیر "
16	رنج و غم دنیا میں ہم کو لائے تھے	1947ء " رہنمائے تعلیم " لاہور
17	قاتل کا تصور آتے ہی دل تھام کے بسمل بیٹھ گیا	1947ء "نیرنگ خیال " لاہور

18	وہ مقتل میں آکر ہمیں آزمائیں ، بنے تیغ محراب ، سرہم جھکائیں	1948ء	" رہنمائے تعلیم " دھلی
19	غم ناروائے ستم کیا کوئی شوق ہو مجھے شاق ہے	1948ء	" ماھنامہ " استقلال
20	ایسی ابجد میں لکھا ہے خط پیمانہ دل	1950ء	" شاہکار " لاہور
21	جی خاک لگے مے خانے میں وہ ساقی و مئے آشام نہیں	1950ء	ماھنامہ "احسن " رامپور
22	غم تمام کا عالم ہمارے کام آیا	1950ء	" " "
23	یہ اک اک نے جانا یہ اک اک نے مانا یہ تسلیم کرتا ہے سارا زمانہ	1950ء	" رہنمائے تعلیم
24	نہ شوق گل ہے نہ آزردہ نوک خار سے ہم	1951ء	رہنمائے تعلیم " دھلی
25	حاصل کا تماشہ غم حاصل کا تماشہ	1953ء	" فلم لائٹ " لاہور
26	دیکھا ہی تھا انہیں کہ مری آنکھ آ گئی	1953ء	" نگارستان " کراچی
27	جہاں کہیں کوئی دیوانہ اشک بار نہیں	1953ء	فلم لائٹ
28	زباں ملی نہ انہیں عرض آرزو کیلئے	1953ء	" "
29	کہاں سر پھوڑتے ، دل اپنا بہلانے کہاں جاتے	1956ء	" آواز " پندرہ روزہ
30	میکدہ میں دل لگی جو کچھ رہی دیکھا کئے	1956ء	" "
31	یہ حسن اتفاق کہ ان سے ملا تھا میں	1973ء	" بزم اردو ادب " اٹک
32	رویا کیے مگر نہیں بولے کسی سے ہم	1974ء	ماھنامہ "عکس نو"
33	عہد گل میں جو بڑھا جوش تو پھر کیا ہو گا	1984ء	" گلشن " مرتبہ ریاض احمد

ان غزلیات کے علاوہ ان کی بے شمار نظمیں ،قطعات ، سلام ، مرثیے اور رباعیات بھی رسائل میں چھپتی رہیں ، لیکن ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے ۔ آپ کے شاگرد پروفیسر آغا مسعود رضا خاکی نے ان

کے کلام کو "کلیات زیبا" کے نام سے ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کیا اور اس کی دو کاپیاں کرا کے ایک زیبا کو اور دوسری پنجاب پبلک لائبریری کو دے دی تاکہ وقت کا محقق اس کلام سے استفادہ کر سکے ۔ وہ اسے کتابی صورت میں شائع کروانا چاہتے تھے، لیکن افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ زیبا ناروی کے بعد جلد ہی وفات پا گئے ۔ اب ان کے دیوان کو زیبا ناروی کے ایک اور شاگرد پیر نصیر الدین شاہ چھپوانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

غیر مطبوعہ کلیات کی تفصیل یوں ہے ۔ اس مجموعے میں پانچ دیوان شامل ہیں ۔

دیوان اول ۔ 123 صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں کل 112 غزلیں ہیں اور الف بائی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

دیوان دوم ۔ یہ دیوان 58 صفحات اور 44 غزلوں پر مبنی ہے اور اس میں الف بائی ترتیب سے کام نہیں لیا گیا ۔

دیوان سوم ۔ اس دیوان میں 31 صفحات اور 15 غزلیں ہیں ۔ ایک طرح بند خمسہ بسلسلہ جشن ولادت حضرت علی کرم اللہ وجہ کے علاوہ دو قطعات ، دو سلام ، ایک منقبت ، ایک سہرا اور ایک مسدس بند بھی شامل ہیں ۔ اس دیوان میں بھی الف بائی ترتیب نہیں ہے ۔

دیوان چہارم ۔ یہ دیوان 66 صفحات پر مشتمل ہے ۔ جن میں سے ایک مسالمہ ، پچیس غزلیں ، دو رباعیات ، ایک نظم ، ایک خمسہ دو سلام ، ایک خمسہ دو سلام ، دو خمسہ بر سلام اور ایک مسدس ٹیپو سلطان شہید سے متعلق ہے ۔ اس دیوان میں بھی الف بائی ترتیب سے کام نہیں لیا گیا ۔

دیوان پنجم ۔ اس دیوان میں 1947ء کے بعد سے کہی گئی غزلیں اور کلام شامل ہے ۔ اس میں 19 صفحات ہیں ۔ جن میں 5 غزلیں ایک خمسہ شامل ہے ۔ اس کے علاوہ تاریخی قطعات اور

الم افزا قطعات تاریخ بھی شامل ھیں ۔ یہاں بھی الف بائی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ۔

اس کلیات کے علاوہ بھی زیبا کی بے شمار غزلیں ھیں جو کسی مجموعے کی صورت میں نہیں ڈھل سکیں ، اور ابھی تک بے ترتیبی سے بکھری پڑی ھیں ۔ ان کی تعداد کئی سو تک پہنچ سکتی ھے۔

باب دوم

زیبا ساروی بحیثیت غزل گو

(الف) اردو غزل اور داغ کا دبستان غزل

(ب) زیبا ساروی کی غزل گوئی

غـزل اردو اور فارسی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے ۔ ان زبانوں کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ غزل پر مشتمل ہے ۔ ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدے سے ہوئی جن میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر عشقیہ اشعار کہتے تھے اسے " نسیب " یا " تشبیب " کہا جاتا تھا ، لیکن رفتہ رفتہ حسن و شباب کے تـذکرے کے ساتھ وار دات و احساسات قلب کا ذکر بھی اس میں شامل ہو گیا اور زبان میں لطافت آتی گئی تو تشبیب نے غزل کا نام پایا ۔

جس وقت اردو غـزل نے جنم لیا ہندوستان میں فارسی ادب کا دور دورہ تھا ۔ اسی لیے اردو اور فارسی ادب کی ذہنی فضا شروع ہی سے ایک رہی ۔ اس کا ایک اثر غزل کی ہیت کو اپنانے کی صورت میں ہوا ۔ غزل ایشیائی ذہن و فکر سے قریب تر ہے ۔ اس کا ہر شعر اپنے طور پر ایک انـفرادی حیثیت رکھتا ہے اور خیال کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے ۔ نوعیت مضامین کے اعتبار سے اردو غزل میں ادبی روایت پرستی کے تحت ابتدا ہی سے فارسی کی تـقلید میں وہی مضامین باندھے گئے جو فارسی شعراء مدتوں سے باندھتے چلے آئے تھے ، یعنی گل و بلبل کا معاملہ ، شمع و پروانے کا قصہ ، عشق و محبت کے غم اور خوشیاں ، تـقدیر کی نیرنگیاں اور زمانے کی ناقدر شناسی وغیرہ ۔ لیکن وقت اور زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ غزل صرف عشقیہ جذبات و ذاتی احساسات تک محدود نہ رہی بلکہ سیاسی ، سماجی ، معاشرتی اور آفاقی و کائناتی موضوعات بھی اس میں شامل ہوتے چلے گئے ، اور یوں موضوعاتی طور پر غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ۔

غزل کے متـعلق اظہار خیال کرتے ہوئے " فراق گورکھپوری " لکھتے ہیں :

" غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے ۔ یعنی حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں ۔ تاثرات

کی انہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات و محسوسات بن جانا اور

مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا

اسی کا نام غزل ہے ۔ اس طرح ان انتہاؤں کو دوام نصیب ہو جاتا ہے

اور غزل کا نغمہ نغمہ سرمدی بن جاتا ہے " ۔[1]

صنف غزل کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ زندگی کے متنوع پہلوؤں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال کر اور ایسے رنگ میں رنگ کر پیش کرتی ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اگر تمام فنون لطیفہ حیات و کائنات کے احساس کا عطر ہیں تو غزل کو اس عطر کا بھی نچوڑ کہا جا سکتا ہے ۔ ہماری زندگی میں غزل کے بڑے گہرے اور ہمہ گیر اثرات ہیں اس نے ہماری زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی ہے اور اسی کے باعث زندگی نے بھی غزل کو حسن بخشا ہے ۔

نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں :

" شاعری اگر بقول جانسن مترنم خیالات کا اظہار ہے تو غزل سے بہتر کوئی ہیئت اس شعری جذبے کے اظہار کیلئے ایجاد نہیں ہوئی ۔ کیونکہ قوافی کی کثرت ، مصرعوں میں بحر کی یکسانی ، قافیوں کی تکرار ، آخر میں ردیف کی وجہ سے صوتی ہم آہنگی یہ سب مل کر غزل کی ساخت میں خود ہی تال و سر ، نغمہ و صوت کی خوش آہنگی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ غزل کی بڑی خوبی اور خصوصیت ہے" ۔[2]

غزل بنیادی طور پر ایک انفرادی فنکارانہ عمل ہے لیکن اس کے جذبات کی عمومیت مسلم

1۔ غزل کی ماہیت و ہیئت نگار اصناف شاعری ، ص 11

2۔ غزل کا نیا رنگ ترنم ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی "نگار" اصناف شاعری نمبر ص 49

ہے کیونکہ یہ عمومیت سرشت انسانی کی وحدت اور جبلتوں کی یکسانی پر مبنی ہے ، اور یہ عمومیت ماضی ، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا احاطہ کرتی ہے ۔

اردو میں غزل فارسی سے آئی ۔ لہذا اس کے ساتھ ایرانی تلمیحات ، فارسی الفاظ تراکیب تشبیہات و استعارات کا خزانہ بھی اردو میں داخل ہوا ۔ اردو میں دکن بلکہ اس سے پہلے بھی غزل کا سراغ ملتا ہے ۔

اگر ہم اردو میں سب سے پہلے غزل گو شاعر کی نشاندھی کرنا چاہیں تو وثوق اور یقین کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے ۔ البتہ غزنوی دور کے ایک شاعر مسعود سعد سلمان کا حوالہ امیر خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ " او راسہ دیوان است ۔ یکے بہ تازی ، یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی ۔" لیکن ہندوی یا اردو میں اس کا کلام دستیاب نہیں ہے ۔ لہذا اس بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے کہ اس نے غزل بھی لکھی ۔ البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دیوان میں غزل بھی ہو گی ۔ اس کے بعد پہلے قابل ذکر غزل گو کی حیثیت سے امیر خسرو کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے اردو اور فارسی کے ملاپ سے خوبصورت غزلیں کہیں ، مثلاً

شبان ہجراں دراز ازچوں زلف و روز وصلش چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو میں کیسے دیکھوں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
زحال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاوں پیا کے کھتیاں

اس کے بعد دکن کی بہمنی سلطنت میں حسن شوقی ایک غزل گو کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی غزلیں ابتدائی روایت اور رنگ و روپ کا حصہ ہیں ۔ ان کی غزل خیال اسلوب اور لب و لہجے میں فارسی غزل کی پیروی کرتی ہے ۔ ابتدائی حالت کے باوجود ان کی غزل میں مٹھاس اور شیرینی کی صفت موجود ہے ۔

شوقی شکر غزل کی کھنڈیاں سوں بانٹتا ہے
طوطی طبع کوں میرے یک من شکر نہ بھیجا

حسن شوقی نے فارسی غزل کے اتباع میں سوز و ساز کو اردو غزل کے مزاج میں داخل کیا اور اسے ایک ایسا روپ دیا جس سے نہ صرف ان کے ہم عصر متاثر ہوئے بلکہ بعد میں آنے والے شعراء بھی اس روایت پر چلتے رہے ۔

ان کی غزل میں عشق مجازی کا اظہار مختلف انداز سے ہوتا ہے ۔ ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ ابتدائی نقوش ہیں جو اردو غزل کی روایت میں حسن شوقی کو اہم مقام عطا کرتے ہیں ۔

اگر عشق حقیقی میں نہیں صادق ہوا شوقی
ولے مقصود خود حاصل کیا ہے عشق مجازی میں

بن گل کیا ہے بلبل اور گل بدن کہاں ہے
جن من ہریا ہمارا سو من ہرن کہاں ہے

خوباں کی انجمن میں لالن ہوئے ہیں ساقی
نرمل شراب تنہا یک جام بھر نہ بھیجا

اگر ترتیب زمانی کے ساتھ بہمنی دور سے لے کر عادل شاہی و قطب شاہی دور تک کی غزلوں کی روایت کا سراغ لگایا جائے تو غزل کی ایک باقاعدہ روایت بنتی ، سنورتی اور پھیلتی نظر آتی ہے - شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے غزل نہ کہی ہو - مولانا " نصرتی " کی غزل بھی دکن کی اسی روایت کا ایک حصہ ہے - ان کی غزل میں بیجا پوری اسلوب کا رنگ غالب ہے جو ان کی غزل میں اپنے کمال کو پہنچتا ہے - دکنی غزل کے مزاج کے مطابق نصرتی کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے - انہوں نے اپنی غزل میں عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے - نصرتی نے زبان و بیان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس تک دکنی شاعری اب تک نہیں پہنچی تھی - دوسرے اس نے اپنی شاعری میں ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا - ہاشمی کے ہاں یہ دونوں اثرات نظر آتے ہیں - ایاغی بھی اس دور کا اہم شاعر ہے جس کے ہاں درویشانہ مزاج اور زبان و بیان کی سادگی اپنا رنگ دکھاتی ہے -

قطب شاہی دور میں غزل ایک اہم اور مقبول صنف سخن کے طور پر ابھری - محمد قلی قطب شاہ کے ہاں بھی غزل ہی بنیادی درجہ رکھتی ہے - محمد قلی ایک پر گو اور اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے - اس نے اپنی شاعری کو صرف مخصوص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی کے دوسرے معاملات کو بھی موضوع بنایا - اس کے نزدیک شاعری کا محرک صرف عشق ہے - اور غزل سے اس کی دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے - دیگر باتیں جذبہ عشق سے ہی پیدا ہوتی ہیں -

عشق سوں بولیا غزل حضرت بنی صدقے قطب
صافی کے اوصاف میں کسے صوفی کی مشرب منجے
شعر معانی ان بندے موتی ہیں جگ میں حسن کے
ہر دُرے صدف موتی جھالپ وار تیرے نام پر

ایک غزل میں وہ اپنے عشق کی تعبیر یوں کرتا ہے -

میرے مذھب کی باتاں کھول کراب کیا پوچھنگے کو
ھمیں جانسے و مذھب اے رقیباں کیا غرض تم کو
پھولوں کس شاخ پر بیٹھا ھے بھنورا نیہہ سے جھلتا
بھرے کا شہد سوں اب تو ھمن اللہ جیو کا جو

اپنی غزلوں میں وہ فارسی شاعری کے زیر اثر روایت کے بہت قریب آ جاتا ھے ۔ " عبداللہ قطب شاہ " کی غزلیں بھی اسی اسلوب میں ھیں البتہ اس کی زبان محمد قلی کے مقابلے میں زیادہ صاف ھو گئی ھے ۔ ان ابتدائی کوششوں نے غزل کی ترقی کیلئے ایک فضا ضرور ھموار کر دی ۔

برصغیر میں ولی دکنی نے غزل کو منفرد لہجہ عطا کیا اور غزل میں ھندوستانی ماحول کو جگہ دی ۔ دکن میں غزل کی ترقی کا زمانہ ولی اور سراج کا زمانہ ھے ۔ ولی نے اپنے آپ کو دکن تک محدود نہیں رکھا بلکہ دلی کا سفر بھی کیا اور اس طرح وہ تمام روایات یہاں منتقل ھو گئیں ۔ وہ شیخ سعداللہ گلشن سے ملے جو اس زمانے کے بڑے صوفی بزرگ تھے ۔ انہوں نےولی کو مشورہ دیا کہ تم فارسی مضامین کو اردو شاعری میں منتقل کر دو تو تم سے کون محاسبہ کرے گا ۔ ولی نے ان کے مشورے کے مطابق اپنےآپ کو بدل ڈالا اور اپنی شاعری کو موضوعات اور طرز اظہار کے اعتبار سے ایک نئی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی ۔ ولی نے جب دکن کی ادبی روایت کو فارسی روایت سے ھم آھنگ کیا تو تمام لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے ۔

ولی نے اردو غزل کو صحیح روایا ت سے آشنا کیا ۔ انہوں نے روایت کے بہترین اجزا کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا اور ساتھ ھی اسے نئے امکانات سے بھی متعارف کرایا ۔ اسی وجہ سے ولی

کے یہاں فارسی اثرات ہندی کے ساتھ ملے جلے نظر آتے ہیں ۔ اسی آمیزش نے ان کے ہاں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کی ہے ۔ ان کی غزل میں فارسی مضامین کے شامل ہونے سے زبان و بیان میں بھی فارسی کا اثر پیدا ہو گیا ۔ اس طرح انہوں نے اردو کو فارسی کے مد مقابل لا کھڑا کر دیا ۔ بقول آزاد :

" ولی نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہندی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں تمام بحریں فارسی کی اردو میں لائے ۔ شعر کو غزل اور قافیے کو ردیف سے سجایا ۔ ردیف وار دیوان بنایا ـــــ اردو زبان اس وقت سوائے ہندی دوہرں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی ۔ انہوں نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو داخل کیا ۔

یہ ولی کا بہت بڑا کارنامہ تھا ۔ اس سے غزل کی روایت کو سمجھنے میں مدد مل گئی ۔

ولی ایک صوفی اور صاف باطن آدمی تھے ۔ تصوف ان کی گھٹی میں پڑا تھا ۔ انہوں نے تصوف کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے اپنے شعور سے بھی کام لیا ہے ، اور زندگی و کائنات کے اہم مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے ۔ جس سے اردو غزل ایک نئی لے سے آشنا ہوئی ۔ چند اشعار دیکھئیے۔

مسند گل منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نہیں دیکھتا سرج کی جھلکار کا تماشا

کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف

بس ہے مواحداں کوں منصور کا تماشا

ہوا ہے مجھ پہ شمع بزم یک رنگی سوں یو روشن

کہ ہر ذرے اپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا

کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ولی اگرچہ صوفی تھے لیکن انہوں نے اپنی غزل میں عشق مجازی کی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں ۔

" ولی نے انسانی حسن کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے ۔ وہ اس کی ایک ایک بات کو دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں ۔ اور ان کا یہ تاثر اکثر و بیشتر عشق کی سرحدوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ ان کی غزلوں میں خارجی حسن کی کیفیت کا بیان بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان آفاقی واردات و کیفیات کی ترجمانی بھی ہے ۔ جن کو عشق ہی پیدا کر سکتا ہے ۔ ولی کے عشق میں سپردگی ہے لیکن اس سپردگی میں انتہا پسندی ان کے یہاں رونما نہیں ہوتی ۔ اسی لیے سوز و گداز تو ان کی غزلوں میں پیدا ہو جاتا ہے لیکن قنوطیت سے وہ دامن بچائے رکھتے ہیں "۔[1]

ولی نے عشق و محبت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک تو منفرد چیز ہے دوسرے اس میں ایک

1۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر " غزل اور مطالعہ غزل " انجمن ترقی اردو کراچی 1955ء ، ص 220

عام انسان کا تجربہ دکھائی دیتا ہے ۔

خوب رو خوب کام کرتے ہیں

یک نگہ سے غلام کرتے ہیں

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا

ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نئیں دل ہے مرا واقف

اے ناز بھری چنچل ٹک بھاو بتاتی جا

ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی

مرے گھر میں یوں آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے

ان موضوعات کو پیش کرنے سے ولی کو اولیت کا رتبہ حاصل ہوا ۔ انہوں نے غزل کو نیا انداز دیا ۔ جس میں شستگی اور صفائی نظر آتی ہے ۔ اور اسی انداز نے اردو غزل کو نئی زندگی عطا کی ۔

سراج اورنگ آبادی ولی کے بعد اور میر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصے کے سب سے بڑے شاعر ہیں جن کی پر گوئی اور رنگ سخن کو کوئی دوسرا نہیں پہنچتا ۔انہوں نے ولی کی روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ۔ سراج نے تصوف کے مضامین کو عشقیہ رنگ میں بیان کیا جس سے اردو غزل میں نیا رنگ پیدا ہوا ۔ ان کی غزلوں میں کیف و مستی کی کیفیت دکھائی دیتی ہے ۔

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں

کہاں سراج کہاں آفتاب عالم تاب ۔

اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے گا

ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی

نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب وہ لباس برہنگی

نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

✓ دوسری طرف اس زمانے میں فارسی شاعری ، جو ہندوستان میں زوال پذیر تھی - اس میں ایہام گوئی کا زور تھا -چنانچہ اردو شاعری کا پہلا دور جو دلی میں آتا ہے، وہ ایہام گوئی کا ہے- ایہام کی صنف اگر غیر شعوری طور پر شعر میں آ جائے تو شعر کا لطف بڑھا دیتی ہے لیکن جب عمداً اس صنعت کو مدنظر رکھا جائے تو باتصنوعی ہو جاتی ہے - ایہام گوئی کیلئے ذخیرہ الفاظ پر دسترس ہونا ضروری ہے - اس دور میں جن شاعروں نے ایہام گوئی کا انداز اختیار کیا ان میں شاہ مبارک آبرو شرف الدین مضمون ، شاہ حاتم ، احسن اللہ شاکر ناجی اور مصطفی خاں یک رنگ کے نام اہم ہیں - محمد شاہی دور کے ابتدائی حصے میں اردو غزل انہی شعراء کے ہاتھ میں رہی -

حاتم ان سب شعراء میں اہم شاعر ہیں - انہوں نے ابتدا میں ایہام گوئی کی لیکن ایک زمانے میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایہام کو ترک کر دیا بلکہ اپنے ضخیم دیوان کا انتخاب کیا اور اس کا نام " دیوان زادہ " رکھا -

آبرو اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں اور ایہام گوئی کے سر خیل کہلاتے ہیں - حسن و عشق کے معاملات کو انہوں نے بڑی خوبی سے اپنی غزلوں میں سمویا ہے - ہندی الفاظ کے استعمال سے کلام کو شگفتہ بنایا ہے -

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں

جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے

وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی

اس دل بے قرار کی صورت

دم خاموش بیٹھ رہتا ہوں

اس طرح حال دل کہتا ہوں

خان آرزو کا رنگ ان اشعار سے نمایاں ہوتا ہے ۔

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل

ہاتھ بھی دکھ گئے دامن تیرا دھوتے دھوتے

بن دیکھے جس کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہیں

کیا قہر ہے کہ اس سے برسوں جدائیاں ہیں

ان سب شعراء نے اردو زبان کی شیرینی اور گھلاوٹ کا بڑا خیال رکھا اور اس اعتبار سے اردو غزل کو نئی ڈگر پر ڈال دیا ۔

ایہام گوئی کے خلاف رد عمل اس کے عہد شباب ہی میں شروع ہو گیا تھا ۔ حاتم نے اس کی ابتدا کی تھی ۔ بہت سے شاعر جو اس زمانے میں منظر عام پر آتے ہیں ان شاعروں میں مظہر

جان جاناں ، خواجہ میر درد ، میر تقی میر اور مرزا سودا خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان سب نے اردو غزل کو مضامین اور زبان کے لحاظ سے اس حد تک نکھارا کہ وہ فارسی غزل سے کسی طور پیچھے نہ رہی ۔ غزل کیلئے جس سوز و گداز کو ضروری قرار دیا گیا ہے وہ اس دور کی غزل کا نمایاں وصف رہا ۔ زندگی کے شدید احساس اور حالات سے مطابقت نے اس دور کے غزل گو شعراء کے یہاں حقیقت و واقعیت کے خیالات بھی عام کیے اور انہوں نے جو کچھ محسوس کیا ، اسی کی ترجمانی کی ۔ اسی لیے اس دور کی غزل میں تکلف اور تصنع نام کو بھی نہیں ہے۔ میر تقی میر اس دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں ۔ انہوں نے عشق و عاشقی کی مختلف کیفیات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ تصوف اور اس کے مختلف مسائل کو بھی اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ۔ انہوں نے اردو غزل کو زندگی سے قریب کیا اور اس میں خلوص اور سچائی کے عناصر کو جگہ دی ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزہ جانا

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

آوار گان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

نا حق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بد نام کیا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

آزاد میر تقی میر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میر صاحب کی زبان شستہ ، کلام صاف ، بیان پاکیزہ ، جیسے باتیں کرتے ہیں ۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں ، محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں ۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے ۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ دلوں میں اثر بھی کرتی ہیں ۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں"۔[1]

سودا کا انداز میر سے مختلف ہے ۔ ان کی غزلوں میں میر کا سا سوز اور گہرائی نہیں لیکن ایک بلند پروازی اور ہمہ گیری ضرور موجود ہے ۔ ان کے ہاں زندگی کے مختلف موضوعات اور تنوع کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ صرف ہجر و فراق یا مایوسی اور ناکامی ہی کو نہیں بیان کرتے بلکہ زندگی سے

1۔ آزاد ، " آب حیات " ، ص 212

لطف بھی اٹھاتے ھیں ۔ وہ ایک ظریف اور طبع انسان تھے ۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ھے سودا
ساغر کو مرے ھاتھ سے لینا کہ چلا میں

مستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر
دنیا تمام بزم خرابات ھو گئی

کہتے تھے ھم نہ دیکھ سکیں روز ھجر کو
پر جو خدا دکھائے سو نا چار دیکھنا

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ھوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ھے کہ نہیں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ھے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

سودا نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو غزل میں ایک نیا انداز پیدا کیا ھے اور اس کی ترقی میں مدد کی ھے ۔

درد نے اس دور میں اردو غزل کو تصوف کے مسائل سے آشنا کیا ھے ۔ اس موضوع پر جس کامیابی سے درد نے اظہار خیال کیا ھے ، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہ آ سکا ۔ ان کی غزلیں شدت احساس کی حامل ھیں اس لیے ان کا ھر خیال حقیقت و واقعیت سے ھم آھنگ معلوم ھوتا ھے۔ ان کے ھاں تنوع ھمیشہ تغزل کے ساتھ وابستہ رھتا ھے ۔

شخص و عکس اس آئینے میں جلوہ فرما ہو گئے
ان نے دیکھا اپنے تئیں ہم اس میں پیدا ہو گئے

ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل
جسم و جاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

جمع ہیں افراد عالم ایک ہیں
گل کے سب اوراق برہم ایک ہیں

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر ، ظاہر ظہور تیرا

میر، سودا اور درد اس زمانے کی غزل کے اہم ستون ہیں ۔ ان کے اثرات اس دور کے دوسرے شعراء پر بھی نمایاں نظر آتے ہیں ۔ جن میں مرزا مظہر جان جاناں، میر سوز اور فغاں وغیرہ شامل ہیں ۔

اس کے بعد شعراء سیاسی حالات سے مجبور ہو کر دھلی سے ھجرت کر رھے تھے اور اب دھلی میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں رہ گیا تھا ۔ یوں تو بے شمار شعراء تھے لیکن اب لکھنؤ کس محفل آراستہ ہو رھی تھی ۔ اس محفل میں اکثر غزل گو شعراء ایسے تھے جو دلی سے آ کر لکھنو میں آباد ھوئے تھے ۔ اس لیے غزل کے دھلوی انداز کی خصوصیات کسی نہ کسی حد تک ان کے مزاج میں موجود تھیں ۔ یہی سبب ھے کہ دبستان دلی کی غزل کا رنگ جگہ جگہ ان کی غزلوں میں اپنی جھلک دکھاتا ھے ۔ دراصل لکھنو میں ابھی تک اپنا کوئی مخصوص اور منفرد انداز پیدا نہیں ھوا تھا ، اور یہاں شاعری کی شمع دلی والوں کے ھاتھوں روشن ھوئی ۔ میر ، سودا ، مصحفی ، میر حسن ، جرأت ، انشاء ، رنگین سب کا تعلق دلی سے تھا ، لیکن لکھنو میں حالات دلی سے مختلف تھے اس لیے خود دلی کے کئی شاعر دبستان دلی کی قائم کی ھوئی روایت کو خیرباد کہنے کیلئے مجبور ھو گئے ۔ وقت کے ساتھساتھ انشاء اور رنگین کا انداز زیادہ مقبول ھوتا گیا اور انہی کے انداز کو سامنے رکھ کر لکھنو کے منفرد اور مخصوص انداز کی تشکیل کی گئی ۔ یہ انداز شاعری کے دھلوی انداز سے بالکل ھی مختلف تھا ۔ اور اس رجحان کے پھیلنے کی اصل وجہ یہ ھوئی کہ دربار کی سرپرستی ، ایک محدود طبقے کی خوشحالی ، شعراء کی قدر و منزلت اور فنون لطیفہ کی مقبولیت نے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیا ۔ اس ذھنیت نے مصحفی ، انشاء اور جرأت کے رنگ کو بدل دیا اور ناسخ و آتش کی شاعری کو رواج دیا ۔

لکھنو کے دبستان میں تصنع اور بناوٹ کو جگہ دی گئی ھے ۔ شعر کی جذباتی اور حسی روح اس میں بہت تلاش اورجستجو کے بعد ملتی ھے ۔ جذبے اور خلوص کو زیادہ اھمیت نہیں دی گئی ، شاعری کو مرصع سازی اور صنعت گری کا کھیل سمجھ لیا گیا ھے ۔ مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ھے ۔

انشاء ، رنگین اور جرأت نے جس اسلوب کو ریختی اور معاملہ بندی سے مزین کیا تھا ان کے معاصرین نے اس میں بہت حد تک خرابیاں پیدا کر دیں ۔ زبان کی صحت اور روانی بے شک ان کی غزلوں میں ملتی ہے، محاورے کا استعمال بھی لطف انگیز ہے لیکن مجموعی طور پر جذب و اثر کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ۔ آتش واحد شاعر تھے جنھوں نے اپنی سلاست روی اور متوازن ذہنی و جذباتی کیفیت ، واردات قلبی ، تصوف کی لاگ اور زندگی کے دیگر مسائل کو نظر انداز نہ کرکے لکھنو کے شاعروں میں اپنا مرتبہ بلند کر لیا ۔

حسن پری اک جلوہ مستانہ ہے اس کا
ھشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی ، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

آتش و ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے اردو شاعری کو اس کے معیار سے بالکل ہی گرا دیا اور اب تک زبان میں جو شیرینی اور گھلاوٹ تھی ، اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کی جگہ بوجھل زبان نے لے لی ۔ سنگلاخ زمینوں اور بھاری بھرکم الفاظ اور تراکیب کا استعمال رواج پا گیا ۔ اسی زمانے میں دلی کی خاک سے ایسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے غزل کیلئے مسیحائی کا کام کیا ۔ غالب ، مومن ، شیفتہ ، ذوق اور بہادر شاہ ظفر اسی زمانے کے چشم و چراغ ہیں ۔ ان سب نے مل کر اردو غزل کو اس کے پہلے معیار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور اس طرح اس زمانے میں غزل کی روایت میں

نہ صرف از سر نو جان ڈالی گئی بلکہ اس کو کچھ ایسی راہوں سے روشناس بھی کیا گیا جن پر گامزن ہو کر وہ نئی منزلوں سے آشنا ہوئی ۔

غالب اس زمانے کے سب سے عمدہ شاعر ہیں اور اس دور کی روح ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بے نقاب نظر آتی ہے ۔ غالب کی غزلوں میں حسن و عشق بھی ہے، تصوف اور فلسفہ بھی، سماجی حالات کی ترجمانی بھی ہے اور تہذیبی معاملات کی عکاسی بھی ۔ لیکن ان تمام موضوعات کو غالب نے ایک نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا ، غم روز گار ہوتا

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

مومن کے ہاں صرف حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہے، لیکن ان کیفیات میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے ۔ ان کے ہاں واقعیت اور حقیقت پسندی کا بیان ہے ۔ محبوب کی رنگینیوں ، رعنائیوں سرمستیوں کا ذکر ہے ۔ لیکن ان کی غزلوں کی فضا میں ایک توازن اور ہم آہنگی ہے ۔

دیدہ حیراں نے تماشا کیا

دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا

کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

غالب اور مومن نے اردو غزل کی روایت کو نئے راستوں سے ہمکنار کیا جس کے باعث اس میں تیزی اور جولانی پیدا ہوئی ۔ اس صورتحال کو پیدا کرنے میں ان کے ماحول کا بڑا حصہ تھا ۔ ذوق اور ظفر ان سے مختلف تھے ۔ اگرچہ ان کے ہاں لکھنو ہی کا سا انداز نہیں لیکن انھوں نے انداز بیان اور طرز اظہار کی طرف خصوصی توجہ دی جو ان کی انفرادیت کا باعث بن گئی۔

ذوق نے تصوف کے علاوہ حسن و عشق کے مضامین کو بھی اپنی غزل میں جگہ دی ہے ۔ گو ان میں زیادہ گہرائی نہیں کیونکہ انھیں مضمون آفرینی کا خیال رہتا ہے۔ لیکن ان موضوعات کو پیش کرنے میں انھوں نے زبان کی خوبی کی طرف خصوصی توجہ دی ہے ۔ جس کے نتیجے میں ان کی غزل میں روانی اور ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ محاورات اور رعایت لفظی کے استعمال میں مہارت رکھتے ہیں اسی لیے ان کا کلام بقول آزاد۔

" تازگی مضمون ، صفائی کلام ، چستی ترکیب ، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے"۔

دشمن جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہو گیا

ہائے تاثیر محبت یہ ستم کیا ہو گیا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار
پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا

جو تھے مژگان پر خوں سب وہ خار دل نشیں نکلے
جنوں پہ کیسے نشتر تھے، کہیں ڈوبے کہیں نکلے

سنا کرتے تھے شہرۂ ذوق جن کی پارسائی کا
وہ سب یار خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

جو کہو گے تم ، کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی
آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

ذوق بنیادی طور پر قصیدے کے شاعر ہیں ۔ اس لیے جو خوبیاں قصیدے میں ہوتی ہیں وہ ان کی غزل میں بھی جھلکتی ہیں ۔ زبان و بیان پر انہیں دسترس حاصل ہے اور ان کی اسی خصوصیت نے اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے ۔ دھلوی اور لکھنوی شعراء نے رامپور سے وابستہ ہونے کے بعد ایک دوسرے کے انداز اور رنگ کو اپنا لیا ۔ بعض دھلوی شعراء نے اپنے کلام میں لکھنوی رنگ کی جھلک پیدا کر لی ، جن کی نمائندگی داغ کرتے ہیں ۔ داغ نے ذوق ، غالب ، مومن اور ظفر کے ماحول میں آنکھ کھولی ، لیکن حالات نے انہیں ایک دوسرا رنگ اختیار کرنے کیلئے مجبور کیا ۔

حالی اور اکبر وغیرہ نے غزل کا رنگ ڈھنگ بدل دیا لیکن اس دور میں داغ و امیر جیسے شعرا نے غزل کے روایتی ذائقے کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے بانکپن میں اضافہ کیا ۔ حسرت موہانی ، جگر مراد آبادی اور اصغر گونڈوی ، عزیز لکھنوی بھی ایسے ہی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ان میں داغ اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت اپنے تلامذہ کی طویل فہرست کے باعث ایک دبستان کا درجہ اختیار کر گئی ۔

اس زمانے کے سب سے بڑے غزل گو شاعر داغ ہیں ۔ داغ کی نشوونما دلی میں ہوئی ۔ انہوں نے غالب ، مومن ، ذوق اور ظفر کے ماحول کو دیکھا اور کسی حد تک ان سے متاثر بھی ہوئے ۔ انہوں نے عشقیہ تصورات و معاملات میں غالب کے اثرات قبول کیے اور زبان کی سلاست اور صفائی ذوق سے حاصل کی ۔ اسی طرح داغ موضوع کے لحاظ سے جرات اور مومن کے قریب پہنچ گئے ۔ وہ معاملہ بندی کے شاعر ہیں ۔ ان کے عشقیہ کلام میں شوخیاں اور بجلیاں بھری ہوئی ہیں ۔ فراق گورکھپوری نے داغ کو چٹکلے باز شاعر کہا ہے ۔

انہوں نے مختلف شعراء سے اثرات لیے اور انہیں اپنے مزاج میں سمو کر ایک نیا رنگ تخلیق کیا ۔ جس میں ان کے تصور عشق نے نمایاں حصہ لیا ہے ۔ ان کی غزل میں عشق کا کلاسیکی رنگ ہی ملتا ہے لیکن وہ اس سلسلے میں مزید آگے بڑھے ہیں ۔ اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرنے کیلئے انہوں نے جو انداز اپنایا ہے ، وہ ان میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے ۔

محمد حسن جلال لکھنوی لکھتے ہیں ۔

" داغ کی شاعری غزل کی حدود کا شاہد و شراب سے احاطہ کرنا چاہتی ہے ۔ انہوں نے شاعری کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو لیا اور ایسی چابکدستی اور فنکاری سے ان سب پہلوؤں

کی تصویر کھنچی ہے کہ لوگ تڑپ اٹھے ۔ مگر ان کا رقبہ تحریر محدود و مختصر ہے ، اور ان کا نظریہ ایک شوخ اور لا ابالی نوجوان کے جوش کا پروردہ ہے ۔ داغ کی شاعری زلف و لب و رخسار میں گم ہو جاتی ہے "۔

داغ کی شاعری کی اہم خصوصیات میں معاملات عشق کا بیان ، معاملہ بندی اور زبان و بیان شامل ہیں ۔ ان کے اشعار حسن و عشق کے مختلف معاملات وکیفیات کی تصویر کشی سے بھرے پڑے ہیں ، لیکن ان میں شوخی کے ساتھ ایک سنبھلا ہوا انداز ملتا ہے۔

وہ ناز سے زمین پہ رکھتے نہ تھے قدم
تعریف کرکے اور بھی ہم نے اڑا دیا

ہاں ہاں تڑپ کے گزاری تھی نے رات
تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا

بھر دیں عجب ادائیں اس شوخ سیم تن میں
اک شوخ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

داغ کی معاملہ بندی کے بارے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں :

" معاملہ بندی کے واقعات جس شوخی ، چلبلے پن ، صفائی اور روانی کے ساتھ داغ نے باندھے ہیں وہ اور کسی کے حصے میں نہ آئے اور یہی داغ کا اپنا انفرادی اور

انوکھا رنگ ہے، ہمیشہ تازہ ، ہمیشہ شگفتہ اور طبائع میں گد گدی اور لطف پیدا کرنے والا ۔ معاملہ بندی کے مضامین جرأت نے بھی باندھے ہیں لیکن داغ کی جلی کٹی طعن و تشنیع ، رشک و بدگمانی ، چھیڑ چھاڑ ، لاگ ڈانٹ ، چھین چھپٹ والے مضامین وہاں کہاں ۔ داغ کی شاعری کا عاشق بھی چلبلا ہے اور معشوق بھی چلبلا ۔ دونوں طرح دار طبیعت دار ہیں ۔ جرأت کے یہاں " چوما چاٹی " ہے بھی تو عشق مجازی یا محبت کی کسک لیے ہوئے ۔ لیکن داغ کے یہاں تو بوالہوسی ہے اور اعلانیہ ، بلاکسی روک ٹوک بنا جھجک کے ۔ جرأت رندانہ اور رنگانہ صاف گوئی اور بے باکی ان کے کلام کی چمک کو اور بڑھا تی ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ ٹکسالی زبان ، دلی اور قلعہ معلی کا روز مرہ اور محاورے بات میں بات پیدا کر دیتے تھے ۔ تلامذہ آتش کے یہاں بھی یہ چیزیں مل سکتی ہیں لیکن بقول شعرالہند ان کا رنگ اتنا شوخ و ہموار نہیں ۔ رعایت لفظی ،کنگھی چوٹی کے الجھاو اور مبتذل اور سخیف اشعار سے ان کا کلام خالی نہیں ۔ داغ کے یہاں یہ بد مذاقی نہیں ہے ۔ ان کی شہرت ان کی استادی کی وجہ سے نہیں ہوئی جتنی ان کے اپنے خاص رنگ کے باعث ، دل کا چور جو ہمیشہ مختلف قیود میں محبوس تھا جب نکلا تو ایک عالم کو مسخر کر لیا ۔ بقول اقبال کے ۔

تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے

اور اس کی بے پردگی نے داغ کو ہمیشہ کیلئے چمکا دیا ۔ آخر عمر میں البتہ جوانی کے جوش سرد ہو جانے اور کسی اکھاڑے کے نہ ہونے کے باعث لکھنوی شعراء کی طرح محض الفاظ و محاورے کی نشست دکھانے کی خاطر اشعار کہنے لگے تھے ۔ ورنہ ان کا عام رنگ

وہی گرما گرمی چھین جھپٹ کا ہے ، جو ان کے ساتھ مخصوص ہے" [1]

شب وصل ضد میں بسر ہو گئی

نہیں کرتے کرتے سحر ہو گئی

لگاتے ہیں دل اس سے ، اب ہار جیت

ادھر ہو گئی یا ادھر ہو گئی

جفا پر وفا تو کریں سوچ لو

تمہیں مجھ سے الفت اگر ہو گئی

نا روا کہیے نا سزا کہیے

کہیے کہیے مجھے برا کہیے

درد دل کا نہ کہیں یا کہیے

جب وہ پوچھے مزاج کیا کہیے

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی

نا امیدی بڑھ گئی ہے اس قدر

آرزو کی آرزو ہونے لگی

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

1- نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر "دلی کا دبستان شاعری " اردو اکیڈمی سندھ کراچی 1966ء ، ص 293

یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے اے دل ناداں

ابھی وہ روٹھ جائیں گے ابھی وہ من کے بیٹھے ہیں

داغ کی شاعری میں ان کی زبان و بیان ، لہجے اور لے کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ ان کے مخصوص انداز اور لہجے نے ان کی غزل میں ایک انفرادیت پیدا کر دی ہے ۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ داغ زبان کے بادشاہ ہیں ۔ ان جیسی زبان لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ۔ شاعری میں زبان و بیان کی اہمیت بھی موضوعات سے کم نہیں ، اور یہ طے ہے کہ جو موضوعات داغ کے پاس ہیں وہ کسی کو نصیب نہیں ہو سکے اور جو زبان و بیان داغ کا مقدر ہوئی وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکی ۔

داغ زبان کے معاملے میں بہت چوکنے رہتے تھے ۔ خاص دلی کی زبان اور دلی کے محاورے اور روز مرہ کے سوا کسی زبان کو مستند نہیں جانتے تھے ۔ کسی نے ان سے پوچھا " حضرت دلی کے کون سے محلے سے تعلق ہے " کہا " میں نہ ترکمان دروازے کا ہوں ، نہ دلی دروازے کا رہنے والا ہوں ۔ میں تو چاندنی چوک کا شہدا ہوں" یہ وہی بات ہے جو میر امن نے کہی تھی کہ جو دلی کا روڑا بن کر نہیں رہا اسے اردو نہیں آ سکتی یا جو میر صاحب نے کہی تھی کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جو محاورہ اور روز مرہ بولا جاتا ہے بس وہی مستند ہے ۔ اسی طرح داغ نے اردو شاعری کو ایک منفرد زبان عطا کی ہے ۔1

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو

اور ہوتی ہے خطا وار کی صورت کیسی

1۔ معصوم بخاری " داغ ہندی مسلم تہذیب کی روشنی میں " مقالہ ایم ۔ اے اردو 1988ء مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

کہہ چکے غیر تو افسانے سب اپنے اپنے

مجھ کو کیا حکم ہے سرکار، کہوں یا نہ کہوں

فتنہ ، فساد ، رشک ، تغافل ، غرور ، ناز

اس کے سوا ہے اور تری انجمن میں کیا

حفظ، تسلیم ، ادب ،خلق ، تواضع ، تعظیم

کتنی تکلیف ہے اک شوق ملاقات کے ساتھ

سادگی ، بانکپن ، اغماض ، شرارت ، شوخی

تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

تمھاری طرح بھی ہو گا نہ کوئی ہر جائی

تمام رات کہیں ہو ، کہیں ہو سارا دن

زبان کے حسن کا انحصار اس کے محاورے اور روز مرہ پر ہوتا ہے ۔ داغ اس معاملے میں بہت سخت تھے ۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زبان و بیان میں ندرت ہونی چاہئیے کیونکہ محاورے کے بغیر شعر کا مزہ نہیں رہتا ۔ اپنے شاگرد ناطق گلاوٹھی کو مشورہ دیتے ہیں:

" یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ، مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آ جائے ، محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے ۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں ، اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئیے ورنہ نہیں "۔[1]

1۔ " زبان داغ " مرتبہ رفیق مار ہروی ، ص 280

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ خوبصورت اور موثر زبان کیلئے محاورے کو ناگزیر سمجھتے تھے ۔ محاورے میں ترمیم کو ناجائز مگر محاورے کیلئے شعر کو قربان کرنا جائز نہیں جانتے تھے ۔ انہوں نے جو کچھ کہا ، خود اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہے ۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آو گے تو قضا بھی نہ آئے گی

غیر کی محفل میں مجھ کو مثل شمع
آٹھ آٹھ آنسو رلایا آپ نے

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی رہی

کیوں تجھے چپ لگی ہے اے قاصد
منہ سے تو پھوٹ کچھ کہا بھی ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ داغ نے زبان کا ایک معیار قائم کیا ، اور ان کی زبان میں ایسا نکھار پیدا ہوا جو دلی یا لکھنو کے کسی استاد کو ان کے زمانے میں حاصل نہ ہوا ۔ انہیں اس بات کا فخر تھا کہ وہ ایک خاص طرز کے مالک ہیں اور زبان اردو ان سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا ہے ۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اگرچہ داغ کو یہ دعویٰ تھا لیکن ان کے اثرات ان کے شاگردوں میں بھی نظر آتے ہیں ۔ اور زبان کے استعمال کا شعور داغ کے علاوہ امیر، جلال اور تسلیم کے یہاں بھی وسیع پیمانے پر موجود ہے ۔ اگرچہ ان کے ہاں پرکاری نہیں لیکن انہوں نے سادگی ہی میں اس وصف کو پیدا کیا ہے ۔ تاہم یہ سب زبان کے شاعر نہیں ہیں ۔ زبان اور اظہار ان کے یہاں جذبات و خیالات کے تابع ہیں اور انہوں نے ان دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے ۔

اقبال کی ابتدائی غزل روایتی انداز کی تھی اور وہ بھی اپنا ابتدائی کلام داغ کو دکھاتے رہے ۔ اس زمانے میں اقبال پر روایتی اثرات خاصے زیادہ تھے ، لیکن جوں جوں ان کی فکر بالغ اور شعور پختہ ہوتا گیا ، ان کی غزل میں اجتہادی شان پیدا ہوتی چلی گئی ۔ اقبال نے اپنی غزل میں فلسفیانہ افکار اور معنوی جہتوں کو جگہ دی ہے اور غزل میں وسعت اور گہرائی شامل کرکے اسے ایک نیا انداز اور نیا آہنگ عطا کیا ہے ۔ لہٰذا اب اقبال کے افکار کی داغ کی زبان اور طرز بیان سے کوئی مطابقت نہ رہی اور وہ بدل گئے ، اور اپنے جدا راستے پر گامزن ہو گئے ۔ مگر داغ کے بہت سے شاگردوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا :

مسعود رضا خاکی داغ کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" داغ دہلوی کے تقریباً ایک ہزار شاگرد تھے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے ۔ ان میں سے تقریباً پچاس حضرات ایسے تھے جن کی حیثیت خود اپنی جگہ ایک استاد کی سی تھی اور سینکڑوں لوگ ان سے کسب فن کرتے تھے ۔ ان اساتذہ میں بزرگ ترین شخصیتیں بھی متعدد تھیں ۔ مثلاً ڈاکٹر

اقبال ، نواب عزیز یا ر جنگ عزیز ، نواب سائل دھلوی ، حضرت آغا شاعر دھلوی حضرت نوح ناروی ، حضرت احسن مارہروی ، حضرت دلبر مارھروی ، حضرت جالب دھلوی ، حضرت باغ سنبھلی حضرت و جاھت جھنجھانوی ، حضرت بیباک شاھجہان پوری ، حضرت عطا بدایونی ، ڈاکٹر مہدی حسین/ ألسم حضرت اختر نگینوی ، مولانا ظفر علی خاں ، حضرت شرف یار خاں مشرف ، حضرت عبدالحمید آزاد وغیرہ وغیرہ"۔[1]

ان کے شاگردوں میں نوح ناروی نہایت اہم ھیں ۔ مثل مشہور ہے کہ " چراغ سے چراغ جلتا ھے " ۔ اردو زبان کو سنوارنے ، نکھارنے اور شعر و فن کی شائستگی میں داغ نے جس حسن سلیقگی کا ثبوت دیا ، ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس چراغ کو روشن رکھا ۔ نوح ناروی نے داغ کے دبستان کو جس انداز سے آگے بڑھایا اور پایہ تکمیل تک پہنچایا ۔ اس کی مثال کم از کم کسی اردو شاعری کے استاد کو نصیب نہیں ھوئی ۔

نوح ناروی 1879ء میں قصبہ نارہ میں پیدا ھوئے ۔ آپ نے میر نجف علی سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ شعر و سخن کا شوق بھی انھی کی صحبت میں ھوا ۔ شروع شروع میں آپ انھی سے اصلاح لیتے رھے چونکہ آپ ذھین ،طباع ، خوش فکر اور بلند خیال تھے ، اس لیے استاد نے دوسرے استاد سے اصلاح کیلئے فرمایا ، بہت رد و بدل کے بعد آپ آخر فصیح الملک داغ دھلوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ھو گئے ۔ استاد کا کلام آپ کو بہت یاد تھا ۔ جب پہلی دفعہ استاد کی قدم بوسی کا شوق انھیں حیدر آباد لے گیا تو داغ نے ان کے حافظے کو

1۔ " حضرت نوح ناروی " ماھنامہ نکس نو " نوح ناروی نمبر " کراچی جلد نمبر 27 ۔ شمارہ 10 ، ص 26

دیکھ کر فرمایا ۔۔

" دیوان حافظہ پہلے دیکھا تھا مگر حافظ دیوان آپ ہی دیکھا "۔

اس کے بعد دوبارہ استاد کی خواہش پر دکن کا سفر اختیار کیا اور بہت دنوں تک رہ کر حضرت داغ و جناب ظہیر دھلوی سے مہری و دستخطی سندیں حاصل کیں ۔ داغ آپ کو اپنا عزیز جانتے تھے ۔ ذوق صحیح کا اندازہ کرنے کیلئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ استاد کا ایک شعر دو لفظوں کی تبدیلی سے ان کی زبان پر چڑھا سنا تو فرمایا " تبدیلی بہت برمحل ہے اور میں دیوان میں یہ شعر اسی طرح سے درج کروں گا "۔

ان کا کلام استاد کی زندگی ہی میں استاد سے ملتا جلتا تھا ۔ زبان کی شوخی ، بیان کی صفائی ، محاورات کی بے تکلفی اور الفاظ کی پسندیدہ الٹ پلٹ داغ کے کلام کی طرح نوح ناروی کے بھی کلام کی جان ہے ۔

داغ دھلوی نے اپنے اس شاگرد رشید کو ناخدائے سخن کا خطاب عطا فرمایا تھا ۔ تاج الشعراء کا خطاب انجمن معیار الشعراء میں پوری کی جانب سے پیش کیا گیا تھا ۔ اکبر الہ آبادی نے ایک یادگار مشاعرے میں نوح ناروی کو " فصیح العصر " کا خطاب دیا تھا ۔

داغ کی وفات کے بعد نوح ناروی کو ان کا جانشین منتخب کیا گیا ۔ ان کے تین دیوان سفینۂ نوح ، طوفان نوح اور اعجاز نوح چھپ چکے ہیں ۔ نوح ناروی کے نوادر افکار میں حمد ، نعت ، منقبت ، سلام ، قطعہ ، مثنوی ، مرثیہ ، مخمس ، مسدس اور غزل ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ مگر وہ زیادہ تر غزل کہتے تھے ۔

جوش ملیسانی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" حضرت نوح کسی صنف میں خوش بیانی اور استادانہ بندش کا رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ، جو کچھ کہتے ایک رنگ میں ایک انداز میں کہتے ۔ کوئی شعر حسن سخن اور نکتہ نوازی سے خالی نہیں ہوتا ۔۔۔ ان کی غزل حضرت داغ کے انداز غزل گوئی کا مکمل عکس کہی جا سکتی ہے ۔ اسے پڑھ کر افسردگی یا بیزاری پیدا نہیں ہوتی ۔ شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک دریاموجزن نظر آتا ہے ۔ مثلاً اس مقطع کو دیکھئیے جس میں گریہ و زاری کا مضمون باندھا گیا ہے مگر سننے والے کی طبعیت اس سے بھی شگفتہ ہو جاتی ہے ۔۔

نوح کی آنکھوں سے نکلے سینکڑوں طوفان اشک
اس کا رونا بھی تو اک دریا دلی کے ساتھ ہے

زبان نہایت شیریں اور شستہ ۔ اس پر سلیس اور عام فہم اتنی کہ ہر شخص سمجھ سکے۔ بیان اس قدر صاف اور سلجھا ہوا کہ شعر پڑھا اور دل میں اترا ۔ بندش اتنی ٹھوس کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا ۔ حشو و زواید کا نام تک نہیں پایا جاتا ۔ مضامین اتنے بلند اور تازہ اور دلکش ، گویا معانی کے آسمان پر بے شمار نورانی صورتیں اپنے جہاں آرا جمال کے جلوے دکھا رہی ہیں ۔ الغرض ان کے کلام بلاغت نظام میں شاعرانہ حسن ادا کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کی استادانہ عظمت کا مکمل ثبوت ہیں ۔ مگر جس طرح ہر استاد کے کلام میں کچھ امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں ۔ ان کے کلام میں بھی بعض محاسن ایسے نمایاں ہیں جو ان کو اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتے ہیں "[1]

1۔ " حضرت نوح ناروی حیات اور کمال سخن " ماہنامہ عکس نو کراچی جلد نمبر 27 شمارہ 10 ص 16

ان کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ان کا کلام بہت عام فہم اور سادہ ہے ۔ تصنع کا شائبہ تک نہیں ۔ وہ نازک مضامین کو بھی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں ۔

فلک کے پار ہوتی ہے ، کلیجے میں اترتی ہے
ہماری ایک اک فریاد دو دو کام کرتی ہے
ہمارا دل ہو یا ان کی زباں دونوں ہی آفت ہیں
یہ سب کچھ کر گزرتا ہے وہ سب کچھ کہہ گزرتی ہے
بیان غم کا کوئی قدر داں نہیں ملتا
مجھی کو لوگ سناتے ہیں داستاں میری
جو نہ دن کو پاس آیا جو نہ ٹھہرا رات کو
ہے اسی کا ذکر اسی کی یاد سوتے جاگتے

ان کے بیشتر اشعار سہل ممتنع کی ذیل میں آتے ہیں ۔

اکیلے میں کسی کا جی بہلنا غیر ممکن ہے
ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تمہیں تم ہو تو کیا تم ہو
خدا کے ڈر سے تم کو ہم خدا تو کہہ نہیں سکتے
مگر لطف خدا ، قہر خدا ، شان خدا تم ہو

زبان کی حیثیت بالکل ایک باغ کی سی ہے جس میں اصناف ادب کے بلند و بالا درخت بھی ہیں ۔ اور نرم و نازک خوش رنگ پھولوں کی کیاریاں بھی ۔ اس میں خود رو ، سبزہ، جڑی بوٹیاں اور جنگلی پھول بھی پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اگر باغباں اپنے فن کو بروئے کار نہ لائے

اور باغ کی دیکھ بھال نہ کرے تو ہر باغ کچھ عرصے کے بعد جنگل یا ویرانہ بن جائے - اردو زبان کی یہ خوش بختی ہے کہ اس کی دیکھ بھال کیلئے ہر زمانے میں کئی کئی صاحبان فن موجود رہے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق انہوں نے زبان کی درستی کے ساتھ اصناف ادب کی نشوونما کا خیال رکھا ہے - یہی حیثیت نوح ناروی کی بھی تھی - انہوں نے لسانی اہمیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا - وہی انداز اپنایا جو داغ کا تھا - اور اس حد تک اپنایا کہ خود داغ کو بھی ان کی غزل کے آئینے میں اپنا ہی عکس نظر آنے لگا -

مسعود رضا خاکی لکھتے ہیں :-

" حضرت نوح ناروی کا کلام ہر اعتبار سے داغ دہلوی کے کلام کا ہمرنگ ہوتا چلا گیا - وہی روزمرہ اور وہی محاورے جن کی سند کیلئے کبھی جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر جانے کی ضرورت ہوا کرتی تھی - جس طرح دواوین داغ میں محفوظ ہو گئے اسی طرح دواوین نوح میں بھی بحفاظت نظر آتے ہیں" -[1]

مثلاً دیکھئیے :-

اغیار سے بھی پرسش جرم و قصور ہو
ایسا ضرور کیجئیے ، ایسا ضرور ہو

کوئی کس طرح مرتا ہے کسی پر آپ کیا جانیں
ہم اس کو جانتے ہیں بندہ پرور آپ کیا جانیں

1- " حضرت نوح ناروی " ماہنامہ عکس نو کراچی جلد نمبر 27 ، شمارہ 10 ، ص 43

یہ میں کہتا ہی جاؤں گا مجھے بھی اک نظر دیکھو

نہ مانو یا اسے مانو نہ دیکھو یا ادھر دیکھو

نوح ناروی روز مرے اور محاورے پر عبور کے ساتھ ساتھ علم معانی پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے ۔ یہ بات مد نظر رہے کہ داغ اور نوح کی فکر سطحی نہیں تھی بلکہ انہوں نے عاشق ، معشوق ہجر وصال ، شمع ، پروانہ ، تیغ ، خنجر، ہدف ، نامہ بر، واعظ ، رند وغیرہ تمام الفاظ کو اکثر مقامات پر استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ تاریخی اور سیاسی بصیرت کے بغیر داغ اور نوح کے کلام کا صحیح لطف نہیں اٹھایا جا سکتا ۔

بھیس بھی غیر کا بدلا تو ہوا کیا حاصل

مجھ کو اس نے مری آواز سے پہچان لیا

قیامت کا چلن تیغ نگاہ یار میں دیکھا

جو اس تلوار میں دیکھا وہ کس تلوار میں دیکھا

نوح ناروی نے غزل میں تغزل کی روایت کا پورا خیال رکھا ہے ۔ اور داغ کی طرح تغزل کے مانے ہوئے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ تصوف کے مضامین کو بھی اسی رنگ میں پیش کرتے ہیں:۔

دنیائے ذوق و شوق میں ہوں خوش نصیب میں

کوئی مرے قریب کسی کے قریب میں

نوح کے ہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں بلا کی شوخی اور بانکپن پایا جاتا ہے۔

اللہ رے ان کا رنگ بدلنا عتاب میں

بگڑے وہ جس قدر اسی حد تک سنور گئے

ان کو ہے اس کی مسرت ٹل گیا وعدہ مرا

مجھ کو اس کا رنج ہے ان کی زباں جھوٹی ہوئی

میکدے سے باہر آکر جستجو بیکار ہے

رہ گئی ہو گی وہیں توبہ مری ٹوٹی ہوئی

افتاد عشق اس سے سوا اور ہو گی کیا

نظروں سے ہم گرے ترے دل سے اتر گئے

ان کے کمال کا اعتراف ان کے استاد داغ نے خود ان الفاظ میں کیا:۔

" ان کے کلام کی عزت میرے کلام کی عزت اور ان کی وقعت میری وقعت ہے۔
یہ میرے ان شاگردوں میں سے ہیں جو میرے بعد میرے نام کو بڑی عزت
سے زندہ رکھیں گے "۔[1]

نوح ناروی کو اپنے استاد سے دلی محبت اور عقیدت تھی ۔ ایک قطعے میں فرماتے ہیں:۔

عالم کو جتا دینگے کہ داغی ہم ہیں

دنیا کو دکھا دیں گے کہ داغی ہم ہیں

اے نوح اگر سامنے آئے گا حریف

تو داغ لگا دیں گے کہ داغی ہم ہیں

داغ اور نوح ناروی کے کلام میں اس حد تک یکسانیت ہے کہ اگر دونوں کا کلام ایک جگہ رکھ دیا جائے تو یہ پہچان مشکل ہو جائے کہ ان میں سے داغ کا کلام کونسا ہے اور نوح ناروی کا کونسا۔

1۔ عروج ھندی بدایونی " نوح ناروی شخصیت اور فن " ماہنامہ عکس نو کراچی ، ص 82

نوح ناروی اپنے استاد کے اسلوب کی پیروی پر فخر کرتے ہیں -

نوح کے شعر و سخن میں کیوں نہ ہو لطف زباں

اس نے سیکھا اس کو رہ کر داغ سے کامل کے پاس

نوح ناروی کے بعد ان کے بعض شاگردوں نے بھی اس روایت کو قائم رکھا - اور ان کے دبستان کو آگے بڑھانے کی کوشش کی - ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں -

" مہیش پرشاد سوگ (الہ آبادی) ، حافظ ریاض احمد (ناروی) احمد دراز عاجز (عطائی پوری) عبدالغفور تاج (الہ آبادی) حامد (عظیم آبادی) حاجی ہارون انصاف قادری (بمبئی) نظر (ناروی) ڈاکٹر اعظم (تریوی) رفیق قائم گنجوی) قمر (مالیگانوی) اکبر (ناروی) صغیر حسن زیبا (ناروی) مصطفیٰ خاں ناظر (مالوہ) عیش (الہ آبادی) عزیز (مرزا پوری) سراج (الہ آبادی) سرور (الہ آبادی) مولوی نعمت اللہ نعمت (ناروی) سبط حسن فاضل زیدی (دہلوی) قمر اجنالوی "-1

نوح ناروی کے تلامذہ میں زیبا ناروی سب سے اہم شاعر ہیں اور داغ کی روایت کے امین ہیں- زیبا داغ کی محفل کے چراغوں میں سے ایک بلکہ آخری روشن چراغ تھے - یعنی آپ کے استاد نوح ناروی داغ کے شاگرد تھے اور ان کا سلسلہ شاعری داغ کے واسطے سے شاہ مبارک آبرو تک جا پہنچتا ہے -

---

1- قمر اجنالوی " تلامذہ نا خدائے سخن " ماہنامہ عکس نو کراچی " نوح ناروی نمبر " جلد نمبر27 شمارہ نمبر 10 ، ص 105

زیبا ناروی	شاگرد	نوح ناروی [1]
نوح ناروی	"	داغ دہلوی
داغ دہلوی	"	ذوق دہلوی
ذوق دہلوی	"	شاہ نصیر دہلوی
شاہ نصیر دہلوی	"	شاہ مائل دہلوی
شاہ مائل دہلوی	"	شاہ قائم دہلوی
شاہ قائم دہلوی	"	سودا دہلوی
سودا دہلوی	"	شاہ حاتم دہلوی
شاہ حاتم دہلوی	"	شاہ مبارک آبرو دہلوی

زیبا ناروی نے اپنے استاد کے رنگ کو اس حد تک اپنایا کہ ان کے کلام پر نوح ناروی کا دھوکا ہوتا ہے ۔ ان کا کلام زبان دہلی کا آخری اور کسی حد تک کامل نمونہ ہے ۔ زیبا کے متعلق لکھتے ہوئے سید محمد شعبان فرماتے ہیں :-

" جس طرح میں نے 1937ء کے ریڈیو نشر یے میں یہ جملہ پڑھا تھا کہ حضرت ذوق اگر کوئی کارنامہ نہ چھوڑتے تو حضرت داغ جیسے شاگرد کا وجود ہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ۔ اسی طرح آج میں بلا خوف تردید یہ لکھ سکتا ہوں کہ حضرت نوح ناروی اگر ہزاروں شاگردوں کو نہ نوازتے تو صرف حضرت زیبا ناروی جیسے شاگرد رشید کا وجود ہی ان کو بقائے دوام بخشنے کے لیے کافی تھا "[2]

1- " رہنمائے تعلیم " دہلی 1942ء

2- سید محمد شعبان " سفینۂ اردو پاکستان کے شاعری " ماہنامہ عکس نو کراچی نوح ناروی نمبر

زیبا ناروی نوح ناروی کے ایسے خلف الرشید تھے جنھوں نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے فصاحت و بلاغت اور زبان کی چاشنی کے علاوہ سہل ممتنع کی خصوصیت بھی حاصل کی اور اپنا ایک منفرد انداز قائم کیا ۔ چنانچہ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے سید محمد نعمان لکھتے ہیں :۔

" اگر میں یہ کہوں کہ حضرت زیبا نے اپنے دادا استاد سے زبان کی چاشنی لی اور اپنے استاد سے سہل ممتنع کی صفت تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا اور اگر بے ادبی اور گستاخی معاف کی جائے تو مجھے یہ لکھنے میں بھی باک نہیں ہے کہ حضرت زیبا پر گرو گڑ اور چیلہ چینی کی مثل صادق آتی ہے" ۔1

نوح ناروی کی یاد میں ان کی انیسویں برسی کے موقع پر 27 اکتوبر 1979ء کو ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر تبسم رضوانی نے زیبا ناروی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا " نوح ناروی کا فن زندہ ہے بصورت زیبا ناروی " ہم اس آئینے میں اس عکس کو دیکھ رہے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ زیبا عظیم ہستی کے عظیم جانشین ہیں اور اپنے استاد کے رنگ کو بڑی خوبی سے اپنائے ہوئے ہیں ۔

بیسویں صدی میں رومانوی ادبی رجحان ، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر اردو غزل میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں ۔

اقبال کے بعد فراق گورکھپوری کا نام سب سے اہم ہے انہیں جدید غزل کا پیش رو کہا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے حسن و عشق کے نفسیاتی مسائل کو نئے علوم کی روشنی میں پیش کیا ہے ۔

ان کی غزل سے جدید تاثرات و کیفیات کا آغاز ہوتا ہے ۔

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیں بھی دیں گی نہ ساتھ

مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی

جوش ملیح آبادی کی غزل کا اہم موضوع تغزل ہے ۔ ان کی غزل میں مسلسل مضامین ملتے ہیں جس سے غزل پر نظم کا گمان ہوتا ہے ۔ جوش حسین و مترنم الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ جن کے باعث ان کی غزلوں میں جگہ جگہ نغمہ پھوٹتا نظر آتا ہے ۔

موج ہوا میں عطر تھا چٹکی ہوئی تھی چاندنی

پھول کھلے تھے باغ میں چرخ پہ مہتاب تھا

اس کے بعد اردو غزل نے پھر کروٹ لی اور نئے راستے پر جا نکلی ۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ بہتر سمجھا ۔ چنانچہ انہوں نے غزل پر مختلف قسم کے اعتراضات شروع کر دیے اور نظم کو اہمیت دی ۔ ترقی پسند شاعری میں غزل کے خلاف بہت رد عمل ہوا لیکن غزل ایسی جاندار صنف ہے جو ان مخالفتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ زندہ رہی بلکہ ہر دور میں اپنا لوہا منوایا ۔

رفتہ رفتہ یہ رد عمل کم ہوا اور ترقی پسند شعراء غزل کہنے کی طرف مائل ہوئے ۔ ان میں فیض احمد فیض کا نام سر فہرست ہے ۔ انہوں نے غزل کے روایتی استعارات و علامات کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا ہے جن میں تغزل کی رنگینی بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے ۔ فیض کی بدولت اردو غزل نئی شائستگی اور جمالیاتی آہنگ سے آشنا ہوئی ہے ۔

شام گلنار ہوتی جاتی ہے دیکھو تو سہی

یہ جو نکلا ہے لئے مشعل رخسار ہے کون

فیض کے علاوہ اسرار الحق مجاز ، علی سردار جعفری ، ساحر لدھیانوی ، مخدوم محی الدین اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے بھی اردو غزل میں نئےموضوعات شامل کرکے اور نئے اسالیب دے کر اسے انفرادیت بخشی ۔

حلقۂ ارباب ذوق کے تحت ایک مرتبہ پھر نظم نگاری مقبول ہوئی لیکن یہ شعراء بھی غزل سے دور نہ رہ سکے اور قیوم نظر ، مختار صدیقی ، میرا جی وغیرہ نے میر کے رنگ میں غزلیں کہنی شروع کر دیں ۔ اس طرح رنگ میر کا احیاء ہوا اور غزل کی مقبولیت مسلم ہو کر سامنے آئی ۔غزل کی جڑیں ہماری شاعری میں اس قدر مضبوط تھیں کہ وہ ایک جاندار صنف سخن کے نام پر ابھر کر آئی ۔

گویا غزل میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن ناصر کاظمی جیسے شاعروں نے غزل کا روایتی رنگ آہنگ اور طرز تغزل بھی برقرار رکھا ۔

زیبا ناروی کی غزل گوئی

زیبا ناروی کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا اور انہوں نے اپنی پوری زندگی اس کیلئے وقف کر دی ۔ شاعری ایک وہبی ملکہ ہے اس لیے وہ شعر اچھا مانا جاتا ہے جس میں آمد اور بے ساختگی ہو ۔ زیبا کو یہ نعمت عظمی خلاق عالم کی جانب سے عطا ہوئی تھی ۔ نیز ان کو یہ فن وراثتاً بھی میسر آیا تھا ، شاعری ان کا خاندانی وصف تھا ۔ خود ان کے والد شعر فہم تھے اور شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے ۔

راقمہ نے موصوف کی شاعرانہ تخلیقات کے حصول میں جہاں ان کے داماد انجم زیبائی اور ان کے بیٹے ابوالبشر سے مدد لی ، وہیں ان کے دوستوں سے بھی استفادہ کیا ۔ جن ادبی رسائل سے موصوف کی غزلیں حاصل ہوئیں ان میں رسالہ برق ، ہفتہ وار جہلم ، ماہنامہ تصویر رامپور ، نرالی دنیا ، ماہنامہ پریم جموں و کشمیر ، روزنامہ عالمگیر ، ماہنامہ استقلال ، فلم لائٹ لاہور ، پندرہ روزہ آواز ، روزنامہ پنچ دہلی ، ماہنامہ مشہور دہلی ، نیرنگ خیال لاہور ، شاہکار لاہور ، ماہنامہ احسن رامپور ، نگارستان کراچی شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ میں نے کئی لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موصوف کا نہ تو کوئی مجموعہ کلام طبع ہوا اور نہ ان کی حیات میں مرتب ہی ہو سکا ۔ زیبا کی جو مطبوعہ غزلیں راقمہ کو مل سکی ہیں ان کی تعداد 34 ہے ۔

مطبوعہ غزلوں کے علاوہ راقمہ کو زیبا ناروی کا غیر مطبوعہ کلیات بھی دستیاب ہوا جس میں پانچ دیوان ہیں اور غزلوں کی تعداد 201 ہے ۔ ان کی فراہمی میں انجم زیبائی صاحب نے راقمہ کی ہر ممکن مدد کی ۔

زیبا ناروی شاعری میں عموماً اور غزل میں خصوصاً روایت پسند ہیں ، اور اردو ادب میں روایت کو ملحوظ رکھنے والا شاعر ہی صحیح غزل گو کہلانے کا مستحق ہے ۔ روایت سے باغی ہو کر وہ اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا ۔ البتہ روایت میں جدیدیت اور معاشرتی تبدیلیوں کے آثار شامل کر کے اپنے لب و لہجہ اور اسلوب کو دوسرے غزل گو شعراء سے منفرد کرنے کا حق بہر حال ہر غزل گو کو حاصل ہے ۔ کیونکہ اسی سے اس کی انفرادیت قائم ہوتی ہے اور اس کی غزل کو عروج حاصل ہوتا ہے ۔ زیبا کی شاعری روایت سے گہری وابستگی اور فن کی پابندیوں کے ساتھ اپنے اندر ایک نیا انداز رکھتی ہے جو انہیں اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے ۔ انہوں نے کلاسیکی شاعری کے اسالیب کو اپنانے کے علاوہ اپنی غزل میں جدید دور کے میلانات کو شامل کرکے غزل کے گیسوؤں کو سنوارا ۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ زیبا کی تعلیم دہلی میں ہوئی اور شاعری بھی یہیں پروان چڑھی جس کے باعث زیبا قدرتی طور پر دبستان دہلی کے شعراء میں شامل ہو گئے اور ان کی غزل میں داغ کے اسلوب کی تمام خصوصیات آگئیں ۔جس طرح دبستان دہلی کے دیگر شعراء آسان زمین ، سادہ قافیے اور ان سے میل کھاتی ہوئی ردیفیں اختیار کرتے تھے، زیبا نے بھی ان سے انحراف نہیں کیا ۔

زیبا ناروی کے ہاں ان کے جذبات پر قدیم کلاسیکی لہجے اور غزل کی روایتی لفظیات کا پرتو ملتا ہے ۔ ان کے ہاں شیخ ، زاہد ، پارسا ، ساقی ، جام و سبو ، میخانے اور پینے پلانے کے تذکرے عام ہیں جو سب غزل کی روایتی علامتیں ہیں ۔

لاکھ ساقی نے پلائی سر میخانہ مگر

پینے والوں میں وہی ذوق وہی جوش رہا

اے شیخ حرم ہی تو مٹے جلوہ ساقی

تن پر نہ ترے جامۂ احرام رہے ؟

چشم ساقی سے پیا کرتے ہیں پینے والے

یہ جو صورت ہے تو پھر ساغر جم کیا ہو ؟

بہار آئی اسے توڑوں ، اسے توڑوں کسے توڑوں

ادھر تو یہ نظر میں ہے ادھر جام شراب آیا

جناب شیخ بھی کتنے بڑے کو تاہ بیں نکلے

حرم آیا نگاہوں میں صنم خانہ نہیں آیا

درماں سے ہے دل کو حذر مرہم نہ رکھ اے چارہ گر

ناسور یہ ہو جائیں گے اب ہیں گے اچھے گھاؤ کیا

کے دن کی یہ زیبا رندی ہے کے روز کا یہ مے خانہ ہے

بہکی ہوئی تو یہ سنبھلے گی چلتا ہوا ساغر ٹوٹے ؟

چونک پڑتے ہیں خدا جانے یہ کیوں شیخ حرم

بات جب کوئی نکل آتی ہے بت خانوں پر

نظر انداز کر ان کو سمجھ کر سوچ کر ساقی

کہیں یہ رند آمادہ نہ ہو جائیں بغاوت پر

کہاں دنیا کہاں زاہد ، ہنسی آتی ہے حضرت پر

قدم آتشکدہ میں ، اور نظریں باغِ جنت پر

میں بھی ساقی تری محفل میں نکل آیا ہوں

ہو سکے تجھ سے تو بھر دے میرا پیمانہ دل

ہاں ایک شب میکدہ اے حضرت زاہد

سو سال بہت آپ پریشان ہوئے

یہ تو واضح ہے کہ زیبا غزل کی کلاسیکی روایتوں میں پلے ہوئے شاعر ہیں ۔ لہٰذا ان کی غزل سخن کی روایات کی پابند ہے ۔ اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ روایت محض قصہ گل و بلبل اور افسانہ ہجرو وصال کی داستان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ایک باوضع اور حیادار تہذیب کی ترجمان تھی اور اس تہذیب کے شاعر کا کمال یہ تھا کہ وہ رمزیہ یا ایمائی انداز کے ایک ہی استعارے کی مدد سے معانی کے ہزاروں جلووں کے گلزار سجا دیا کرتا تھا ۔ وہ ضبط نفس اور ضبط بیان دونوں کو ساتھ لے کر چلتا تھا ۔ وہ تو کچھ ایسا ماجرا تھا جو میر تقی میر پر گذرا تھا ۔

اک نگہ ایک چشمک ، ایک سخن

ہے مگر اس میں بھی تامل سا

زیبا ناروی نے اساتذہ کے کلام کے بحر مواج میں غوطہ لگایا ، ان سے بیان کا لطف اور لب و لہجہ سیکھا اور پھر اس میں اپنے مزاج کے رنگا رنگ پھول کھلائے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گل و بلبل کی شاعری جذبہ محبت کی شاعری ہے اور جذبہ محبت تمام جذبات انسانی سے زیادہ قوی ہے ۔

تقریباً تمام شاعروں نے اسی سے وابستہ مضامین پر خیال آرائیاں کی ہیں مگر زیبا کی طرز خاص بے حد دل پسند ہے ۔ مشہور فرانسیسی انشاء پرداز و کٹر ہیو گو کا کہنا ہے کہ

شاعری کیلئے کوئی مضمون اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور برے شاعر ہوتے ہیں۔

زیبا ناروی کی غزل میں واردات قلبی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے کیونکہ ایک تو خود زیبا کے شب و روز حزن و ملال میں بسر ہوئے اور دوسرے خارجی ماحول نے ان کی داخلیت پر بے انتہا اثر کیا۔ اور ان کی شاعری میں سوز و گداز پیدا ہوا ۔ جس کے اظہار کیلئے غزل سے بہتر اور کوئی صنف اردو شاعری میں موجود نہیں ۔ جس طرح دلی کے دبستان شاعری میں غیر ضروری ، بھاری بھرکم اور بوجھل تراکیب مفقود ہیں ، اسی طرح زیبا کی غزل بھی کسی حد تک ان سے پاک ہے ۔

انکی غزل کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو غزل کے اساتذہ کی روایت میں داغ کے معتقد ہیں اور غزل گوئی میں انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں ۔ داغ کے ورثے کو نوح ناروی نے نیا رنگ و روپ دیا اور زیبا ناروی نے ان کے انداز کو اپنایا اور اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ وہ اسی انداز میں اشعار کہتے ہیں ۔ نوح ناروی کے ہاں جو خصوصیات ہیں ، وہی زیبا ناروی کی غزلیات میں بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ 1944ء میں بھوپال میں کل ہند مشاعرہ تھا ۔ مشاعرے کے اختتام پر وحید خیال آگے بڑھے اور زیبا مرحوم سے اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا " جناب آپ کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نارہ کے نوح ناروی سے بہت زیادہ متاثر ہیں " فرمانے لگے " حضرت نوح نہ صرف رشتہ دار ہیں بلکہ میرے استاد بھی ہیں اور ظاہر ہے استاد کے رنگ کلام سے متاثر ہونا فطری بات ہے " ۔

اور واقعی رنگ کلام کی مماثلت نے یہ فطری بات ثابت کر دی تھی ۔

بھولے ہی تھے ہم اس کو وہ پھر یاد آ گیا
پھر آ گئی پلٹ کے مصیبت ٹلی ہوئی
یہ بھی نہ کوئی چال ہو ان کی چلی ہوئی
سانچہ میں قہر کیلئے قیامت ڈھلی ہوئی
انجام برا آتا ہے نظر ہم خیر منائیں کیا دل کی
ان سخت نگاہوں سے اک دن ٹکرا کے یہ شیشہ ٹوٹے گا

زیبا ناروی کی شاعری پر غالب رنگ نوح ناروی اور ان کے حوالے سے داغ کا ہے ۔ جس طرح نوح کے کلام کی نمایاں خصوصیت لفظوں کے الٹ پھیر اور تکرار لفظی سے ابھرتی ہے، اسی طرح سے زیبا کے اشعار میں بھی یہ خوبی اجا گر ہو کر سامنے آتی ہے اور اس سلسلے میں وہ ہو بہو اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل غزل دیکھئے جس میں زیبا نے نوح کا تتبع کیا ہے ۔

یہاں آج مسکن وہاں کل ہے مدفن ازل سے عجب رات دن ہیرا پھیری
یہ دنیا کی دولت ، یہ دولت کی دنیا نہ اس کی نہ میری نہ تیری
اداؤں کی دنیا جوانی کا عالم زمانہ ہے تیرا خدائی ہے تیری
اب ایسے میں جو کچھ گزرتی ہے مجھ پر سناؤں کسے میں سنے کون میری
ادھر بے نیازی ادھر بندگی میں ادھر خود نمائی ادھر بے خودی میں
فسانہ فسانہ ، فسانہ ہے تیرا ، کہانی کہانی ، کہانی ہے میری

سر حشر اب کیا پشیماں ہو تم نظر کیوں ہے نیچی ہوئے کس لیے گم

یہاں بھی ستاو ستم دل پہ ڈھاو کرو سخت گیری دکھاو دلیری

جلال تجلی نے ایماں کھوئے نگاہوں نے دیدار سے ہاتھ دھوئے

یہ کیا دید ان کی یہ کیا سیر جلوہ نہ دل کو تسلی نہ آنکھوں کو سیری

دم سیر گلشن کرے غور دنیا نہ کچھ اور عالم نہ کچھ اور دینا

خزاں کی فضا میں گلوں کی ادا میں حکایت ہے میری کہانی ہے تیری

بڑے خود غرض ہو بڑے مطلبی ہو نہ سمجھے تھے ہم ایسا بے درد تم کو

یہ کیا دل بری ہے یہ کیا دل لگی ہے ادھر دل اڑایا ادھر آنکھ پھیری

یہ ہے تیرہ بختی محبت میں زیبا قدم جب کوئی میں نے آگے بڑھایا

اٹھیں ہر طرف خوف ساماں گھٹائیں نگاہوں پہ چھائی غضب ناک اندھیری

ان کے علاوہ زیبا کی بعض غزلوں کے موضوعات اور ردیفوں پر غالب کی غزلوں کے موضوعات اور ردیفوں کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے ۔ مثلاً غالب کہتے ہیں کہ

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

زیبا ناروی کہتے ہیں :۔

دل اور حسینوں کا ، حسینوں کی نظر اور

تصویر کے دو رخ ہیں ادھر اور ادھر اور

غالب کا شعر ہے -۔

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

زیبا کا شعر کچھ یوں ہے -۔

ایسا نہیں دنیا میں کوئی شعبدہ گر اور

ظالم کی زباں اور ہے دل اور نظر اور

اسی طرح سے غالب کی ایک اور غزل کا شعر ہے =۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری

اور پھر وہ بھی زبانی میری

زیبا اپنی غزل کے اشعار میں ایک جگہ کہتے ہیں =

کہانی سوز غم کی کہہ سکوں طاقت کہاں میری

ارادہ بھی ہو کہنے کا تو جل جائے زباں میری

مندرجہ ذیل شعر دیکھئے جس میں غالب کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے =۔

رہائی میں اسیری کے مزے جب یاد آتے ہیں

بڑی حسرت سے میں زنجیر زنداں دیکھ لیتا ہوں

اردو شاعری حسن و عشق کے مضامین سے بھری پڑی ہے ، لیکن ہر شاعر نے بساط بھر اپنے انفرادی تجربات کو نیا پیکر عطا کرکے حسن و عشق کے موضوع کو نبھایا ہے ، اور یہی اس روایت

کو متحرک رکھا ہے ۔ زیبا ناروی بھی انہیں شعراء میں سے ایک فرد اور شاعر ہیں جنہوں نے مضامین حسن و عشق کو بھی ایک نیا رنگ اور ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے ۔ ان کے عشقیہ اشعار میں تنوع ، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے ۔

معاملہ بندی کو جو حسن و عشق کی تصویر کشی سے عبارت ہے، استاد داغ دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ایک کامل روایت کے طور پر اپنایا اور اسے یہاں تک بڑھایا کہ وہ روایت ان کے کلام میں نمایاں حیثیت اختیار کر گئی ۔ علامہ اقبال نے بھی آغاز سخن میں اس انداز کو پذیرائی بخشی ، غالب خیال یہ تھا کہ ان کے بعد کسی کو یہ انداز میسر نہ آ سکے گا مگر زیبا ناروی نے ان کے اسلوب بیان میں جدت انگیز نادرہ کاری کی ہے ۔ انسانی فطرت کے لامحدود پہلو جذبہ حسن و عشق کے ماتحت جس طرح سنورتے ، بگڑتے ، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش تخیل اور پورا زور قلم صرف کر دیا ہے ۔

کیا کیا میں نے ستم ان کو پری زاد کہا

وہ یہ کہتے ہیں نہ آؤ انسان کے قریب

گرتے پڑتے کسی صورت سے جو پہنچا بھی تو کیا

آ گئی موت مجھے کوچۂ جاناں کے قریب

دور سے دیکھتے ہیں میری پریشاں حالی

کچھ سمجھ کر نہیں آتے وہ پریشاں کے قریب

وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی ناراض ہیں مجھ سے

اظہار محبت ہے خطا دیکھئے کیا ہو

رہا چپ مگر نہیں بولے کسی سے ہم

دل کا فسانہ کہہ گئے آہستگی سے ہم

قابو میں لاؤں خاک دل بے قرار کو

وہ ضبط کر چکے ہیں میرے اختیار کو

زیبا ناروی نے اپنی عشقیہ شاعری میں روایت کی پاسداری کی ہے ۔ وہ غزل میں تغزل کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں ۔ غزل کے تمام کلاسیکی اور روایتی مضامین ان کے کلام میں موجود ہیں ۔ اس کے باوجود تغزل کو کہیں کوئی ضعف نہیں پہنچا بلکہ اس کے حسن میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ تصوف کے مضامین کو بھی انہوں نے تغزل ہی کے رنگ میں پیش کیا ہے ۔ زیبا ناروی کے تغزل میں بھی وہی شوخی اور بانکپن ہے جو داغ دہلوی کی خصوصیت ہے اور اس سلسلے میں وہ ایک بلند مقام رکھتے ہیں ۔ ان کے کلام میں جہاں تغزل کی شوخی ملتی ہے وہاں وقار اور متانت بھی موجود ہے ۔ داغ کی شاگردی اور تقلید کے باوجود زیبا ناروی کے کلام میں خواجہ میر درد کی سی پاکیزگی اور متانت بھی موجود ہے ۔

منزل ہے ابھی دور قدم کانپ رہے ہیں

ہر گام پہ دل ڈوب چلا دیکھئیے کیا ہو

منصفی چاہیے ، دشوار کو آساں نہ کہو

قیمتی شے ہے محبت، اسے ارزاں نہ کہو ۔

جلوہ حسن کا دل کیوں نہ تماشائی ہو

کون سا شیشہ ہے جس پر نہ آنچ آئی ہو

نگاہوں سے ادا کر لیں گے ہم سجدے محبت کے

جبیں کے ساتھ رسوائی ہے جہاں وہ سنگ در کیوں ہو

یہ مانا کہ ہو گی تمہیں مجھ سے الفت مگر کیا یقیں و تسلی کی صورت

کبھی مجھ کو پوچھا ، کبھی مجھ کو سمجھا ، کبھی میری تقدیر بھی تم نے پھیری

ان کا جلال دیکھ کر ان کا جمال دیکھ کر

کھوئی ہوئی ہے چشم شوق عالم نار و نور میں

عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے ۔ اس یگانگت کو یوں بیان کرتے ہیں :-

شام صحرا دیکھئیے ، صبح گلستاں دیکھئیے ۔

عشق پیغام جنوں ہے حسن پیغام بہار

حسن ایک بیرونی حقیقت کا نام ہے جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اور عشق اس بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے ۔ یعنی عشق میں شخصیت ضرور منعکس ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو حسن کا تصور بھی شخصیت میں محصور ہے ۔ زیبا ناروی کے تصور حسن و عشق کا سراغ ان کی شخصیت اور ذہنی رویوں کے ذریعے ہی لگایا جا سکتا ہے ۔ وہ حسن کی رنگینی ، تاثر اور اس کی ساحرانہ کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے محبوب سے متعلق لوازمات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔

روداد حسن و عشق ہے میری حیات و موت

قدرت نے مرنے جینے کا ساماں بنا دیا

نہیں معلوم حسن و عشق میں کل کیسی باتیں تھیں

کوئی سن کر پریشان تھا کوئی کہہ کر پشیماں تھا

ازل سے فطرتاً یہ حسن والے ساتھ لائے ہیں
خفا ہونا ، غضب ڈھانا ، ستم کرنا ، دغا دینا

چاند پر ابر کی چادر نہ پڑنے پائی
حسن پھر حسن ہے پردے میں چھپایا نہ گیا

ان کے ہاں نسوانی حسن کا ذکر موجود ہے اور اس میں خاص طور پر محبوب کی نگاہ ، زلف و گیسو اور تل کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں ۔

کاکلیں تری نہیں عارض تاباں کے قریب
ہے یہ ظلمت کی گھٹا چشمہ حیواں کے قریب

کہوں کیوں تل ہے ترے عارض انور کے قریں
جم کے کافر کوئی بیٹھا ہے مسلماں کے قریب

نہیں اک روپ میں قائم نگاہ یار کی صورت
کبھی نشتر، کبھی خنجر، کبھی تلوار کی صورت

حسن کو عشق کا احساس ہو جائے تو غم بھی اچھے لگنے لگتے ہیں ۔

حسن کو عشق کا احساس تو ہے
زندگی غم کی مجھے راس تو ہے

اور کیا ہو کشش ذوق طلب
ہر نظر، حسن کی عکاس تو ہے

عشق و عاشقی کے سلسلے میں ان کے ہاں جذباتیت نظر آتی ہے ۔ ان کا تصور عشق بھی اردو غزل کے روایتی تصور جیسا ہے ۔ ان کی غزل کا عاشق بھی محبوب کے ظلم و ستم اٹھاتا ہے لیکن اس پر شکوہ و شکایت لب پر نہیں لاتا :۔

عشق و وفا میں جان گنوائیں بلا سے ہم
شکوہ کریں نہ حسن ستم آشنا سے ہم

وہ امید کی کرن دل میں جلائے عشق کے راستے پر گامزن رہتا ہے ۔

سرمایہ امید کے بل پر خدا گواہ
کرنے چلے ہیں عشق کسی بے وفا سے ہم

محبوب خواہ جفا ہی کیوں نہ کرتا رہے عاشق وفا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا ۔

تم کو قسم ہے باز نہ آنا جفا سے تم
پھیریں گے منہ نہ جذبۂ ذوق وفا سے ہم

لیکن عشق کے راستے میں اتنی تکالیف اور پریشانیاں ہیں کہ انہیں برداشت کرتے کرتے عاشق قضا کے قریب پہنچ جاتا ہے اور یہ کہہ اٹھتا ہے :۔

حالات عشق حضرت زیبا نہ پوچھئے
اک کھیل تھا جو کھیل رہے تھے قضا سے ہم

اور کبھی یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ

عشق ہے دشمن جاں ، عشق ہے آفت زیبا
عشق کو آگ سمجھ ، زہر سمجھ ، سانپ سمجھ

لیکن ان تمام کیفیات سے بالا تر وہ مقام ہے جہاں عشق مقصود بالذات عمل بن جاتا ہے،
ان کے ہاں عشق اعلیٰ ترین تصور حیات کا منبع بھی ہے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی کوشش بھی۔

درد مند عشق نے کروٹ جہاں بدلی کوئی
حشر برپا ہو گیا اک انقلاب آ ہی گیا

شاعر کے نزدیک عشق ہی سے دنیا کا کارخانہ روشن ہے اور کائنات کی تمام رونق اور رنگینی عشق کے دم سے ہے اور جسے عشق کی دولت حاصل ہو جائے وہ پھر دنیا کی دوسری نعمتوں کو لائق تحسین نہیں سمجھتا ۔ اس کیلئے محبت کا بخشا ہوا درد و غم بھی ایک انمول خزانے سے کم نہیں جو اسے دوسرے غموں کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دیتا ۔

کسی خوشی کی اسے آرزو نہیں رہتی
خدا جسے بھی غم عشق ساز گار کرے

ان کی غزلوں میں عاشق و معشوق کی نفسیات اور کیفیات کا اظہار بھی نہایت موثر انداز سے ملتا ہے :۔

حسن کو دیکھ کے ہم ہوش ربا کہتے ہیں
یہ خطا وہ ہے جسے عین خطا کہتے ہیں
عشق آتش گہر سے پیدا دھواں ہوتا نہیں
یہ زمیں وہ ہے کہ جس پر آسماں ہوتا نہیں
حسن کے حسن ستم کا لطف ہم سے پوچھئیے
امتحاں ہوتا ہے لیکن امتحاں ہوتا نہیں

نہیں معلوم حسن و عشق میں کل کیسی باتیں تھیں

کوئی سن کر پریشاں تھا کوئی کہہ کر پشیماں تھا

حسن کہتا ہے کہ برہم ہوں ، غضبناک ہوں میں

عشق کہتا ہے کہ گستاخ ہوں ، بیباک ہوں میں

معاملہ ہے عجب حسن کے اشاروں کا

کہ ہر اشارے نے لوٹا سکون ہزاروں کا

زیبا ماروی کی غزل صحیح رنگ تغزل کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ درحقیقت تغزل ہی کی وجہ سے غزل معراج کمال کو پہنچتی ہے ۔ سوز و گداز ، شیرینی و سلاست ، بیان کی سادگی ، نرم لب و لہجہ جیسی خصوصیات جو تغزل کی جان ہیں ان کے یہاں دلکشی اور معتدل انداز سے بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں ۔

وہ نہیں ، اس کا تصور ہی سہی

کسی صورت سے مرے پاس تو ہے

حشر میں حشر ہمارا کچھ ہو

ان سے ملنے کی مگر آس تو ہے

عشق کی انتہائی حالت یعنی جنون کے عالم کی کیفیت کو شاعر نے خوبصورت اور منفرد انداز میں کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

تشویش و فکر و غور محبت میں کیا ہمیں

تشویش و فکر و غور سے بے غور ہو گئے

یہ ہے جہان محبت یہ ہے مقام جنوں

یہاں نہیں ہے کام کوئی ہوشیاری کا

انہوں نے عشق کی اس کیفیت کو بھی نہایت موثر انداز سے بیان کیا ہے کہ اگر محبوب ساتھ ہو تو دنیا کی ہر چیز حسین اور رنگین معلوم ہوتی ہے اور اگر محبوب نہ ہو تو ہر حسین و رنگین چیز بھی حسن سے عاری نظر آتی ہے -

ترے بغیر اک اجڑا دیار ہوتا ہے

بہار میں بھی چمن بے بہار ہوتا ہے

ان کی غزل کا عاشق منفرد خصوصیات رکھنے کے ساتھ ساتھ غزل کے روایتی عاشق کی سی نیاز مندی بھی دکھاتا ہے :-

دل باوفا کو نہیں گلا، جو کہا گیا اسے بے وفا

اگر آپ کا یہ خیال ہے تو بجا، درست یونہیں سہی

دم بے خودی جو ہوا گذر تو جھکایا میں نے یہ کہہ کے سر

نہ ہو قید سجدۂ آستاں مگر امتحان جبیں سہی

وہ جو کہتے ہیں تو مر جائیں گے ہم

اب حیات جاودانی کچھ نہیں

محبوب کا ستم بھی عاشق کیلئے کرم سے کم نہیں - کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ محبوب جفائیں بھی اسی پر کرتا ہے جس کے ساتھ اس کا تعلق خاطر ہو - اس لیے عاشق چاہتا ہے کہ وہ تعلق ٹوٹنے نہ پائے اور محبوب کسی شکل میں سہی، اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کرے - چنانچہ وہ اس بات کو بھی اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہے -

وہ کرم ہو کہ ستم چاہنے والوں کے لیے

فطرتاً حسن کی ایک ایک ادا پیاری ہے

قسم خدا کی کسے دل پہ بار ہوتا ہے

ترا ستم بھی کرم میں شمار ہوتا ہے

محبوب کی بے نیازی کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ۔

کہنے لگے وہ سن کے مرے دل کی داستاں

دکھ درد زندگی میں لگے ہیں سبھی کے ساتھ

کوئی رہا تباہ محبت میں رات دن

تم نے یہ کہہ دیا کہ ہمیں کچھ خبر نہیں

عاشق کیلئے انتظار میں بھی ایک لذت کا سامان موجود ہوتا ہے جو محبت کی عطا ہے۔

بڑی لطیف اذیت ، بڑے مزے کی خلش

عجیب چیز ترا انتظار ہوتا ہے۔۔۔۔

اور پھر جب محبوب کی ایک نظر عاشق پر پڑتی ہے تو وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے ۔ دنیا بدل جاتی ہے ۔ دل کو کسی پل قرار نہیں آتا ۔

ایک نگاہ یار تھی ایک ادائے یار تھی

ہم نے حواس کھو دیے دل نہ رہا شعور میں

ان سے نظر ملی تھی کہ ہم اور ہو گئے

جینے کے طور عشق میں بے طور ہو گئے

دل کے معاملات میں کیوں فرق پڑ گیا

آپ اور ہو گئے ہیں کہ ہم اور ہو گئے

دل پر تری نظروں کے وہ احسان ہوئے ہیں

رہ رہ کے تڑپ اٹھنے کے سامان ہوئے ہیں

وہ صرف اسی کی باتیں کرنا چاہتا ہے، اسی کی باتیں سننا چاہتا ہے ، اس کے سوا کسی دوسرے معاملات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ۔

کچھ ان کا ذکر خیر ہو، کچھ دل کا تذکرہ

بہلیں گے اب نہ اور کسی داستاں سے ہم

جلوۂ گل فضول ہے دعوت گل فضول ہے

ان کے بغیر میکشی و موسم بادہ بار کیا

وہ نہ ستائیں چاہ میں آئیں مری نگاہ میں

صبح کی راہ کیوں تکوں ، شام کا انتظار کیا

زیبا ناروی کی غزل کا عاشق چپ چاپ ستم برداشت کرنے کا عادی ہے ۔ وہ آہ فریاد یا گریہ وبکالہ نہیں کرنا چاہتا کہ اس سے محبت کی رسوائی کا خطرہ ہے ۔

محبت میں غرض کیا آنسوؤں سے دل کے داغوں کو

یہ وہ گل ہیں رہین گریۂ شبنم نہیں ہوں گے

جو وہ پوچھیں گے تو چپ چاپ کچھ آنسو بہا دوں گا

بیان دل محبت میں با انداز فغاں کیوں ہو

البتہ وہ تنہائی میں آنسو بہا کر اپنے دل کا دکھ درد کم کر لیتا ہے ۔

اکیلے بیٹھ کے آنسو بہا لیے ہم نے
سکوت شب میں بیاں دل کی واردات ہوئی

تم آئے یاد تو لہرا گئے ہیں گرم گرم آنسو
مری آنکھوں میں فوراً آ گئے ہیں گرم گرم آنسو

لیکن اسے اپنی محبت پر کامل یقین ہے کہ محبوب اس کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا ۔

ہم کو زیبا ہے محبت میں یقین کامل
وہ ہمارا تھا ہمارا ہے، ہمارا ہو گا

عاشق کی وفا کا اثر محبوب پر بھی ہوتا ہے اور اس کے دل میں عاشق کیلئے ہمدردی کے جذبات جنم لیتے ہیں :-

کیا کہئے محبت کا تقاضا ہی یہی تھا
اک میں ہی نہیں ، وہ بھی پریشان ہوئے ہیں

ہر چند کہ شکوہ نہ کیا ہم نے ستم کا
لیکن وہ بہت دل میں پشیماں ہوئے ہیں

ہم کو وہ پس ترک ملاقات ملے جب
شرمائے ہیں جھجھکے ہیں ، پشیماں ہوئے ہیں

جفا کے بعد آخر کس لیے اتنی پشیمانی
یہ میں نے کب کہا تم سے کہ تم داد وفا دینا

ان کے نزدیک عشق کی زندگی ابدی ہے۔

حیات شوق ہے زیبا حیات لافانی

مذاق عشق و وفا رنگ مستعار نہیں

فارسی اور اردو غزل تصوف کی گود میں پلی بڑھی ہے ۔ تصوف کی یہ روایت اتنی قدیم اور قوی ہے کہ خالصتہً مجاز کی شاعری کرنے والے بھی حقیقت کی جستجو میں لگے رہتے ہیں ۔ زیبا ماروی کی غزل میں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کے بھی جلوے بکھرے ہوئے ہیں ۔ وحدت الوجود کا تصور یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ خدا ہی کا پرتو ہے ۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ باقی جو ہے ہمارا وہم ہے ۔ فریب نظر ہے ۔

تصوف کی ان دلآویز کارفرمائیوں کی ایک جھلک زیبا کے ہاں دیکھئے ۔

ہمیں تو ذرے ذرے میں ترا جلوہ نظر آیا

بہر صورت نکل آئی ترے دیدار کی صورت

اک بندہ آزاد حقیقت میں ہے زیبا

پابند غم کعبہ و بت خانہ کہاں ہے

ہو کر حرم و دیر سے بیگانہ کہاں ہے

معلوم نہیں اب ترا دیوانہ کہاں ہے

ہمیں کہاں یہ خبر بے خودی کے عالم میں

خدا سے دور ہیں ہم یا خدا سے دور نہیں

مطلوب مجھے پھر وہی جلوے ہیں ازل کے

جی بھر کے نہ دیکھا تری محفل کا تماشہ

جلال تجلی نے اوسان کھوئے نگاہوں نے دیدار سے ہاتھ دھوئے

یہ کیا دید ان کی یہ کیا سیر جلوہ نہ دل کو تسلی نہ آنکھوں کو سیری

زیبا محض روایتی طور پر تصوف کے مضامین نہیں باندھتے تھے بلکہ جیسا کہ باب اول میں بتایا گیا ہے کہ وہ سلسلہ چشتیہ قادریہ سے متعلق تھے اور ایک صاحب خلافت صوفی شاہ محمد عبدالشکور کے مرید تھے ۔ اپنے پیرو مرشد کے زیر اثر صوفیانہ خیالات و معاملات سے دلچسپی رکھتے تھے اور معرفت الہی کیلئے سلوک کی منزلوں پر گامزن تھے ۔ تصوف کے سلسلے میں وہ اس چیز کے قائل نظر آتے ہیں کہ ایمان کی بنیاد وفاداری پر ہے اور کسی بھی عقیدے کے ساتھ وفاداری سے منسلک ہو جانے پر انسان کفر و ایمان سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔

میری دنیا نور و ظلمت کی حدوں سے دور ہے

بے خودی نے بے نیاز کفر و ایماں کر دیا

اسی قسم کا ایک شعر غالب نے بھی کہا تھا کہ

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

زیبا صوفی منش انسان تھے ۔ لہذا ان کی نگاہ معرفت آشنا تھی ۔ حقائق بیان کرنے پر آتے تو عرفان و معرفت کی تجلیاں بکھیر دیتے ۔ ان کے تصوفانہ اشعار سے ان کی قناعت اور سادگی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہ وہ راضی بہ رضا تھے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر ۔۔

مجھ کو زیبا نہیں دنیا میں غم جاہ و حشم

اک قلندر کو غم جاہ و حشم کیا ہو گا

انہیں دنیا فریب کاریوں کا مقام نظر آتی ہے ۔ جہاں ہر طرف دھوکا ہی دھوکا ہے ۔

کوئی برہمن ، کوئی مسلماں ، کوئی نمازی ، کوئی پجاری

طرح طرح کے فریب کھائے نیاز مندوں نے آستاں سے

بھرا ہے ہم نے وہ رنگ حسرت چمن میں پھولوں میں آشیاں میں

لہو ٹپکتا رہے گا برسوں چمن سے پھولوں سے آشیاں سے

ادھر نہ دیکھوں ، ادھر نہ دیکھوں بتاؤ زیبا کدھر نہ دیکھوں

فریب جلوہ کہاں نہیں ہے نظر بچاؤں کہاں کہاں سے

تصوف کے معاملات میں تصور فنا کو خاص دخل ہے صوفی اپنی ہستی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ وہ سمندر میں مل کر سمندر ہو جانا چاہتا ہے ۔ زیبا کے ہاں بھی اس کا احساس ملتا ہے ۔

صبا بن کر انہیں ڈھونڈو چمن میں

ذرا دیکھو گلوں کے پیرہن کو

ہم تو کیا پہنچیں گے اے زیبا حریم ناز تک

یہ وہ منزل ہے جہاں آواز بھی جاتی نہیں

دنیا کی بے ثباتی اور تصور فنا کا تعلق تصوف کی تعلیمات سے بن جاتا ہے جو زیبا ناروی کے اشعار میں موجود ہیں ۔

یارب یہ کیا مقام ہے دنیائے آرزو

ہم کس طلسم خواب پریشاں میں آ گئے

الگ سب سے ہے خواب ہستی کا منظر نہ آرام حاصل نہ راحت میسر

ادھر موت ہر وقت سر پر کھڑی ہے ، ادھر قبر تیار آغوش کھولے

دم سیر گلشن کرے غور دنیا نہ کچھ اور عالم نہ کچھ اور دنیا

خزاں کی فضا میں گلوں کی ادا میں حکایت ہے میری کہانی ہے تیری

روایت کا ایک اہم حصہ رندانہ شاعری بھی ہے اور زیبا نے بھی ایسے اشعار سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے ۔

صراحی ، جام ، شیشہ، بادہ ، پیمانہ، سبو ، ساقی

سبھی کچھ مے کدے میں ہو گا ، لیکن ہم نہیں ہوں گے

جام لبریز نہیں مانگ رہا اے ساقی

گھونٹ دو گھونٹ ہی مجھ تشنہ دہن تک پہنچے

مے کشی پر مجھے ساقی نے جو مجبور کیا

چاند ، سورج مرے پینے کے پیالے ہوں گے

زہر بھی پینا تمہارے ہاتھ سے منظور ہے

تم پلاؤ تو پئیں ، یوں ہم سے پی جاتی نہیں

وہ جلوہ معتبر ہے نظر معتبر نہیں

شائستہ جمال ہماری نظر نہیں

یہ صاف کہہ رہا ہے تماشائے رنگ و بو

جلوے تو ہر طرف ہیں مذاق نظر نہیں

اس بے خودی کی شان پہ قربان جائیے

ان کی تو ہے خبر ہمیں اپنی خبر نہیں

زیبا ناروی کی غزل داخلیت کا خوبصورت نمونہ ہے ۔ انہوں نے اپنے دل پر گزرنے والی واردات کو محسوس کیا اور اسے عام اور سادہ الفاظ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے ۔ بہت سے اشعار میں ان کی ذات کے مختلف پہلو ابھرے ہیں ۔ ان کے جذبات اس قدر قدرتی ، طبعی اور فطری ہیں کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا اس کے دل کی بات کہی جا رہی ہے۔ ان کے اشعار چونکہ دل سے نکلتے ہیں اس لیے سننے والے کا دل موہ لیتے ہیں ۔ ان کے اشعار میں ہر صاحب ذوق کو اپنے ہی دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اور ان کا ہر شعر ہمارے احساسات اور جذبات کی پکار بن جاتا ہے ۔

درد کی دل میں کمی مجھ کو گوارا بھی نہیں

ذکر درماں بھی نہیں ضبط کا یارا بھی نہیں

زندگی شوق خوشی کیف مسرت آرام

ہم کو دنیا میں بغیر ان کے گوارا بھی نہیں

سچ ہے کہ زمانے میں نہیں کوئی کسی کا

ہم نے بھی بہت جانچے یاروں کیلئے ہیں

ہر شاعر کی شاعری پر اس کی شخصیت کی تھوڑی بہت چھاپ ہوتی ہے جو اس کے کلام کو انفرادیت بخشتی ہے ۔ زیبا کی غزل کے مطالعے سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ وہ غزل میں اپنی ذات کے مختلف پہلو ابھارتے ہیں ۔ اپنی سادگی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ کہتے ہیں ۔

دنیا میں چشم غور سے زیبا کو جانچئے
ہوتے ہیں ایسے خاک نشیں کم بہت ہی کم

اپنے استاد نوح ناروی کی یاد میں سوگواری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ۔

جناب نوح کا صدمہ رلائے گا لہو دائم
غم استاد میں آنسو ہمارے کم نہیں ہوں گے

انہیں زندگی میں جن محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا ، ان کی شاعری میں اس کا عکس جھلکتا ہے ۔ زیبا کے بعض اشعار دکھ اور کسک کے آئینہ دار ہیں لیکن یہ محض ذاتی دکھ نہیں بلکہ اس کا اطلاق ہم عام انسانوں پر بھی کر سکتے ہیں ۔

چار تنکوں کا سہارا تھا گلستاں میں مگر
آتش گل نے انہیں آتش بداماں کر دیا

دیکھا بہار نے یہ مجھے کس نظر کے ساتھ
تنکے بھی آشیاں کے اڑے بال و پر کے ساتھ

روایت کو نبھانے کے ساتھ ساتھ زیبا نے اپنے زمانے کے حالات اور اخلاقی و سماجی شعور کو بھی اپنی غزل میں جگہ دی ہے ۔ اس طرح ایک تو ان کی غزل قدیم وجدید کا حسین امتزاج بن گئی ہے اور دوسرے غزل کے دامن میں وسعت پیدا ہو گئی ہے ۔ روایت کے زندہ عناصر کو قائم رکھنے

کے علاوہ انہوں نے اپنی انفرادیت بھی قائم کی ہے ۔ اور زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان موضوعات کو غزل جیسی لطیف صنف سخن میں اس موثر پیرائے میں پیش کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا ۔

اسی طرح کوئی بھی شاعر اپنے ماحول سے ہٹ کر شاعری نہیں کر سکتا ۔ اس کی تخلیقات پر گرد و پیش کے اثرات ضرور مرتسم ہوتے ہیں ۔ اس لیے وہ ماحول کے پیدا کردہ اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنے مزاج کی مناسبت سے ضروریات وقت کے مطابق بھی شاعری کرتا ہے ۔ شاعر اسی ماحول کا ایک فرد ہوتا ہے اور وہ ان حالات و واقعات کو اپنی شاعری کے روپ میں پیش کرکے انہیں حیات دوام کا ایک حصہ بنا دیتا ہے ۔ زیبا ناروی نے بھی اپنے زمانے کے حالات کو بیان کیا ہے ، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں غم عشق کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا ذکر بھی ملتا ہے ۔

نہ دوستوں کے فریب رنگیں ، نہ دشمنی دوستوں سے زیبا
وہ اپنے حق میں یہ روگ پالے جسے ہو فرصت غم جہاں سے

دنیا کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ یہاں مساوات نہیں ہے، لوگ دوہری ذہنیت کے مالک ہیں اور یہ چیز انہیں افسردہ کر دیتی ہے ۔

ایک طرف زیبا جہنم ، ایک طرف زیبا بہشت
رخ ہیں دو دنیا کے، دنیا دو رخی تصویر ہے

عجب طرفہ تماشا ہے ہم انسانوں کی بستی بھی
کہیں آنکھیں لہو روئیں ،کہیں گردش میں جام آیا

دنیا کی دو رنگی کیا کہیے ہم دھوکے میں لائے جاتے ہیں

کچھ نقشے بنائے جاتے ہیں کچھ نقشے مٹائے جاتے ہیں

زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

مستقبل حیات سے واقف بشر نہیں

کل کی خبر تو دور ہے پل کی خبر نہیں

اس کے علاوہ موجودہ زمانے میں انہیں قحط الرجال کا غم ستاتا ہے ۔ کہ اب پہلے سے لوگ پیدا نہیں ہوتے، حق اور باطل کی تمیز کرنے کا لوگوں میں شعور نہیں رہا ۔

زمانے میں وہ اب حق بین بشر پیدا نہیں ہوتے

تماشے آج بھی ہیں دیدہ ور پیدا نہیں ہوتے

انہوں نے اپنی غزلیات میں سیاسی و سماجی شعور کو جگہ دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ دور منافقت کا آئینہ دار ہے ، ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ ہے ۔

باغباں نے ہمیں گل گشت سے کیا روک لیا

بات تو جب ہے کہ گل چیں نہ چمن تک پہنچے

بس کے قربان اس انداز چمن بندی پر

پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی چمن تک پہنچے

لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئے گی

خار بھی ہو گئے گل پوش تو پھر کیا ہو گا

آئیں وہ بہار گلشن پھر بھرتی ہے صبا ٹھنڈی سانسیں

غنچوں کا چٹکنا کہتا ہے پھر کوئی چمن کو لوٹے گا

ہجرت کا واقعہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے ۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس میں پورا پاکستان دریائے آتش و خوں سے گزر کر ایک نئی منزل پر آ گیا تھا ۔ ویسے تو مختلف شاعر اس تجربے سے متاثر ہوئے ۔ خاص طور پر ناصر کاظمی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا ۔ تقسیم ہند پر بے حد فسادات برپا ہوئے ، قتل و غارت گری شروع ہوئی ، مکان جلائے گئے ، معصوم بچوں کو والدین کے سامنے قتل کیا گیا ، ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی ۔ چنانچہ ناصر کے اشعار کا مزاج بنیادی طور پر المیہ اور درد ناک ہے ۔ درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے ۔ 1947ء میں ان کے ماحول کو جس آشوب قیامت سے دو چار ہونا پڑا ، ناصر نے اس کی بڑی ہی بھر پور ترجمانی کی ہے ، چند اشعار دیکھئے ۔

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار

بس اے دور زماں دیکھا نہ جائے

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم

وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ

یہاں جو حادثے کل ہو گئے

شہر در شہر گھر جلائے گئے

یوں بھی جشن طرب منائے گئے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

زیبا ناروی بھی حساس دل کے مالک تھے - چنانچہ ان پر بھی ھجرت کے اثرات مرتب ہوئے - هندوستان چھوڑنے پر ان کے دل پر جو کچھ گزری ، جس طرح وہ اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچے، اس کے علاوہ عام لوگوں کو جن مشکلات اور قربانیوں سے دو چار ہونا پڑا ، اس کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں -

چمن کے خوب انقلاب دیکھے بہار بڑھتی تپ خزاں سے
کبھی لٹے ہم اس آشیاں میں ، کبھی چھٹے ہم اس آشیاں سے
اٹھا سکے ہم نہ کوئی تنکا ، الجھ سکے ہم نہ باغباں سے
بس ایک تصویر آشیاں کی نظر میں لائے ہیں بوستاں سے
غم تمنا ، خیال ہستی ، نشاط دنیا ، ملال پستی
نفس نفس کو مقابلہ ہے قدم قدم پر اک امتحاں سے
روز افزوں اپنے دل میں سوز غم دیکھا کئے
گھر ہمارا جل رہا تھا اور ہم دیکھا کئے
رونق گلشن کہاں ، تقسیم ہو کر رہ گئے
سب چراغ آشیاں ، تقسیم ہو کر رہ گئے

زیبا ناروی کا کلام بہت بے ساختہ اور تصنع و آورد سے پاک ھے ۔ وہ نازک سے نازک مضمون کو نہایت صفائی سے بیان کر دیتے ھیں ۔ سہل ممتنع اور روزمرہ کی زبان کا استعمال ان کے ھاں نمایاں نظر آتا ھے ۔ ان کے کلام میں نثر کا انداز خاصا زیادہ ھے ۔ اگرچہ ان کے ھاں زیادہ گہری فکر اور تخیل کی بلند پروازی نظر نہیں آتی ، بلکہ زبان و بیان اور شعر کے ظاھری لوازم پر توجہ زیادہ ھے ۔ البتہ جذبوں کا اظہار پھر بھی کہیں کہیں سچائی کا حامل ھے ۔

وہ ہم کو بلائیں تو چلے جاتے ھیں ہم بھی
محفل میں بغیر ان کے بلائے نہیں جاتے

جنوں کے زائچے میں ایسے کچھ خانے بھی آئیں گے
مری دیوانگی کی زد میں فرزانے بھی آئیں گے

عشق کی راہ میں بادیدہ تر جاتا ھوں
ایک دریا ھے کہ میں جس سے گزر جاتا ھوں

کانٹوں پہ اگر ھاتھ بڑھائے نہیں جاتے
دامن میں ترے پھول بھی آئے نہیں جاتے

معاملہ بندی کلاسیکی شاعری کی ایک اھم خصوصیت ھے اور پھر داغ کی روایت کا بنیادی حصہ ھے ۔ زیبا ناروی کا کلام معاملہ بندی کے اشعار سے سجا ھوا ھے ۔ انہوں نے محبت کے جذبات اور اس میں در پیش مختلف معاملات کو دلکش انداز سے اپنی غزل کی زینت بنایا ھے ۔

معاملات محبت کا بس خدا حافظ
وفا کے پاس نہیں وہ ، جفا سے دور نہیں

قریب ہو کے وہ ہم سے جدا ہوئے زیبا

حیات اب غم بے انتہا سے دور نہیں

برسوں یہ سلسلہ رہا ملنے سے پیشتر

وہ دیکھتے تھے مجھ کو انہیں دیکھتا تھا میں

ظلم و ستم گوارا ، منظور ہیں جفائیں

وہ سامنے تو آئیں ، آنکھیں ذرا ملائیں

اک دن ہنسی ہنسی میں آنسو نکل نہ آئیں

کچھ سوچ کر سمجھ کر غم دل کو گدگدائیں

حاضر ہے نقد جاں بھی اس بے وفا کی خاطر

مر جائیں ہم بلا سے زندہ رہیں وفائیں

بے دار ہو چلی ہے دیوانگی ہماری

وہ اور مسکرائیں ، وہ اور مسکرائیں

وہ سنتے اور میں کہتا ، وہ کہتے اور میں سنتا

دلوں کے حال کھل جاتے جو باہم گفتگو ہوتی

زیبا ناروی کے کلام میں شوخی کے بھی نمونے ملتے ہیں ، لیکن جس قسم کی شوخی داغ کے مزاج میں تھی ، ویسی شوخی ان کے ہاں نظر نہیں آتی ۔ کیونکہ جن گلیوں میں داغ پلا بڑھا ، وہ انہیں نصیب نہیں ہوئی ۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس دبستان سے منسلک ہونے کے باعث زیبا کے ہاں بھی یہ چیز نظر آجاتی ہے ۔

بحر الفت میں نہ روکیں مجھے ساحل والے

بچ کے طوفان سے نکل جاؤں گا پیراک ہوں میں

نقد دل چھین کے پہلو سے ہوا وہ چمپت

جیب خالی ہے مری جیب میں اب کچھ بھی نہیں

اتفاقاً تری کوچے میں نکل آیا ہوں

اور میرے ادھر آنے کا سبب کچھ بھی نہیں

کہا جو میں نے اداؤں پہ دل نثار ہو کب ؟

زبان حال سے بولی نگاہ یار ۔ " ابھی" !

ادھر تو آؤ نچھاور کروں گا میں تم پر

گلوں سے چھین کے لایا ہوں ہر بہار ابھی

وہ بے نقاب سر شام ادھر جو آ نکلے

اندھیری رات ہماری بھی چاند رات ہوئی

رہنے کو وہ مرے دل ویراں میں آ گئے

یہ شان یوسفی ہے کہ زنداں میں آ گئے

انگڑائی ان کی مجھ پہ یہ احسان کر گئی

جتنے تنے وہ کھنچ کے رگ جاں میں آ گئے

اس شوخ دل آزاد سے توبہ میری توبہ

باقی نہ رہی دل میں کوئی بوند لہو کی

اس دیدہ خوں بار سے توبہ میری توبہ

یاد رکھنا وفا کے وعدے کو

ہاتھ پر ہاتھ تم نے مارا ہے

زیبا ناروی کی غزلوں کے بغور مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ موصوف عام اور مبتذل جذبات و احساسات کے شاعر نہیں ہیں - بلکہ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں تفکر کی لہر بھی دکھائی دیتی ہے - غموں کے ساتھ ٹکرانے اور چیزوں کے بارے میں سوچ کا عنصر ملتا ہے - جس سے ان کی انفرادیت واضح ہوتی ہے - زیبا کے ہاں محبت میں یا دیگر معاملات زندگی میں واپسی کا تصور نہیں ہے -

کشتی بھنور میں لا کر لازم ہے ڈوب جانا

ہم سے تو یہ نہ ہو گا ساحل پہ خاک اڑائیں

دل لگانے والے ہوتے ہیں کچھ ایسے زندہ دل

زندگی جائے تو جائے دل لگی جاتی نہیں

پڑیں نہ اس پہ نگاہیں کسی قلندر کی

ہوا و حرص کا جو آدمی غلام رہا

گرداب میں صدمے جھیلیں گے ہم موج بلا سے کھیلیں گے

کیا خاک دھرا ہے ساحل پر کیوں خاک اڑائیں ساحل کی

زیبا ناروی انسانی عظمت کے قائل ہیں اور اس کی بہترین مثال ان کی شاعری ہے - انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس کی وسعتوں کو بیان کرتے ہیں - دنیا کی رنگینی اور رونق انسان ہی کیلئے ہے - وہ کائنات کی تمام قوتوں کو تسخیر کر سکتا ہے - اس کا مرتبہ بہت بلند ہے-

وہ ایک مٹھی غبار ہوں میں بلند رتبے ہیں کل جہاں سے
قدم کے نیچے زمیں دبائے خطاب کرتا ہوں آسماں سے
شکستہ دل ہوں مگر عرش کو ہلا دونگا
عطا کیا ہے خدا نے وہ اختیار مجھے
خلاق خلق نے مجھے انساں بنا دیا
یعنی کتاب دھر کا عنواں بنا دیا

فطرت نگاری یا منظر نگاری شاعری کا ایک اہم حصہ ہے اور اکثر شاعر فطرت کے خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں ۔ فطرت کی عکاسی کی دو صورتیں ہیں ۔ پہلی انسانی داخلی فطرت ، یعنی شاعر اپنے جذبات و احساسات اور دل کے تاثرات بیان کرتا ہے ۔ وہ بھی فطرت نگاری ہے ۔ دوسری خارج میں نظر آنے والی فطرت ، اسے محاکات بھی کہتے ہیں اور شبلی نے تخیل کے ساتھ ساتھ محاکات کو بھی شاعری کا بنیادی عنصر بتایا ہے ۔ اس کے نمونے زیبا کے ہاں بہت ہیں ۔

جو دیکھی گرمئی خون جگر تو ہو چلے پانی
بالفاظ دگر شرما گئے ہیں گرم گرم آنسو
جدھر دیکھو رواں ہے ایک دریا آگ پانی کا
محبت میں قیامت ڈھا گئے ہیں گرم گرم آنسو
وہ مسکرائے مجھے دیکھا پھیر لیں آنکھیں
تباہیوں کا بڑے لطف سے پیام آیا

زیبا ناروی کی غزلیات میں فطرت کے حسین اور دلکش مناظر نظر آتے ہیں ۔ وہ پھول شبنم، باغ ، بہار کا ذکر کرتے ہیں ، آسمان ، ستارے ، بادل کے الفاظ لاتے ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ان لوازمات سے اپنی شاعری کو رنگین کیا ہے ۔

ستارے جھلملا کر کہہ رہے ہیں
شب غم دل پہ جو آفت رہی ہے
حسن فطرت ہے دامن گل پر
اشک شبنم کو اور کیا کہئے

دنیا میں غموں اور خوشیوں کے ساتھ ساتھ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فطرت کے تلازمات سے کام لیتے ہیں ۔

عجیب تنظیم گلشن ہو رہی ہے
کلی ہنستی ہے، شبنم رو رہی ہے

اسی قسم کا شعر اقبال نے بھی کہا تھا ؎

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
بولی شبنم گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

شاعری کے مطالعے میں تمثال کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے " وہ بصری یا سمعی تمثالیں جو کسی زبان کے ہر لفظ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ، عام بول چال کے باعث بالعموم دھندلا جاتی ہیں ۔ شاعر ان تصویروں کو پھر سے زندہ کرتا ہے ۔

سب کہہ رہے ہیں وقت سحر آفتاب ہے
میں کہہ رہا ہوں ان کا ابھرتا شباب ہے

شرر وہ جبیں نہیں عرق انفعال سے

شبنم کی انجمن میں نہاں آفتاب ہے

دامن گل پہ یہ کس ڈھب کے سجے ہیں موتی

میرے آنسو کہیں شبنم نہ اڑا لائی ہو

میرے تصورات کی دنیا لرز گئی

دیکھا شباب پر جو عروس بہار کو

محاکات شعر کی وہ صنف ہے جس کے ذریعے آنکھوں کے سامنے واقعات کی تصویر اجاگر ہو جاتی ہے ۔ زیبا ناروی کی مصوری کی داد دیجئیے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

نکھرتا آ رہا ہے رنگ آزار محبت کا

اترتی جا رہی ہے آئے دن بیمار کی صورت

دیکھتا کیا ہوں کہ رخصت ہوئے ایام بہار

میں پہنچنے بھی نہ پایا تھا گلستاں کے قریب

ذرا اے چرخ اک برق ستم اور اس طرف ٹوٹے

نہ ہو جب آشیاں گلشن میں ، شاخ آشیاں کیوں ہو

اڑا لے جائے صر صر پھونک دے بجلی خود اڑ جائے

مگر یہ باغ باں ، ظالم عدوئے آشیاں کیوں ہو

بے رونقی نے بڑھ کے بہاریں سمیٹ لیں

کچھ گل فروش جب سے گلستاں میں آ گئے

دیکھے جو دل کے داغ تو آھوں نے رخ کیا
جھونکے ھوا کے بزم چراغاں میں آگئے
دکھانے چاند وہ بھی سامنے بے پردہ آ پہنچے
ھلال عید ھم دیکھیں کہ صورت ماہ تاباں کی
کوئی ھے اور کہ روئے ھیں پھول گلشن میں
یہ کس کے اشکوں کی بارش تمام رات ھوئی

زیبا ناروی کی غزلیں ان کے خلوص فکر کی آئینہ داری بھی کرتی ھیں اور دلی کی ٹکسالی اردو کی مٹھاس ، الفاظ اور محاوروں کی در وبست اور غزل کے قالب میں تصوف کے مضامین عالیہ کو ڈھالنے کی فنکارانہ مشاقی کی مظہر بھی ھیں ۔ انھوں نے نارے کی سرزمین میں پروان چڑھ کر داغ کی زبان میں جو غزل کہی اور جس طرح اسے زندگی کے حقائق کا عکاس بنا کر فکر نو سے ھم آھنگ کیا ھے وہ ان کے معراج فن کی دلیل ھے اور یہ کہا جا سکتا ھے ۔

یہ اس کی دین ھے جسے پروردگار دے

زیبا ناروی میں ھر شاعر کی طرح احساس برتری پایا جاتا ھے ۔ وہ خود کو دوسرے ھم عصر شعراء سے برتر سمجھتے تھے ۔ ان کے اشعار میں شاعرانہ تعلی موجود ھے ۔ اس کی وجہ یہ بھی ھو سکتی ھے کہ انھیں بطور شاعر وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ حقدار تھے ۔ ان کی وہ پہچان نہ ھوئی ، جو ھونا چاھئیے تھی ۔

چنانچہ اس احساس محرومی نے ان میں احساس برتری پیدا کر دیا ۔ انھوں اس بات کا احساس ھے کہ شاعری میں وہ ایک منفرد اسلوب کے حامل ھیں ۔

شعر و سخن میں بے شک زیبا حسن یہ طرفہ تم نے پایا

کوشش آساں ، آساں آساں ، کاوش مشکل مشکل مشکل

شعر و سخن میں کمال حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ یہ ہنر بڑی محنت اور مشقت کے بعد ہاتھ آتا ہے ۔ زیبا نے اپنی ساری زندگی اس کان کے کھودنے میں بسر کی اور تب جا کر وہ اس ہیرے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے جسے شاعری کہتے ہیں ۔

انداز سخن پہ میرے کیا حیرت ہے جہاں کو اے زیبا

یہ حسن بمشکل ہاتھ آیا ، یہ مشق بدقت حاصل کی

انہیں پوری امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ان کے الفاظ کی قدر و قیمت محسوس کی جائے گی ۔ کیونکہ ان کے عام الفاظ بھی معانی سے بھر پور ہوتے ہیں ۔

میرے الفاظ بے معنی بھی زیبا

تلا کرتے ہیں میزان سخن میں

بعد مرنے کے بزم ہستی کیا

میرے دم تک یہ کھیل سارا ہے

لانجائنس نے کسی شاعر کی عظمت کو پرکھنے کیلئے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سے وہ عظمت زبان کو چوتھا درجہ دیتا ہے ۔ اس کے نزدیک اصل کام صحیح انتخاب الفاظ ہے ۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ معمولی اور غیر معمولی دونوں قسم کے الفاظ اپنی مناسب جگہ پر موثر اسلوب کا باعث بنتے ہیں ۔ لیکن لانجائنس لفظوں کے سحر کا قائل ہونے کے باوجود الفاظ کو اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہے ۔ گویا اس کے نزدیک الفاظ اپنے طور پر حسین ہونے کے ساتھ ساتھ معانی و خیال سے وابستہ

ہوتے ہیں ۔ خیال و معنی سے الگ ان کی حیثیت متعین نہیں ہو سکتی ۔ خطابت میں جو عظمت حسن ، قوت ، وزن ، نرمی اور لطافت پیدا ہوتی ہے وہ در اصل الفاظ کے سحر کا ہی نتیجہ ہے۔

لانجائنس کا خیال ہے کہ

" حسین الفاظ خیال کے لیے روشنی کا کام دیتے ہیں " ۔

لیکن وہ الفاظ کے مناسب و موزوں انتخاب کا شدت سے قائل ہے ۔ کوئی لفظ خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، موقع و محل کی مناسبت سے ہی اپنا اثر دکھائے گا ۔ اس کا خیال ہے کہ شاعری کی زبان بول چال کی زبان سے قریب تر ہونی چاہئیے" 1۔

زیبا ناروی کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا کلام لانجائنس کے اس خیال پر پورا اترتا ہے ۔ وہ عام بول چال کے الفاظ کے استعمال کے قائل ہیں۔

حالی نے شاعری کی تیسری شرط " تفحص الفاظ " قرار دی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ :

"شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردّد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کر لے ۔ اس مرحلے کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات

1۔ سجاد باقر رضوی " مغرب کے تنقیدی اصول " مطبع عالیہ 120/5 ٹمپل روڈ لاہور اکتوبر 1971ء

کی ترتیب میں ، لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصے پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آ سکتی ۔ جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعے سے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کرسکتے ہیں ان کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے سے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے ---- اگرچہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے الفاظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے ۔ مگر فرق اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سے جستجو کے بعد اسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پرقانع نہیں ہوتا --- اس بحث کے متعلق چند امور ہیں جن کو فکر شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہئیے اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور اس کو رفع کرنا ۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورتاً اگرچہ نثر سے ممیز ہو مگر معنے اس قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکے" [1]

گویا حالی کے نزدیک ترتیب الفاظ کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے ۔ اس کی بدولت شعر میں

1۔ الطاف حسین حالی " مقدمہ شعر و شاعری " شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوھاری دروازہ لاھور ، 1949ء ، ص 58 ، 59

عمدگی پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی شاعر کی صلاحیت بھی اجاگر ہوتی ہے ۔ اگر ہم زیبا ناروی کی شاعری کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو ان کی غزلوں میں یہ خصوصیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ حسن ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہیں جس سے شعر میں دلکشی اور چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

دیکھ کر محفل میں پروانوں کے پر جلتے رہے
شمع کی لو نے فضائیں لوٹ لیں تنویر کی

یہ سوز و ساز حقیقت وہ سوز و ساز مجاز
چراغ طور ہے دل ، شمع اشک بار نہیں

فضائے گل کدہ دھر ہے فنا بر دوش
بہار ڈھونڈنے والے یہاں بہار نہیں

ڈگمگاتی پھر رہی ہیں حسرتوں کی کشتیاں
کون کہتا ہے کہ دل دریائے بےساحل نہیں

سر جھکائے ان کی صورت دیکھتا رہتا ہوں میں
دل نہیں ہے ، آئینہ ہے ، آئینہ ہے دل نہیں

زیبا ناروی کے کلام کی ایک اہم خصوصیت لفظوں کا الٹ پھیر ہے ۔ جو شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیتا ہے ۔

عالم غور و فکر ہے دنیا
عالم فکر و غور کیا کہئے

پاس ہیں وہ تو دور ہیں ، دور ہیں وہ تو پاس ہیں
فرق یہ کس غضب کا ہے پاس میں اور دور میں

تماشا ہم نے یہ دیکھا وطن میں
چمن کانٹوں میں ہے کانٹے چمن میں

نہ تہہ فلک نہ سر زمیں کوئی بزم خواب حسیں سہی
وہ ہمیں ملے، وہ ملے ہمیں وہ کہیں سہی
غرض امتحان نظر سے ہے کوئی انجمن ہو کہیں سہی
وہ حسیں نہیں یہ حسیں سہی ، یہ حسیں نہیں وہ حسیں سہی

ایسے میں تجھے کیوں کر ان سے ایسے میں بنے پتھر ان سے
خود کام میں وہ خود دار نہیں خود دار ہے دل خود کام نہیں

زیبا ناروی اس لحاظ سے بھی داد و ستائش کے مستحق ہیں کہ فارسی پر کامل دسترس ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی اردو غزلوں کو دقیق نہیں بنایا ، بلکہ ان کی غزلوں کی سلاست اور بلاغت حیرت انگیز بھی ہے اور مسرت بخش بھی -

زمانے پر عنایت ہے کرم ہے مہربانی ہے
یہ آخر تم ہمیں پر بے سبب نامہرباں کیوں ہو

جو دل کی آرزو ہے وہ تم سمجھ رہے ہو
سمجھے نہیں تو سمجھو ہم کس لیے بتائیں

ستایا بھی ہم کو جلایا بھی ہم کو ستا کر جلا کر منایا بھی ہم کو
یہ زیبا عجب دل لگی ہے کسی کی کہیں ہم نے ایسا تماشا نہ دیکھا

جس طرح زیبا ناروی کی غزل کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے ، اسی طرح فنی لحاظ سے

بھی ان کی غزل بہت سی خصوصیات کی حامل ہے -

اردو غزل کی روایت میں رمز و ایماء اور سوز و گداز کو نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے اور تمام شعراء نے انہیں نبھانے کی کوشش کی ہے ، لیکن داغ کے یہاں ان کا اظہار ذرا مختلف انداز سے ہوا ہے اور انہوں نے ظاہری پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی ہے - زیبا ناروی نے بھی اگرچہ داغ کے انداز کو اپنایا ہے لیکن ان کی غزل میں بھی روایتی غزل کی خصوصیات پائی جاتی ہیں -

زیبا ناروی کی غزلوں میں ایک اہم بات ان کی طوالت ہے - ان کی غزلیں عموماً خاصی لمبی ہوتی ہیں - اور بعض اوقات تو اشعار کی تعداد تیس ، بتیس تک بھی پہنچ جاتی ہے - اور جب اتنی طویل غزلیں لکھتے ہیں تو کئی جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض قافیہ ملایا گیا ہے ، لیکن اس سے بھی ان کی الفاظ پر دسترس کا ثبوت ملتا ہے اور قافیہ بندی پر ان کی مہارت ظاہر ہوتی ہے - پھر جس طرح ہماری قدیم کلاسیکی شعری روایت میں دوغزلے سہ غزلے اور چہار غزلے لکھے جاتے تھے ، زیبا نے بھی ان کی پیروی میں ایسا کیا ہے - جس سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے - اس طرح کی مثال ہمارے ہاں جدید شاعری میں فراق گورکھپوری کے ہاں ملتی ہے جب وہ ایک ہی ردیف میں کئی غزلیں کہتے ہیں -

زیبا نے بھی کئی جگہ ایک ردیف میں دو غزلہ کہی ہیں - مثال کے طور پر ایک غزل دیکھئے-

غم دل کے ساتھ اور اجل زندگی کے ساتھ

بے ربط خاص کوئی نہیں ہے کسی کے ساتھ

اب ایسے دور میں ہے محبت کی زندگی

کوئی نہ میرے ساتھ نہ میں ہوں کسی کے ساتھ

ان کا جمال طرفہ تماشا بنا رہا
دل کی لگی بھی بڑھتی گئی دل لگی کے ساتھ

کچھ ہو گی مصلحت کہ ہمارا نہ ساتھ ہو
دل تو قدم قدم پہ رہے گا کسی کے ساتھ

کھاتا رہا فریب زمانے میں آدمی
شیطان سایہ بن کے رہا آدمی کے ساتھ

اسی ردیف میں دوسری غزل دیکھئیے ۔

پھر بہار آئی چلا میں دل خود کام کے ساتھ
پھر پکاریں گے مجھے لوگ نئے نام کے ساتھ

جان بھی جائے گی میری تو بڑے کام کے ساتھ
دم جو آئے گا لبوں پر تو ترے نام کے ساتھ

میرے صیاد نے یہ گھات لگائی ہے نئی
آشیاں بھی نظر آتا ہے مجھے دام کے ساتھ

ظلمت یاس میں قسمت کا ستارہ ڈوبا
بجھ گیا دل بھی مرا شمع سر شام کے ساتھ

ان کی محفل سے بس اٹھ چلیے اب اے حضرت دل
فائدہ کیا جو نکالے گئے الزام کے ساتھ

اردو غزل بنیادی طور پر استعاروں اور علامتوں کا کھیل ہے ۔ ہر شاعر اپنے انفرادی مزاج کے مطابق اپنی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کو استعمال کرتا ہے اور انہیں نئے معنی پہناتا ہے۔ زیبا ناروی نے بھی غزل کی روایتی علامتوں اور استعاروں کو جو کثرت استعمال سے اپنے معنی کھو بیٹھے تھے، نئے معنوں میں استعمال کرکے ایک حیات تازہ بخشی اور اردو غزل کو نئی علامتوں سے مالا مال کیا ۔

ہمارے غم میں شامل کوئی اور آتش بجاں کیوں ہو
بجھا دو انجمن میں شمع کو ، اونچا دھواں کیوں ہو

ذرا اے چرخ آگ برق ستم اور اس طرف ٹوٹے
نہ ہو جب آشیاں گلشن میں شاخ آشیاں کیوں ہو

ایک میرے آشیاں کے دو مخالف ہو گئے
باغباں بد خواہ تھا صیاد بھی جلتا رہا

آئی وہ بہار گلشن پھر بھرتی ہے صبا ٹھنڈی سانسیں
غنچوں کا چٹکنا کہتا ہے پھر کوئی چمن کو لوٹے گا

اے بے خودی یہ کون سی منزل کا قصد ہے
بیگانہ ہو چلے سفر و کارواں سے ہم

ساقی بزم ازل تیری عطا کے صدقے
بادۂ شوق کا سرچشمہ ہے مے خانۂ دل

یہ رنگ گل یہ بہاریں یہ گل کدہ زیبا
فریب خوردۂ نظر کس پر اعتبار کرے

نئی ترکیبوں کے ساتھ اگر فکری سطح بھی بلند ہو تو شاعر اپنے دور میں کامیاب اور آنے والے لوگوں کیلئے مشعل راہ کا کام کرتا ہے ۔ زیبا ناروی کی ترکیبیں اپنے اندر ایک معنویت رکھتی ہیں۔

باغ عالم کی فضا رنگیں طلسم راز ہے
هر طرف بکھری ہوئی روداد حسن و ناز ہے
نالہ و نغمہ ہے مل جل کے تفسیر حیات
اک نوائے ساز ہستی ، پر مری آواز ہے
سوز غم سے کچھ نہ کچھ ہر آدمی جلتا رہا
زندگی بھر یوں چراغ زندگی جلتا رہا

زیبا ناروی نے اپنی شاعری میں انوکھی تشبیہات اور استعارات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ تشبیہہ کے معنی ایک چیز کو کسی مشترک خصوصیت کی بنا پر دوسری چیز کے مشابہ قرار دینا ہیں اور تشبیہہ سے غرض اس پہلی چیز کی کسی صفت ، حالت یا کیفیت کو واضح اور موثر بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے اس سے کلام میں فصاحت اور بلاغت اور تاثیر و خوبی پیدا ہو جاتی ہے ۔

ان کی آنکھوں میں اشک شوق نہیں
میری تقدیر کا ستارا ہے

زیبا ناروی نے تشبیہہ کو نئے انداز سے برتا ہے جس سے غزل میں ایک لطف اور فکر کی بلندی نمایاں ہو گئی ہے ۔ دیکھئیے تشبیہہ کا استعمال کس سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کیا ہے۔

آنکھوں میں جھلملائے ہوئے گم سر شک غم
یہ وہ چراغ تھے جو چراغاں نہ کر سکے

دل کے داغوں کا چمکنا تم شب غم دیکھنا
وقت سے پہلے یہ تارے جگمگائیں کس لیے

کیوں کہیں تل ہے ترے عارض انور کے قریں
جم کے کافر کوئی بیٹھا ہے مسلماں کے قریب

مقدر نے کی ایسی ظلمت پرستی نہ آیا نظر کچھ سر بزم ہستی
مری مضمحل زندگی اس طرح ہے چراغ سحر جس طرح جھلملائے

استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا کے آتے ہیں مگر علم بیان کی اصطلاح میں جب کوئی لفظ اپنے مجازی معنی میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں ۔ شاعر کسی واقعے کی تصویر پیش کرنے کیلئے استعارے کی تخلیق کرتا ہے ، جس سے اس میں حسن آ جاتا ہے ۔

زیبا ناروی کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بروئے کار لایا گیا ہے ۔

یوں گرایا ہے زمانے کی نگاہوں نے مجھے
جیسے میلی سی اک اتری ہوئی پوشاک ہوں میں

بچ کے چلتی ہے ہوائے در جاناں مجھ سے
کشتہ رنج ہوں خاکستر غم ناک ہوں میں

بزم ایجاد میں حاصل ہیں کئی روپ مجھے
کہیں شبنم ہوں ، کہیں شعلہ ، کہیں خاک ہوں میں

ایک اهم وصف جو ان کی غزل گوئی کو امتیازی درجہ دیتا ہے وہ ان کی زبان اور روز مرہ ہے۔ فصحا اپنی معمولی گفتگو میں جس قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں وہی بے تکلفانہ رنگ شاعرانہ انداز کے ساتھ کلام میں بھی برقرار رکھا جائے تو وہ بہت پر لطف اور پر کیف معلوم ہوتا ہے ۔ ورنہ زبان کے اعتبار سے وہ غیر اہم ہو جاتا ہے ۔ داغ نے اس ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور اس کے بعد ان کے شاگردوں میں نوح ناروی نے اس اصول کی پیروی کی مگر زیبا نے اس میں کمال کر دیا ہے ۔

انہوں نے دہلوی یا لکھنوی نہ ہونے کے باوجود زبان کی شاعری کا وہ کمال ظاہر کیا جو بلاشبہ بے مثال ہے ۔ انہوں نے صحت زبان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اسے اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے کہ اس سے زیادہ سلاست دشوار تھی ۔ ان کی زبان ہموار اور دلنشین، انداز بیان فطری و طبعی اور اسلوب ادا بے ساختہ اور برجستہ ہے ۔

سرور جاوداں کی لذتیں حاصل نہیں ہوتیں

مئے الفت میں جب تک زہر غم گھولا نہیں جاتا

کب ان کے سامنے آنسو بہا پائیں مری آنکھیں

یہ وہ بادل ہیں جن سے وقت پر برسا نہیں جاتا

تمہارے حال پر زیبا یہ خاص ان کی عنایت ہے

جہاں میں ہر کسی کو درد دل بخشا نہیں جاتا

نہ ان کی زبان میں کوئی الجھاو ہے نہ طرز ادا میں کوئی پیچیدگی ۔

یہ نہ کہئیے کسی نے لوٹ لیا

دل کو دل کی لگی نے لوٹ لیا

کیوں پریشاں ہیں آپ حضرت دل

کھنٹے کھنٹے کسی نے لوٹ لیا

لٹ گئی زندگی سر منزل

انتہائے خوشی نے لوٹ لیا

زندگی لوٹنے ہم آئے تھے

یا ہمیں زندگی نے لوٹ لیا

انہوں نے پاکیزگی زبان کی روایت کو قائم رکھا اور اسے ہزل و ابتزال سے بچایا۔

ازل سے چاہنے والوں کو یہ جاگیر ملتی ہے

دل اک ٹوٹا ہوا، پھوٹی ہوئی تقدیر ملتی ہے

بس اتنی بات، دیکھا انہیں دل آ گیا ان پر

فسانہ بن گیا یہ مختصر سا حال زار اپنا

میرے ہی لہو سے ہیں عبارت یہ بہاریں

روداد گلستان میں مرا نام رہے گا

محبت میں کچھ ایسا نفسا نفسی کا مقام آیا

نہ تم ہی میرے کام آئے نہ دل ہی میرے کام آیا

کریں گے چارہ فرما کیا، تمہاری ہی ضرورت ہے

نکالو اپنے ہاتھوں سے تمہیں کانٹا مرے دل کا

میں نے تو دل کی بات سے آگاہ کر دیا

اب ان کے التفات پردار و مدار ہے

تم اور یاد آئے جب چاہا بھول جانا

کوشش تو کی بہت کچھ لیکن ذرا نہ بھولے

شاعری کا حسن یہ ہے کہ شاعر کا انداز بیان دلنشین ، سادہ ، رواں ، برجستہ اور شگفتہ ہو ۔ ورنہ خیال کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو، نثما اور ناکارہ بن کر رہ جاتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر انداز بیان میں دلکشی اور جاذبیت ہے تو معمولی سے معمولی خیال بھی دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتا ۔ زیبا ٹاروی کی غزلوں میں یہ خصوصیت وافر مقدار میں موجود ہے ۔ ان کے اشعار سادگی کے باوجود تاثیر رکھتے ہیں ۔

میرا ماتم کیوں کریں پھولوں میں آئیں کس لیے

وہ نصیب دشمناں آنسو بہائیں کس لیے

پوچھنے بیٹھی ہے دنیا کیا رموز عاشقی

ان کے دیوانے بنے ہم کیا بتائیں کس لیے

ماہ و انجم کو چھپا دے ظلمت شب میں کوئی

میرے حال زار پر یہ مسکرائیں کس لیے

ان کی محفل سے اٹھائے جا رہے ہیں اہل دل

ایسے میں دل تھام کر ہم اٹھ نہ جائیں کس لیے

درد کی دل میں کمی مجھ کو گوارا بھی نہیں

ذکر درماں بھی نہیں ضبط کا چارہ بھی نہیں

بیان کی بے تکلفی ، زبان کی صفائی ، چھوٹے چھوٹے مگر مفہوم کے لحاظ سے مکمل ٹکڑوں میں بے حد لطف ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ اشعار کی بندشیں لمبی لمبی بحروں میں فنی خوبیوں کا گنجینہ

ہیں ۔ لیکن حشو و زوائد سے پاک ہیں ۔

یہ اک اک نے جانا یہ اک اک نے مانا یہ تسلیم کرتا ہے سارا زمانہ

وفاداریوں میں ، جفا کاریوں میں ادھر فرد تم ہو، ادھر میں یگانہ

ادھر دیکھ لو طے ہوں یہ سب مراحل بہت دیر سے منتظر ہے مرا دل

اٹھاؤ بھی نظریں ، چلاؤ بھی ناوک ، دکھاؤ صفائی ، اڑاؤ نشانہ

رہا بحر ہستی میں اپنا یہ عالم ، حوادث کے صدمے اٹھاتے رہے ہم

جدھر موج طوفاں کے آثار دیکھے، ادھر ہو گئی کشتی دل روانہ

شاعری کے فن اور زبان کی باریکیوں کو جیسا زیبا ناروی سمجھتے تھے ویسا شاگردان نوح میں سے شائد ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو۔ ان کی شاعری ، زبان اور روزمرہ کی شاعری ہے ۔ جس میں سادگی کے ساتھ گھلاوٹ بھی پائی جاتی ہے ۔

خدا کے سامنے جائیں گے دونوں ساتھ محشر میں

اکیلے تم نہیں ہو گے، اکیلے ہم نہیں ہوں گے

ہمیں پر ان حسینوں نے لگا رکھی ہے پابندی

حضور حسن میں دل ہو گا حاضر، ہم نہیں ہوں گے

اردو زبان کی روانی کی یہ حالت ہے کہ اکثر جگہ نظم و نثر میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہتا ۔ ایک بڑے حسن کار کی پہچان یہ ہے کہ اس کی حسن کاری سے کاوش کے تمام آثار مٹ جائیں ۔ وہ نمونۂ حسن کاری بالکل فطری معلوم ہو ۔ اگر اس کسوٹی پر زیبا ناروی کا کلام پرکھا جائے تو ان کو ایک بڑا فطری شاعر مانے بغیر چارہ ہی نہیں ۔

اساتذہ اردو میر، انیس، مصحفی، آتش، امیر مینائی، ذوق، غالب اور داغ دھلوی نے الفاظ و علامات کو آتش دل سے گزار کر کلام کو پر تاثیر بنایا اور انہیں معنویت سے لبریز کر دیا۔ ان اساتذہ نے زبان کو جو ورثہ عطا کیا ہے اسے نظر انداز کرکے کوئی شخص ارباب شعر و سخن کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا ۔ استاد داغ نے اسی لیے کہا تھا ۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو

کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

چونکہ زندہ زبان جامد و ساکت نہیں ہوتی ۔ اس لیے زیبا ناروی نے دبستان دھلی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اردو شاعری کو نیا رنگ روپ دیا ۔ زبان میں بدرجہ اتم شیرینی ، شگفتگی متانت اور فصاحت کے نوربا بہا دیے ۔ اردو زبان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔:

آساں بھی مشکل بھی عجب اردو ہے

تکمیل فصاحت کا سبب اردو ہے

غزل کے معنی صنف نازک سے باتیں کرنے کے ہیں ۔ چنانچہ اسی لیے غزل میں لطیف نازک احساسات اور جذبات ، رواں اور شیریں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ غزل کا خمیر عشق و محبت کا اظہار ہے ۔ شعرائے دھلی میں مرزا داغ اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ انہوں نے اپنے اسکول کی خصوصیت قائم رکھی اور غزل کا سرشت ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ زیبا ناروی نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور غزل کو نرم و لطیف الفاظ سے مالا مال کیا ۔

ان کی ہر غزل میں سادہ الفاظ کا عجب رکھ رکھاؤ ہے ایک عجیب صوت و نغمگی ہے جیسے کسی پہاڑی سے بہتی ہوئی ندی کا دلآویز گیت ہو ۔ آدمی شعروں کو پڑھتا ہوا الفاظ کی روانی کے ساتھ

خود بھی بہت دور بہہ جاتا ہے ۔

دل میں داغوں سے بہار آنے کے ساماں ہونگے

اسی ویرانے کے ہر رخ پہ گلستاں ہونگے

مضطرب ہو کے ہمیں دیکھنے وہ آئے ہیں

ہم نے سوچا ہے کہ اب ہم نہ پریشاں ہونگے

نصیب دشمناں ان کو ہوا کیا

بھرے بیٹھے ہیں وہ کیوں انجمن میں

ان کے اشعار میں فقروں کا تناسب ، لفظوں کی رعایت اور ان کا تقابل قاری کو دعوت فکر دیتا ہے ۔ شعر کو بار بار پڑھنے اور اس کی لطافت سے بار بار لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے ۔ سلیقہ بیان ، اور طرز ادا ادب کا ضروری عنصر ہے ۔ زیبا ناروی کے کلام میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے ۔

یہ حسن اتفاق ، کہ ان سے ملا تھا میں

یہ اقتضائے وقت کہ مل کر جدا تھا میں

ساقی کی اک نگاہ پڑی تو سنبھل گیا

ورنہ گرا تھا ہاتھ سے ساغر ، چلا تھا میں

جلووں نے ان کے طاقت دیدار چھین لی

اتنی سی بات پر کہ انہیں دیکھتا تھا میں

بازار حسن و عشق کا یہ حادثہ بھی ہے

یوسف جمال آپ تھے لیکن بکا تھا میں

مناسب الفاظ کی مرصع کاری ، چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک عمدہ شعر بنا لینے میں انہیں کمال حاصل تھا ۔ مندرجہ ذیل اشعار مشق سخن کی عظمت کا شاہکار ہیں۔ ان اشعار کو جس محنت سے مرتب کیا گیا ہے اس کا اندازہ ذوق صحیح کے سوا اور کوئی نہ کر سکے گا ۔ الفاظ ہیں کہ نگینے جڑے ہوئے ہیں:۔

نہ کارواں ہے ، نہ جادہ ، نہ گردش منزل
لپٹ کے بیٹھ گئے دامن غبار سے ہم
ترس ترس کے رہی چشم آرزوئے جمال
لرز لرز گئے تسوّدیر انتظار سے ہم
سوال جرم ، تمنا قصور، عشق خطا
گناہگار ہیں ان کے ہر اعتبار سے ہم

زیبا صحت زبان اور سلاست و روانی کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ اور انہوں نے اس سلسلے میں بہت سی پابندیاں اپنے اوپر لازم کو رکھی تھیں جس سے ان کے اشعار کی زبان و بیان میں بڑا نکھار پیدا ہو گیا تھا ۔ انہوں نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ زبان و ادب کی خدمت کی ہے ۔ اردو کو ایک اسلوب اور ایک رنگ دیا ہے ۔ بڑی صفائی اور جلا عطا کی ہے ۔ زبان کی ایسی صفائی اور بیان کی ایسی روانی بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے:۔

جہاں کہیں کوئی دیوانہ اشک بار نہیں
وہ بے بہار ہے گلشن وہاں بہار نہیں

جنوں میں حد جنوں سے گزر گیا کوئی

اب اختیار جنوں پر بھی اختیار نہیں

فسانہ گو اسے شامل نہ کر فسانے میں

مری حیات کا جو لمحہ بے قرار نہیں

ذرا کچھ اور گریباں ہوتا تار ابھی

جنوں نہیں ہے باندازہ بہار ابھی

زمانہ بھولے گا برسوں نہ ان کے ظلم و ستم

رہے گا تذکرہ جبر و اختیار ابھی

احسان دانش زیبا کی زبان و بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:-

" یوں تو حضرت زیبا ناروی بھی زبان و بیان کے معاملے میں معمولی

معلومات کے آدمی نہیں لیکن اب انہیں پیری مریدی کا انہماک زیادہ

ہو گیا اور شعر و ادب پر ان کی پہلی سی استعداد کام کر رہی ہے

نئے رجحانات سے وہ بھی دور ہیں - ہاں زبان کا چٹخارا اور لہجے

کا تیکھا پن ان کا حصہ ہے" 1

زبان کی تو یہ کیفیت ہے کہ زیبا کے گھر کی لونڈی ہے اور الفاظ کی نشست پر اتنا اقتدار

کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لغت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور وہ جب اور جہاں

1- احسان دانش ، " جہان دانش" دانش آباد انار کلی لاہور ، سن طباعت 1973ء ص 531

چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے، جس سے شعر ایک مرصع زیور نظر آتا ہے ۔ زبان پر اتنا عبور ہو تو شاعر کامیاب غزل گو کہلاتا ہے ۔ انہوں نے اپنی زندگی زبان کی اصلاح اور درستی کیلئے وقف کر دی ۔ وہ چاہتے تھے کہ زبان کا معیار ہر حال میں برقرار رہے ۔

محاورات اور روز مرہ کا استعمال ان کی غزلوں کی نمایاں خوبی ہے ۔ انہیں روز مرہ داغ اور محاورہ دہلی پر قدرت حاصل تھی ۔ انہوں نے اس اصول کی پیروی میں اپنا کمال دکھایا ہے اور اس خاص وصف میں بہت کم شعراء ان کے مقابلے میں آتے ہیں ۔ محاورہ بندی کی چاشنی دیکھئے ۔

اشک وفا کی گرم مزاجی نہ پوچھئے
پانی میں آگ ان کی محبت لگا گئی

ہم اس امید میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں
کبھی تو حسن کا جلوہ نظر سے گزرے گا

دل لگا کر حسن میں ہم نے لگائے چار چاند
دل کے دو حرفوں کو زیب داستاں رہنا پڑا

گل کھلاتے ہیں وہ آتش زیر پا ہونے کے بعد
ان کو آتی ہے ہنسی مجھ پر خفا ہونے کے بعد

زیبا ناروی کا کلام ابتذال سے کوسوں دور ہے ۔ سیدھی سادی روز مرہ کی گفتگو ہے مگر خیالات کی بلندی و شگفتگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ۔ ایک ایک شعر اپنے رنگ میں اچھوتا

اور حسن کار کی رنگین خیالی کا شاہد ہے ۔ انھوں نے پامال مضامین اور پیش پا افتادہ خیالات کو بھی اس اسلوب میں نظم کیا ہے کہ ان میں جدت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ۔ لفظی بازیگری کی مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

تم نے کہا تھا مجھ سے بھولوں گا میں نہ تم کو
لیکن بھلا گئے وعدہ تم بھولنا نہ بھولے

دو چار دن کی بات نہیں منصب جنوں
برسوں میں جا کے رابطہ سنگ و سر ہوا

کتنے سادہ اور عام فہم لفظوں میں عشق و محبت کے احساسات کو قلمبند کر دیا ہے ۔ انسان کو اس مقام پر پہنچنے کیلئے مسلسل محنت و کاوش سے کام لینا پڑتا ہے ۔ جب اسے محبت میں پیش آنے والی مشکلات اور تکالیف بھی کسی انعام سے کم نہیں لگتیں ۔ محاوروں کے برمحل استعمال نے شعر کی برجستگی میں کس طرح سے اضافہ کیا ہے ۔ ذرا دیکھئے ـــــ ۔

یہ کھچاوٹ ، یہ بناوٹ ، یہ تکلف ، یہ سکوت
دیکھنے والا تری تصویر کا تصویر ہے

دیکھا ہنس تھا انھیں کہ مری آنکھ آ گئی
جلووں کی تابش سے نظر تلملا گئی

مرتب ہو ہی جائے گی وفا کی داستاں کوئی
ہلائے تو ذرا بتیس دانتوں میں زباں کوئی

زبان کے اشعار میں بول چال ، روزمرہ ، بے تکلفی ، محاورات اور ضرب الامثال سبھی چیزیں شامل ہوتی ہیں لیکن محاورات کو بے تکلف استعمال کر جانا خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ زیبا ناروی نے اپنے بیشتر اشعار میں بے تکلف محاورے استعمال کیے ہیں ۔

دل میں ہم کھینچ تو لیں ان کی تجلی لیکن

جل اٹھا طور ، اڑے ہوش ، تو پھر کیا ہو گا

یہ تہیہ ہے کہ ہم پی کے نہ بہکیں گے کبھی

رنگ لائی مئے سر جوش تو پھر کیا ہو گا

زیبا ناروی کے کلام میں قدم قدم پر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں محاورے نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں ۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ محاورات قصداً شامل نہیں کیے گئے بلکہ یہ خود بخود آمد کی رو میں زبان قلم پر آ گئے ہیں ۔ اس لیے بیان میں رکاوٹ نہیں بنتے ۔

چاہ بابل پہ ہوا ٹھیک فرشتوں کا راج

انگلیاں اب تو اٹھائیں کبھی انسانوں پر

ہوا دیدار کیا ان کا طبیعت ان پہ کیا آئی

گری بجلی نگاہوں پر بلا آئی طبیعت پر

موت کیا آئی کہ بالیں پہ قیامت اٹھی

سر پٹکنے لگی دنیا مرے انجام کے ساتھ

دم اظہار طنزاً کس لیے تم مسکرا بیٹھے

گرا دیں بجلیاں کیوں خرمن امید و حسرت پر

مندرجہ ذیل شعر دیکھئیے جس میں دنیا میں بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے محاورے کو ایسی خوبی سے استعمال کیا ہے کہ بات میں اثر پیدا ہو گیا ہے -

جفا اس دور بدتر کی نہ کہیے
وفا آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے

اسی طرح سے مختلف محاورات کو اشعار میں سمو کر انہیں روایت سے ہم آہنگ کیا ہے -

دل کے نالوں کو شب غم کام آنا چاہئیے
عرش کے تارے زمیں پر توڑ لانا چاہئیے

سوز دل سے اشک غم یہ کر رہے ہیں مشورہ
آگ پانی میں لگا کر گل کھلانا چاہئیے

اک بار انہیں کیا دیکھ لیا ، ہر حسن کا جلوہ دیکھ لیا
جیسے کہ نگاہ حسرت/گردش نے کے ستارے توڑ لیے

جب رنگ نہ لایا کوئی فسوں اک کھیل یہ کھیلا وقت جنوں
شوریدہ سروں نے زنداں میں سر اپنے پٹک کر پھوڑ لیے

گور غریباں کیلئے سامان رونق اور کیا
کچھ پھول تازے تازے ہیں دو چار چھ رکھ دئے

آج زیبا مے ساقی نے کھلائے وہ گل
رنگ پر بزم میں شغل مئے سرجوش رہا

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

باغباں بننے سے کوئی باغباں ہوتا نہیں

یہ کیا قہر ہے ان سے دو چار ہو کر بنی یک بیک میری جان حزیں پر

وہی یہ تو پوری مثل صادق آئی " منڈاتے ہی سر پڑ گئے سر پر اولے ---

غزل کی شاعری میں حسن آفرینی اور معنی آفرینی کا ایک وسیلہ ردیف کا بہترین انداز ہے ۔ اس سے شعر میں بات بھی پیدا ہوتی ہے اور قدرت زبان کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔ اور آواز و آہنگ کی لطافتیں نمودار ہوتی ہیں ۔ زیبا ناروی کی غزلیات میں ردیفوں کی شان پائی جاتی ہے ۔ خاص طور پر لمبی ردیفوں میں بیان اور موسیقی دونوں خصوصیات نمایاں ہیں ۔

مری وحشت میں تھوڑا سا اضافہ اور ہونے دو

تماشا دیکھنے اپنے بھی بے گانے بھی آئیں گے

رہے گا حشر تک ہنگامہ سوز و ساز ہستی کا

نئی شمعیں جلیں گی روز ، پروانے بھی آئیں گے

نہیں معلوم کیا خطرہ ہے دیوانوں سے محشر میں

وہ سب سے پوچھتے ہیں آج دیوانے بھی آئیں گے

نکل ہی جائے گا اک دن جنازہ مے پرستی کا

خزاں کی خشمگیں گردش میں پیمانے بھی آئیں گے

ـــہ سپرد گردش دوراں ہے دیکھئے کیا ہو

حواس باختہ انساں ہے دیکھئے کیا ہو

وہ جلوہ آج نمایاں ہے دیکھئیے کیا ہو

نگاہ دست و گریباں ہے دیکھئیے کیا ہو

جمال اپنی جگہ مطمئن حجاب میں ہے

نگاہ شوق پریشاں ہے دیکھئیے کیا ہو

کبھی کبھی خوبصورت ردیف کے استعمال نے پوری غزل کو تابناک کر دیا ہے ۔

جلنے لگے داغ دل ناکام سر شام

اس گھر میں چراغاں ہے بہ ہر گام سر شام

رہ رہ کے بھر آتی ہیں کہیں غمزدہ آنکھیں

تھم تھم کے چھلکتے ہیں کہیں جام سر شام

ہم نے جو تیری زلف کے سائے میں گزاری

یاد آتی ہے ہر روز وہ اک شام سر شام

زیبا ناروی نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں اشعار کہے ہیں ۔ تکرار لفظی اور طویل مترنم بحروں سے موسیقیت بھی پیدا کی ہے اور غزل میں جدت کا ایک انداز بھی ۔

یہاں آج مسکن وہاں کل ہے مدفن ازل سے عجب رات دن ہیرا پھیری

یہ دنیا کی دولت، یہ دولت کی دنیا نہ اس کی، نہ اس کی نہ میری نہ تیری

انہیں دیکھ کر کیا بچائے کوئی دل وہ کیسے ہیں قاتل وہ ایسے ہیں قاتل

نظر تیغ براں ، حیا دشمن جاں، ادا تیز خنجر، جوانی لٹیری

سرحشر اب کیا پشیماں ہو تم ، نظر کیوں ہے نیچی ہوئے کس لیے گم

یہاں بھی ستاو ، ستم دل پہ ڈھاو، کرو سخت گیری دکھاو دلیری

۵ ـــ تم جاو کہ بس وہ آئیں گے کچھ سمجھیں گے سمجھائیں گے

اے چارہ گر و بالیں پہ مری اب کوئی تمہارا کام نہیں

مٹتا ہے کہیں یوں داغ دل ہر آہ کا جھونکا لا حاصل

آندھی سے بجھے کیا شمع وفا ، یہ کوئی چراغ شام نہیں

دل کا دکھڑا سننا ہے گراں یہ آپ کے بس کی بات کہاں

یہ آپ کے بس کی بات ہے کب یہ آپ کے بس کا کام نہیں

دے دے کے جان اہل محبت نے بار بار

ان کی گلی کو گور غریباں بنا دیا

زیبا ناروی نے اکثر اشعار میں تکرار لفظی کے ذریعے ترنم پیدا کیا ہے۔

یہ تو بتائیے ہمیں حکم ہے کس قصور میں

دل تو رہے حضور میں ، ہم نہ رہیں حضور میں

کس لیے زیبا آپ نے ان سے لگایا اپنا دل

دل بھی پڑا فتور میں ، آپ بھی ہیں فتور میں

کسے دیکھیں اگر دیکھیں ، کہاں جائیں اگر جائیں

پجاری تیری صورت کے تری محفل کے دیوانے

الہی خیر ، منزل پر ابھی تک خاک اڑتی ہے

نہیں معلوم کس منزل میں ہیں منزل کے دیوانے

تکرار لفظی کی ایک خوبصورت مثال دیکھئیے ۔

ذوق کا عالم عالم عالم جلوے کی محفل محفل محفل

عشق کی دنیا دنیا دنیا حسن کی منزل منزل منزل

دل کی یہ ہٹ ہے ان کو دیکھوں ان کی یہ ضد ہے چھپ کر بیٹھوں

دید کی حسرت حسرت حسرت پردہ محمل محمل محمل

کون تماشا کس کا جلوہ کس کی تمنا کیسا پردہ

عالم حیراں حیراں حیراں نازکی محفل محفل محفل

بحر محبت کی طغیانی کشتی حسرت کی حیرانی

فتنہ طوفان طوفان طوفان ، خشکی ساحل ساحل ساحل

راہ وفا میں راحت کیسی کب ہے یہ منزل ایسی ویسی

درد کا ساماں ساماں ساماں ، شوق کی مشکل مشکل مشکل

جتنے حسیں ہیں وہ ہیں پر فن دل کے مخالف دل کے دشمن

قہر کے تیور تیور تیور ، شوخی قاتل قاتل قاتل

قصد جفا میں وہ بھی ڈھیٹ عزم وفا میں کھوئی یہ بھی

فطرت پیکاں پیکاں پیکاں حسرت بسمل بسمل بسمل

کبھی یوں ہے ، کبھی یوں ہے ، کبھی یوں ہے ، کبھی یوں ہے

انہیں باتوں میں کھو بیٹھی ہے دنیا اعتبار اپنا

جہاں طویل بحروں میں انہوں نے اپنا کمال دکھایا ہے ، اسی طرح ان کی چھوٹی بحریں جو سہل ممتنع کی ذیل میں آتی ہیں ۔ اپنی مثال آپ ہیں ۔ چھوٹی بحروں میں غزل کی اثر آفرینی عجب سماں پیدا کر دیتی ہے ۔ زیبا ناروی کی چھوٹی بحر کی غزلیں ایک تیز رفتار جوئے بار کی طرح ہیں جو تنگ کناروں کے حصار کے سبب نہایت ، تندی ، تیزی اور سرشاری کے ساتھ بہتی ہے ۔

یہ کہانی وہ کہانی کچھ نہیں

عالم اسباب فانی کچھ نہیں

آئیے بیٹھے اور اٹھ کر چل دئیے

آپ کی یہ مہربانی کچھ نہیں

وہ جو کہتے ہیں تو مر جائیں گے ہم

اور حیات جاودانی کچھ نہیں

تمہاری جستجو ہم کو رہے گی

تمہاری جستجو ہم کو رہی ہے

نماز دید کا وقت آ گیا کیا

نظر جلووں سے دامن دھو رہی ہے

مری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں

ندامت فرد عصیاں دھو رہی ہے

فن شاعری میں علم قافیہ بھی ایک باقاعدہ اور مکمل علم ہے ۔ زیبا ناروی کی شاعری کا

جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قافیہ کا گہرا علم رکھتے تھے -

چند اشعار دیکھئیے قوافی کا لطف دیدنی ہے -

رنگ لالہ و گل اور کیا صورت گلستاں کی

بکھر کر رہ گئی ہے داستاں خون شہیداں کی

دکھائے چاند وہ بھی سامنے بے پردہ آ پہنچے

ہلال عید ہم دیکھیں کہ صورت ماہ تاباں کی

شب غم ہر تڑپ میں کچھ نئے فتنے ابھر آئے

قیامت بن گئی ایک ایک انگڑائی رگ جاں کی

اس سلسلے میں ایک اہم انداز ان کا اندرونی قوافی کا استعمال ہے جس سے شعر ایک

نغمے کی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے -

محبت میں یہ بات ہے بے قرینہ ، کہاں تھم رہا آکے دل کا سفینہ

تلاطم نہیں تو نہیں لطف کوئی ، تلاطم کی موجیں ہیں ساحل سے آگے

یہی میری پونجی یہی میری دولت جو مقبول ہو جائے ان کی عنایت

پئے نذر اس بارگاہ ستم میں دل آگے جگر سے، جگر دل سے آگے

اسے شوق جفا کاری ، اسے ذوق وفاداری ~~

نہ کم ارمان بسمل کے نہ کم ارمان قاتل کے

زیبا ناروی نے اپنی غزل میں صنائع بدائع سے بھی کام لیا ہے - اس علم سے آرائش کلام

کے طریقے معلوم ہوتے ہیں اور ان کے استعمال سے نظم و نثر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے -

ان کی غزلوں میں صنعت تضاد ، مراعاۃ النظیر، تنسیق الصفات اور تلمیح کا استعمال زیادہ ہے ۔ ان سے کلام میں حسن اور معنویت پیدا ہو گئی ہے ۔ صنعت تضاد کی مثال دیکھئیے۔

شیریں ہوں کہ ہوں تلخ ، محبت میں حرا آ

اس شوخ کی باتوں کا مزا دیکھئیے کیا ہو

ابھی تھے داغ دل روشن ابھی تھی یاس کی ظلمت

کبھی گھر میں اندھیرا تھا کبھی گھر میں چراغاں تھا

پہلے شعر میں شیریں اور تلخ کے متضاد الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جبکہ دوسرے شعر میں روشن ، ظلمت ، اندھیرا ، چراغاں کے الفاظ اس صنعت کو ظاہر کر رہے ہیں ۔ اسی طرح سے مندرجہ ذیل شعر میں خزاں اور بہار کا استعمال تضاد پیدا کر رہا ہے ۔

خزاں کے نقش ابھر آئے ، بہار آئی جو گلشن میں

ہمیں ہر برگ گل پر دکھ بھری تحریر ملتی ہے ۔

مزید مثالیں دیکھئیے ۔

چمن میں ایک مشت پر کی قسمت پوچھتے کیا ہو

خزاں جاتے ہی گل پھولے، بہار آتے ہی دام آیا

میرے ذکر وفا پر آپ طنزاً مسکرائے کیوں

حقیقت سامنے آئی ہے افسانہ نہیں آیا

کیوں کہوں تل ہے ترے عارض انور کے قریں

جم کے کافر کوئی بیٹھا ہے مسلماں کے قریب

خوشی کا گیت ہو یا راگ غم کا ہو مگر زیبا

مرا دل جھوم اٹھتا ہے صدائے ساز فطرت پر

کہاں کی برائی ، کہاں کی بھلائی حیات دو روزہ سے کیا آشنائی

مسافر تھے چلتے رہے راہ منزل ، اندھیرا نہ دیکھا اجالا نہ دیکھا

جینے سے تنگ ، مرنے سے مجبور ہم ہوئے

کیا حال تو نے اے غم جاناں بنا دیا

وہ نہ ستائیں چاہ میں آئیں مری نگاہ میں

صبح کی راہ کیوں تکوں شام کا انتظار کیا

کوئی روئے یا ہنسے دنیا تماشائی ہوئی

گل ہو یا شبنم ہوا نداز بہار آ ہی گیا

جفا پر بھی وفا کرتے رہے زیبا محبت میں

دعائیں دینے والوں کو نہ آیا مدعا دینا

نگاہ پڑنے لگی کس کی ، ہم فقیروں پر

جدھر بھی دیکھئے چرچا ہے تاج داروں کا

چمن سے دور ہوں لیکن مجھے سکون کہاں

کبھی خزاں کا تصور ، کبھی بہاروں کا

صفت مراعاۃ النظیر میں ایک چیز سے متعلق دوسری اشیاء کا بیان اس طرح سے کیا جاتا ہے

کہ وہ اس چیز کے اجزاء کی صورت میں سامنے آ جاتی ہیں ، اور ان میں کوئی تضاد یا تقابل نہیں

ہوتا ۔ زیبا ناروی نے اس صفت کی مدد سے اپنے کلام کی آرائش کی ہے ۔ مثلاً دیکھئیے چمن کے ذکر میں پھول ان کی رنگینی اور خوشبو سبھی کچھ بیان کرتے ہیں ۔

بہار، پھول ، فضا ، رنگ ، بو، صبا ، غنچہ
چمن میں جو ہے پریشاں ہے دیکھئیے کیا ہو

ہماری شعری روایت میں عاشق کا جو تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے بہار کے موسم سے خاص تعلق ہے، اس موسم میں اس کے جنون میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اگر وہ زنداں میں بھی قید ہو تو اسے توڑ کر بھاگ نکلتا ہے ۔ ان تمام کا ذکر ایک ہی شعر میں اس طرح سے کرتے ہیں۔

بہار آتے ہی دیوانے کا جادو چل گیا شاید
در زنداں پہ اک ٹوٹی ہوئی زنجیر ملتی ہے

چند مثالیں مزید دیکھئیے ۔

کیا اور ہم کو ساحل و طوفاں کا مرحلہ
کشتی بڑھائی دامن طوفاں میں آ گئے

قلق ، فراق ، جنوں، ٹیس ، آہ ، درد ، فغاں
بہار لوٹ کے لائے ہیں بزم یار سے ہم

صفت تلمیح ایجاز و اختصار کا باعث ہے ۔ اس کی مدد سے کسی طویل مذہبی ، تاریخی واقعہ یا قصے کہانی کو دو تین الفاظ میں اشارتاً بیان کر دیا جاتا ہے ۔ تلمیح کا برمحل اور برجستہ استعمال دریا کو کوزے میں بند کرتا ہے ۔ نظم و نثر دونوں میں اس کی بنا پر حسن

پیدا ہوتا ہے ۔ زیبا ناروی نے اپنے اشعار میں تلمیح کو بہت زیادہ استعمال کیا ہے ۔

اناالحق کی صدائیں اب ہجوم زر میں رقصاں ہیں

کوئی منصور لیکن دار پر کھینچا نہیں جاتا

خدائے حسن کو رکھتی تھی شرم عشق دنیا میں

نہ تھا وہ دامن یوسف ، زلیخا کا گریباں تھا

قصۂ حضرت یوسف پہ کوئی غور کرے

حسن بھی عشق کا دیوانہ دکھائی تو دیا

زلیخا کی خطا ہو حضرت یوسف سزا پائیں

درِ زنداں کھلا یا کھل گئی تقدیر زنداں کی

ہم جو ہوتے طور پر موسے کو سمجھاتے یہ بات

بے تکلف یوں انہیں آواز دی جاتی نہیں

تنسیق الصفات کی صفت ان کی غزل میں عجیب دلکشی پیدا کرتی ہے ۔

ع حسیں جتنے دیکھے فسوں ساز دیکھے عجب حسن والوں کے انداز دیکھے

تکلم شرارت ، تبسم قیامت ، اشا رہ ہلاکو ، جوانی لٹیری

نہیں اک روپ میں قائم نگاہ یار کی صورت

کبھی نشتر ، کبھی خنجر ، کبھی تلوار کی صورت

یہ چاروں خوبیاں موجود ہیں اس حشر پیکر میں

ضیا بجلی ، حیا فتنہ ، نظر ترچھی ، ادا بانکی

زیبا ناروی نے غزل میں رعایت لفظی سے بھی کام لیا ہے ۔

کب ان کے سامنے آنسو بہا پائیں مری آنکھیں

یہ وہ بادل ہیں جن سے وقت پر برسا نہیں جاتا

کاٹیں گے ہم شب غم سینے پہ ہاتھ رکھ کر

شرما کے داغ دل سے تارے نہ منہ چھپائیں

زیبا ناروی نے ان صفتوں کے استعمال میں جدت پیدا کی ہے اور جیسا کہ لکھنویوں کے ہاں طریقہ تھا کہ وہ التزام کرتے تھے ۔ ایسا نہیں ہے بلکہ زیبا کی شاعری میں جذبوں کا اظہار بھی ہوا ہے ، سوز و گداز کی کیفیت بھی ہے ۔ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں اور قلب انسانی کی لطافتوں کو دلکش انداز سے پیش کیا ہے ۔

زیبا ناروی اگرچہ عام اور سادہ زبان اختیار کرتے ہیں جیسا کہ داغ کے دبستان کا انداز ہے۔ عام طور پر ان کی غزلیں سادہ زمینوں میں ہیں ۔ لیکن کبھی کبھار استادی کا رنگ دکھانے کیلئے سنگلاخ زمینیں بھی اختیار کرتے ہیں ۔ جن سے ان کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے ۔ مثلاً

ایسی ابجد میں لکھا ہے خط پیمانہ دل

کوئی سمجھا نہیں کیا ہے خط پیمانہ دل

جلوہ ہوش ربا ہے خط پیمانہ دل

میرے ساقی کی ادا ہے خط پیمانہ دل

کھنچ گئی طور کی چوٹی پہ یہ روشن سی لکیر

برق کی لہر ہے یا ہے خط پیمانہ دل

کھیلتے رہتے ہیں حسرت کے سفینے دن رات

موج دریائے وفا ہے خط پیمانہ دل

ایسی زمینیں یقیناً سنگلاخ ہوتی ہیں اور ان میں شعر کہنا قادر الکلامی کا مظہر ہوتا ہے۔
زیبا ناروی نے اگرچہ عموماً آسان زمینوں میں غزلیں کہی ہیں مگر بعض اوقات انہوں نے سنگلاخ زمینوں
میں کثیر تعداد کی حامل غزلیں کہہ کر اپنی فنی مہارت اور پختگی کا اظہار کیا ہے ۔ مشکل
پسندی کی حامل ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

پیکر خاکی ہوں میں تقدیر میں بھی خاک ہے

بعد مرنے کے میری جاگیر میں بھی خاک ہے

حاشیے پر ہے کتاب دہر کے تربت میری

آدم خاکی ہوں میں تفسیر میں بھی خاک ہے

خاک کو حاصل ہوا ہے مرتبہ اکسیر کا

ہاں باالفاظ دگر اکسیر میں بھی خاک ہے

ایک ہنگامہ کا باعث تھی میری دیوانگی

میں نہیں تو کوچہ زنجیر میں بھی خاک ہے

تو نے کیا چھوڑا شگوفہ چل کے اے باد سحر

شمع گل ہے قبضہ گل گیر میں بھی خاک ہے

حسن والوں پر کبھی زیبا نہ قابو چل سکا

آپ کے اس جذبہ تسخیر میں بھی خاک ہے

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں مشکل پسند شاعری بھی ہے ، اور یہ مشکل پسندی کبھی قافیوں میں بھی نظر آتی ہے ۔

جب نظر میری گئی اس رخ تاباں کے قریب
بجلیاں کوند گئیں دیدہ حیراں کے قریب
آبلے چند ہیں میرے دل سوزاں کے قریب
اور کچھ چیز نہیں سوختہ ساماں کے قریب
ہنس دیئے پھول کھلے غنچے ، گھٹائیں اٹھیں
کون آیا ہے گلگشت گلستاں کے قریب

غزل پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ اس میں ریزہ خیالی پائی جاتی ہے اور اس اعتراض کے جوابات بھی دیے گئے ۔ لیکن قدیم اساتذہ کے اشعار میں ایک ربط ضرور موجود ہوتا ہے ۔ زیبا ناروی کی غزلیات پر غور کرنے کے بعد بھی یہ معنوی وحدت محسوس ہو جاتی ہے ۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں بھی ریزہ خیالی ہے ۔ لیکن بعض غزلیں مسلسل ہیں ۔ ان میں ایک تسلسل موجود ہے ۔ زیبا ناروی کی کئی غزلیں بغیر ردیف کے ہیں ، صرف قافیے سے کام لیا گیا ہے ۔ یعنی غیر مردف غزلیں ہیں ۔

ظالم ہے فلک اور مری آہ فلک سوز
کم بخت سے تکرار نہ ہو جائے کسی روز
بیٹھا ہوں لئے دل میں غم ساز و غم سوز
ہر لے الم انگیز ہے ہر نغمہ غم افروز

مطلب یہ ہے بیٹھے نہ کوئی چین سے دم بھر

محفل میں اٹھاتے ہیں وہ اک بات نئی روز

بیشتر غزلوں کے تین ، تین ، چار،چار مطلعے ہیں ـ

جہیں حسن دم جھکی شرح نیاز و ناز لے آئی

نظر اٹھی تو بڑھ کر لامکاں کے راز لے آئی

وہی خاکہ ، وہی نقشہ ، وہی انداز لے آئی

نگاہ شوق تصویر حریم ناز لے آئی

بھلے انداز لے آئی برے انداز لے آئی

نگاہ شاعرانہ ہر جگہ کے راز لے آئی

اکثر غزلوں میں دو ، دو مقطعے ملتے ہیں ـ مثلاً ایک غزل میں دیکھئیے ـ

جب نظر آتا ہے زیبا کوئی افسردہ پھول

سوچتا رہتا ہوں پھروں میں بھی انجام بہار

بے رخی زیبا سے میخانے میں یہ زیبا نہیں

ساقی فطرت ، اسے بھی بادہ جام بہار

ایک اور غزل کے آخری اشعار دیکھئیے ـ

نئے رستے دکھائے منزل عشق و محبت کے

بڑا احسان ہے زیبا ہم پر حضرت دل کا

میسر اور کیا آتا انہیں زیبا محبت میں

تمناؤں کے کاندھوں پر جنازہ ہے مرے دل کا

زیبا ناروی کی شاعری کے متعلق مطلوب احمد کہتے ہیں :-

" جہاں تک حضرت زیبا ناروی کی شاعری کا تعلق ہے ان کے کلام میں نکتہ دانی معنی شناسی ، ربط اور مناسبت فطری اس پایہ کی ہے کہ نثر اور انشاء کے معنی طراز ، سخن سنج اور نکتہ پرداز اور فصاحت پیشہ لوگ ان کی تعلیم و ارشاد کے فیض سے مستفید ہوتے ہیں ۔ آپ کے شعروں میں ادائے مطالب کی قدرت ، عبارت کی سادگی ، مصرعوں کی ہمواری ، مطالب کا اختصار اور دلنشین ترکیبیں ، سلاست و بلاغت نہایت/حیرت انگیز ہیں ۔ آپ شعر سہل ممتنع میں کہتے تھے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قادر الکلام اور قادر البیان شاعر تھے "

بحیثیت مجموعی ہم دیکھتے ہیں کہ زیبا ناروی کی غزلوں میں فنی طور پر پختگی کا رنگ نمایاں ہے ۔ انہوں نے روایت کو نبھانے کے ساتھ اس میں جدت پیدا کی اور اسے وسعت دی ۔ انہوں نے حسن شائستہ انداز سے جذبات کو شعر کی صورت دی ، وہ انہیں کا حصہ ہے ۔ پورے کلام میں پھکڑ پن کی مثال شاید ہی کہیں نظر آئے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزل قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے ۔

باب سوم :

زیبا ساروی کی مذہبی شاعری

انسانی شخصیت عجیب مزاج کی حامل ھے ۔ خدائے بزرگوار نے بیک وقت ایک شخصیت میں بہت اوصاف کو جمع کر رکھا ھے ۔ تاھم یہ علیحدہ بات ھے کہ کونسا شخص اپنے کس پہلو کو زیادہ نمایاں کرتا ھے ۔ یوں کسی بھی انسانی شخصیت کا اگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو وہ گوناں گوں پہلوؤں مثلاً مادی ، روحانی ، عقلی ، جذباتی دنیاوی ، دینی وغیرہ کی حامل ہوتی ھے ۔ ان گوناں گوں پہلوؤں میں سے مذھب اور روحانی عقاید کو روز اول سے بہت اھمیت حاصل رھی ھے ۔ اگر دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ھمیں شروع سے ھی کسی نہ کسی حوالے سے مذھب اور روحانی عقاید انسانی شخصیت کا حصہ نظر آتے ھیں ۔ کہیں خدا کے تصور کی صورت میں اور کہیں بت پرستی اور آتش پرستی وغیرہ کی صورت میں ۔ اس کی بڑی اھم وجہ یہ ھے کہ انسان اگرچہ اشرف المخلوقات ھے مگر شروع سے ھی وہ اس کائنات کے مختلف اسرار و رموز اور آفات سماوی و ارضی کے حوالے سے اور حیات انسانی کے ناقابل گرفت مصائب کے حوالے سے خود کو بے بس اور مجبور تصور کرتا رھا ھے ۔ اس صورت میں کسی لا محدود طاقت کا سہارا لینا انسانی ضرورت بن گیا جو انسان کے خیال میں تمام مسائل کو حل کر سکے اور دکھوں پر مرھم کا کام دے سکے ۔ چنانچہ اس طرح مذھب اور عقائد انسانی زندگی کا لازمہ بنتے چلے گئے۔

مذھب اور عقاید صرف تسکین و اطمینان اور رحمت و خیر کا ھی وسیلہ نہیں بنتے بلکہ اپنے اوپر ایک بلند ترین قوت کی موجودگی کا احساس انسان میں روحانی بالیدگی بھی پیدا کرتا ھے ۔ یہ بات طے ھے کہ اگرچہ آج انسان بہت ترقی کر چکا ھے ۔ اس کے باوجود آج بھی وہ بہت سے معاملات میں تقدیر کے سامنے مجبور و بے بس ھے ۔ تقدیر

ازل سے ایک معمہ لاینحل بنی ہوئی ہے ۔ عقل سے اس کی تفہیم ممکن نہیں ہے ۔ لیکن مختلف عقاید سے اس کی کسی نہ کسی طرح تفہیم ہو جاتی ہے جو انسان کے سکون اور اطمینان کا باعث بنتی ہے ۔ اور اس فضامیں وہ تمام بنی نوع انسان کیلئے بھی ضرر رساں نہیں رہتا بلکہ زیادہ سے زیادہ کار آمد ہونے کی کوشش کرتا ہے ۔ یوں اگرچہ آج عقل نے سائنس کی صورت اختیار کرکے بہت ترقی کی ہے مگر اس کے ساتھ روحانی عقائد (جن کی کوئی واضح عقلی توجیہہ پیش کرنا ناممکن ہے) کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں کیونکہ جہاں عقل کام نہیں کرتی وہاں عقاید کام کر جاتے ہیں اور انسانی ذہن کو خواہ مخواہ کی کلفتوں سے بچا لیتے ہیں ۔

ہر معاشرہ اپنے لوگوں کے خیالات اور سوچوں کا عکاس ہوتا ہے اس لیے مذہبی و روحانی عقاید کا انسانی زندگی میں گہرا دخل ہونے کی وجہ سے معاشرتی رسم و رواج طرز زیست ، طرز فکر غرضیکہ ہر شے پر ان کی گہری چھاپ ہوتی ہے ۔ اسی طرح سے فنون و ادب کا چونکہ معاشرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے ، لہذا فنون و ادب میں اس کی عکاسی ہوتی ہے ۔ ادب کا آغاز تحریر کی صورت میں نثر سے پہلے شاعری کی شکل میں ہوا ، کیونکہ شاعری میں نثر کی نسبت انسانی ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے ۔ چنانچہ شاعری میں بھی شروع سے مذہبی عقاید و تصورات شامل رہے ہیں ۔ مسلمانوں کے ہاں بھی اس کی روایت زمانہ ثبوت سے ملتی ہے اور اس کے لیے نہایت دل پذیر پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے ۔

اردو شاعری کی روایت میں مذہبی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں اللہ تعالی کی حمد آنحضور کی نعت، اہل بیت صحابہ کرام اور دیگر اکابرین ملت اسلامیہ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں ۔ گویا مذہبی شاعری میں حمد ، نعت ، منقبت ، سلام ، مرثیہ ، مذہبی قصائد اور نوحے وغیرہ شامل ہیں ۔

ہماری مذہبی شاعری اتنی ہی پرانی ہے، جتنا کہ مذہب اسلام در اصل مذہبی شاعری کا مقصد ہمارے اندر ایک تو مذہب کی حس کو بیدار رکھتا ہے اور دوسرے اللہ تعالی کی تعریف کے ساتھ ساتھ آنحضور اور دوسری شخصیات اسلام سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے ۔ ہماری اردو شاعری پر عربی اور فارسی کے بہت اثرات ہیں ۔ چنانچہ ہمیں اردو میں مذہبی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے عربی و فارسی میں مذہبی شاعری کی روایت پر کچھ غور کرنا ہو گا ۔

ہمارے ہاں مذہبی شاعری کا وجود اس وقت ظہور پذیر ہو گیا تھا جب اسلام کا سورج عرب کے افق پر طلوع ہوا تھا ۔ اس وقت مذہبی شاعری نعت، منقبت اور قصیدے کی شکل میں سامنے آئی ۔ مذہبی شاعری میں پہلے تو مدینہ کی بچیوں کا وہ گیت قابل ذکر ہے جو انہوں نے معصومانہ انداز میں رسول کریم کے مدینہ میں استقبال کے موقع پر گایا۔(1)

تاریخی نقطۂ نظر سے اردو میں مذہبی شاعری بالکل ابتدائی دور سے ملتی ہیں ۔ قدیم دکنی شعراء سے لے کر آج تک ایک تواتر و تسلسل کے ساتھ مذہب سے متعلق اشعار

۱۔ سید رفیع الدین اشفاق " اردو کی نعتیہ شاعری " کراچی (باب الاسلام پریس اکتوبر 1976ء) ص67

کہے گئے ہیں ۔ قصیدے کے ذریعے بھی آنحضور کی اعلیٰ و ارفع صفات بیان کی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی مذہبی شاعری کے نمونے ملتے ہیں ۔

زیبا ناروی کے ہاں بھی ان مختلف اصناف میں شاعری کی مثالیں ملتی ہیں ۔ زیبا نے جہاں دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی وہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان عشق رسولؐ کا اظہار ، اہل بیت اور عقیدت ان کے کلام کا اہم حصہ ہے ۔ یوں تو زیبا نے غزل ، رباعی ، قطعہ، مسدس غرضیکہ ہر صنف میں اسلامی موضوعات اپنائے لیکن خالص مذہبی شاعری بھی وافر مقدار میں ان کے ہاں موجود ہے ۔

زیبا ناروی مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے ۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور دین اسلام سے محبت ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھی ۔ جب رسول و اہل بیت سے عقیدت کی فراوانی ان کے کلام میں نظر آتی ہے ۔ زیبا کی مذہبی شاعری اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ساتھ ائمہ اظہار اور اہل بیت سے ان کی سچی محبت جانثاری اور انتہائی عقیدت کی شاہد ہے ۔ ذیل میں ہم ہر اہم صنف کے حوالے سے زیبا ناروی کی مذہبی شاعری کا جائزہ لیں گے ۔

حمد :

حمد کے معنی تعریف کے ہیں ۔ اصطلاح میں حمد سے مراد وہ نظم ہے جس میں خدائے باری تعالیٰ کی وحدت، صفات اور عظمت و قدرت کا بیان ہوتا ہے، اور اس کی تعریف ہمہ پہلو کی جاتی ہے ۔ حمد کا موضوع نہایت وسیع اور متنوع ہے ۔ اس کیلئے

کوئی ہئیت مخصوص نہیں ، یہ کسی بھی ہئیت میں لکھی جا سکتی ہے ۔ بعض جدید شعراء نے آزاد نظم کی ہئیت میں بھی حمد یں لکھی ہیں ۔ حمد کہلئے لہجہ کا مودّب ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکیزہ زبان اور شگفتہ اور بلیغ الفاظ بھی ناگزیر ہیں ۔ حمد صرف رسمی طور پر ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے خدا تعالی کے عشق میں ڈوب کر کہی جائے تو اس کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے ۔ بالعموم حمد کے آخر میں خدا سے مغفرت اور بھلائی کی دعا مانگی جاتی ہے ۔ اردو شاعری میں حمد کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود اردو شاعری ۔ قدیم شعراء اپنے دیوان اور مثنویوں کا آغاز حمد سے کرتے تھے ، اور یہ بات صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ، غیر مسلم شعراء بھی اپنے مجموعہ کلام کے آغاز میں حمد ضرور لکھتے تھے ۔ اردو شاعری میں باقاعدہ حمدیہ شاعری کے نمونے بھی مل جاتے ہیں ۔

زیبا ناروی کے ہاں ایک حمد ملتی ہے ۔ زیبا اس حمد میں اللہ تعالی کی عظمت رفعت اور اس کی قدرتوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ قدرت کے جتنے مظاہر ہیں ان میں اللہ تعالی کا جلوہ کارفرما ہے ۔ تاروں میں روشنی اور پھولوں میں رنگ و خوشبو اسی کے نور کی بدولت ہے ۔ اس حمد میں تصوفانہ افکار کی گونج واضح طور پر سنائی دیتی ہے ۔

زیبا ناروی چونکہ خود بھی صوفی اور سالک تھے اس لیے ان کے ہاں تصوفانہ پیرایہ جو بظاہر روایتی ہے، آنا قدرتی سی بات ہے ۔ جیسا کہ اس میں " اللہ نور السموات والارض سے پھوٹنے والا تصور توحید قلمبند ہو گیا ہے ۔

حیرت کدہ گلشن عالم کی نمائش   غنچوں کی نمو، سبزہ و شبنم کی نمائش

پھیلی ہوئی اک نور کی چادر سی سرآب   چھائی ہوئی ذروں پہ ضیائے مہہ شب تاب

انوار سحر، ظہور شرور، شام کے نغمے   آغاز کے ہر ساز میں انجام کے نغمے

زیبا یہ کسوٹی حمد، کوئی چیز نہیں ہے

جو شے بھی ہے توحید کے جلوے کی امیں ہے

اس حمد میں زیبا کا لہجہ مودبانہ ہے ۔ اللہ تعالی کی صفات کو جزئیات کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ زبان پاکیزہ اور الفاظ شستہ اور بلیغ ہیں ۔ اس لیے اس میں عقیدت اور دلکشی مل کر تاثیر پیدا کر رہے ہیں ۔ زیبا نے یہ حمد مثنوی کی ہئیت میں لکھی ہے ۔

نعت :
=====

نعت عربی زبان کا ایک مادہ ہے جس کے معنی کسی شخص میں اچھے اوصاف کا پایا جانا اور ان کی تعریف کرنا کے ہیں ۔ گویا کسی شخص کی توصیف مبالغے کے ساتھ بیان کرنا ۔ لیکن اہل ادب کے نزدیک اصطلاح میں جب کوئی شخص حضور پاک کی تعریف و توصیف کرتا ہے تو اسے نعت کہتے ہیں ۔ یعنی نعت آنحضور کی مدح کا نام ہے ۔ شان رسول میں کچھ کہنا عین عبادت ہے ۔ مسلمانوں کے نزدیک ذکر رسول افضل ترین عبادت ہے ۔ چنانچہ بہزاد لکھنوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

" نعت تعریف ہے حضور کریمؐ کی ۔ اس سے ہر مسلمان کو قلبی تعلق ہے جو ایک بار بھی کلمہ شریف پڑھ چکا ہے" [1]۔

---

1 ۔ بہزاد لکھنوی ، " ثنائے حبیب" شائع کردہ فروغ اردو لکھنو ۔

اس لفظ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے آغاز ہی سے رسول کریم کے اوصاف بیان کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی نہ کسی شے سے محبت کرے اور عقیدت رکھے ۔ چنانچہ تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر دور میں کسی نہ کسی کے سامنے نیاز مندی دکھاتا رہا ہے ۔ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی کے بعد رسول کریم کی ذات مقدس تمام خوبیوں کا مظہر ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور آپ کی مدح سرائی جزو ایمان شمار ہوتی آئی ہے ۔ آپ کی ذات سے والہانہ محبت کے بغیر عقیدہ توحید بے معنی ہو جاتا ہے ۔ بقول عثمان مروندی

از طاعت الہی دہدم جمال احمد

وز حب مصطفائی دریا فتم خدارا

نعت کیلئے کوئی ہئیت مخصوص نہیں ہے کیونکہ نعت موضوع کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے ۔ اس لیے یہ کسی بھی ہئیت میں لکھی جا سکتی ہے ۔ نعت " ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں" کے مصداق ہر ہئیت میں لکھی گئی ہے ۔ نعت کا میدان نہایت وسیع اور عظیم ہے کیونکہ آنحضورؐ کے اوصاف بے شمار ہیں اس لیے نعت کے لیے موضوعات بھی بے انتہا ہیں ۔

نعت گو کے لیے حمد اور نعت کے درمیان حد فاصل قائم رکھنا ضروری ہے ۔ یہ ایک نازک مقام ہے اور اس کیلئے مہارت فن کی ضرورت ہے ۔ نعت گو کے ذرا سے تجاوز

سے نعت اور حمد کا فرق ختم ہو جاتا ہے ۔ آنحضور کے شایان شان بات کرنا ، زبان کی پاکیزگی اور شستگی برقرار رکھنا ، آپ کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق الفاظ و تراکیب کا استعمال کرنا نعت کی شرائط میں سے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ دھیما اور نرم ہونا چاہئیے ۔ اس لحاظ سے نعت گوئی شاعری کی دیگر اصناف سے مشکل ترین صنف اور فن ہے ۔ بقول عرفی

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :۔

" حقیقی نعت کا راستہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے" ۔[1]

نعت اگرچہ عقیدتوں کا اظہار ہے جو ہر مسلمان کی خواہش ہے لیکن شایان شان نعت کہنا آسان کام نہیں ہے ۔ اس لیے بہت سے نامور شعراء نے اس سلسلے میں عجز کا اظہار کیا ہے ۔ جناب اے ۔ ڈی ۔ نسیم اپنے مقالے میں لکھتے ہیں :۔

" نعت گوئی کا راستہ پل صراط سے زیادہ کٹھن ہے اس پر بڑی احتیاط اور ہوش سے چلنے کی ضرورت ہے ۔ اسی لیے اکثر شاعروں نے نعت کہنے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہے ۔ جس ہستی پر خدا خود درود بھیجتا ہو ، انسان کی کیا مجال ہے کہ اس کی تعریف کا احاطہ کر سکے" ۔[2]

1۔ فرمان فتحپوری ، ڈاکٹر " اردو کی نعتیہ شاعری" آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور 1976ء ص 13

2۔ اے ۔ ڈی ۔ نسیم " اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" ص 291

درحقیقت نعت گوئی بہت نازک فن ہے ۔ اس کی وسیع فضا میں پرواز کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ۔ شاعر کو آداب خدا اور حدود شریعت کو ملحوظ رکھنا چاہئیے۔

نعت گوئی کی روایت نہایت قدیم ہے ۔ اتنی کہ جتنی کہ یہ دنیا ۔ اس کی ابتداء خود خدا تعالی نے کی ہے ۔ جس کا ثبوت قرآن پاک ہے ۔ کلام الہی میں نعت مبارکہ کا انداز موجود ہے ۔ آپ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے ۔ خدا تعالی کے بعد آنحضرت کی بشارت تقریباً تمام انبیاء کرام دیتے آئے ہیں ۔ بعض نے آپ کی بشارت دیتے ہوئے آپ کی صفات بیان کی ہیں ۔ پھر احادیث میں بھی نعت سے متعلق بہت قدیم پہلو ملتے ہیں ۔ اہل عشق کا کہنا ہے کہ " الحمد " سے لے کر " والناس " تک کسی نہ کسی طرح نعت کا پہلو نکلتا ہے ۔ ہمارے شعراء نے نعت کے موضوعات قرآن پاک کے ساتھ احادیث سے بھی اخذ کیے ہیں ۔

حمد کی طرح نعت بھی قدیم ترین صنف شعر ہے ۔ اسلام کے ابتدائی دور سے ہی یہ سلسلہ چل نکلا تھا ۔ اس سلسلے میں کئی صحابہ کرام کا ذکر ملتا ہے جو باقاعدہ شاعر نہیں تھے، صرف نعتیہ اشعار کہتے تھے ۔ بعض صحابہ کرام باقاعدہ شاعر تھے جنہوں نے گرانقدر شاعری کی ، لیکن وسیع پیمانے پر نعتیں آپ کی بعثت کے بعد لکھی گئیں ۔ اردو میں نعت گوئی کا فن عربی اور فارسی کے زیر اثر آگے بڑھا ہے ۔

عربی میں اہم ترین شاعر حسان بن ثابت اور کعب بن زہیر ہیں ۔ دونوں کو آنحضور کے دربار میں نعتیہ اشعار سنانے پر داد و تحسین حاصل کرنے کی سعادت نصیب

ہوئی اور آنحضور نے خوش ہو کر انہیں اپنی ردائے مبارک بخش دی - ان کے علاوہ حضرت علی کے نعتیہ جملے اہم ہیں - فرزدق بھی اس دور کے نہایت اعلی شاعر تھے- انہوں نے مدح رسول اور اہل بیت کو یکجا کر دیا - الکمیت بن زید الاسدی نے اہل بیت کی مدح کی -

غیر صحابی شعراء میں نعت گو کی حیثیت سے ایک ممتاز ترین نام ابو عبداللہ محمد بن زید بوصیری کا ہے - عربی میں ان شعراء کے علاوہ ایک نام ابوبکر تقی الدین بن علی بن عبداللہ الحموی کا بھی آتا ہے - یوں عربی زبان میں مذہبی شاعری کو زیادہ تر قصائد کے روپ میں فروغ حاصل ہوا - کیونکہ اس زمانے میں اسی کو قادرالکلامی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا -

معنوی حیثیت سے اردو نعت گوئی نے عربی سے کہیں زیادہ فارسی کا اثر قبول کیا ہے - فارسی نعت قرآن و حدیث اور عربی نعت سے متاثر ہے - فارسی نعت بھی موضوعات کے اعتبار سے عربی نعت جیسی ہے - لیکن فنی حسن اور دلکشی کے اعتبار سے اس میں غزل کی سی خصوصیات دکھائی دیتی ہیں - یوں تو فارسی کے اکثر شعراء نے نعتیہ اشعار کہے ہیں لیکن سب سے پہلا قابل ذکر نام فردوسی کا ہے - اس نے شاہنامے کے آغاز میں نعتیہ اشعار شامل کیے - مسعودسعد سلمان ، مجدالدین سنائی غزنوی ، عمر خیام ،حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ، ابراہیم خاقانی ، نظامی گنجوی کے ہاں بھی نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں - خواجہ معین الدین چشتی نے بھی نعتیہ شاعری کی ہے - خواجہ فرید الدین عطار اور خواجہ شمس تبریزی نے بھی آنحضرت کی ذات گرامی کے بارے میں بہت سے اشعار لکھے

ھیں ۔ خواجہ حافظ شیرازی نے نعت رسول میں جو کچھ فرمایا ھے وہ شاھکار کی حیثیت رکھتا ھے ۔ ان کے بعد ایک قابل ذکر نام مولانا رومی کا ھے ۔ ان کی " مثنوی معنوی" میں بھی اعلی پائے کے نعتیہ اشعار ملتے ھیں ۔ پھر فارسی شعراء میں مولانا شہاب الدین حضرت بو علی قلندر ، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو شامل ھیں ۔ امیر خسرو کی نعت فن شاعری کے اعتبار سے بھی لاجواب ھے اور اس میں غزل کا سا رمز و ایماء اور سوز و گداز پایا جاتا ھے ۔ شیخ فریدالدین عراقی اور مولانا عبدالرحمن جامی فارسی نعت میں زیادہ شہرت کے حامل ھیں ۔ ان کے ھاں آنحضور کی محبت کا والہانہ اظہار ملتا ھے ۔ اردو کی نعتیہ شاعری پر جامی اور قدسی کا گہرا اثر ھے ۔ ان کے علاوہ صائب،فیضی ، بیدل ، غالب اور بعض دوسرے فارسی شعراء کے ھاں بھی نعتیہ شاعری کی بلند پایہ مثالیں ملتی ھیں ۔

اردو نعت نے قرآن و حدیث اور عربی و فارسی نعت سے اثر قبول کیا ھے ۔ اس میں زیادہ تر نعتیہ شاعری غزل کی ھئیت میں ھوئی ، لیکن مثنوی وغیرہ کے آغاز میں بھی رسمیہ نعت مل جاتی ھے ۔ پھر نعتیہ قصائد بھی ملتے ھیں ۔ جن میں آپ کی ذات مبارکہ پر درود و سلام بھیجا گیا ۔ جب ایران سے شاعری کا قافلہ ھندوستان پہنچا تو تمام اصناف سخن کے ساتھ ساتھ نعت گوئی بھی عروج پذیر ھوئی ۔

اردو میں نعتیہ شاعری کی مثالیں بالکل ابتدائی دور سے ملتی ھیں ۔ قدیم دکنی شعراء سے لے کر آج تک مسلسل نعتیں کہی گئی ھیں ۔ حضرت سید محمد حسینی ، نظامی

قلی قطب شاہ ، وجہی ، غواصی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ نے نعت میں طبع آزمائی کی ہے ۔ شمالی ہند میں بعض مسلسل غزلیں بھی نعت کے موضوع پر مل جاتی ہیں ۔ حاتم ، سودا ، میر تقی میر ، میر حسن ، نظیر اکبر آبادی ، مولانا اسمعیل میرٹھی ، انشاء ، جرات ، ناسخ ، ذوق ، مومن ، انیس ، اور داغ کے علاوہ شہیدی کے ہاں بھی نعتیہ کلام ملتا ہے ۔ شہیدی نے ایک نعتیہ دیوان بھی مرتب کیا ۔ ان کے بعد محسن کاکوروی اور امیر مینائی وغیرہ کا دور آتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :۔

" اردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین اور کامیاب ترین دور حقیقتاً محسن کاکوروی اور امیر مینائی سے شروع ہوتا ہے ۔ دونوں قال اللہ قال الرسول کے پابند اور حب رسول سے سرشار تھے ۔ دونوں نے نعتیہ شاعری میں ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا " ۔[1]

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر جن شعراء نے نعتیہ کلام لکھا ان میں مولانا الطاف حسین حالی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں ۔ حالی کے بعد اقبال کا نام نعت کے حوالے سے بہت اہم ہے ۔ آپ کی شاعری مذہب اسلام سے محبت ، حضور پاک سے عقیدت اور مذہبی احساس کی عکاس ہے ۔ ان کے ہاں نعت کے بلند پایہ اشعار مل جاتے ہیں۔

خبر ملی ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

---

1 ۔ فرمان فتحپوری ، ڈاکٹر " اردو کی نعتیہ شاعری " آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور ۔ 1976ء ، ص 55

اسی طرح سے ایک نعت میں براہ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے -

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب

گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

بیسویں صدی کے اردو شعراء میں نعت گو کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خاں کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے - آپ کے ہاں مذہبی جوش و خروش کا اظہار بڑی دلآویزی کے ساتھ ہوا ہے -

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

مذہبی شاعری سے دلچسپی کا اظہار صرف مسلمانوں ہی نے نہیں، غیر مسلم شعراء نے بھی کیا - چنانچہ پنڈت ہری چند اختر، تلوک چند محروم، عرش ملسیانی، مہاراجہ کشن پرشاد، منور لکھنوی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے ہاں بھی اچھی نعتیں مل جاتی ہیں -

حفیظ جالندھری نے " شاہنامہ اسلام " کے روپ میں نعتیہ شاعری کو ایسا تحفہ دیا ہے جو بے مثل ہے اور اردو شاعری میں گراں بہا حیثیت رکھتا ہے -

جدید نعت گو شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں :-

" نعت گوئی کا جدید شعور جو حالی ، اکبر، اقبال ، ظفرعلیخاں اور حفیظ جالندھری سے ہوتا ہوا احسان دانش، عبدالکریم ثمر، حفیظ تائب ، یوسف ظفر، انجم رومانی ، شعیم صدیقی ، راجہ عبداللہ نیاز اور عبدالعزیز خالد سے ہاتھ ملاتا ہوا نسبتاً بعد میں آنے والے نعت گو شعراء یعنی عاصی کرنالی ، عارف عبدالمتین، غافل کرنالی ، علیم ناصری ، امین راحت چغتائی ، احمد ندیم قاسمی ، شیر افضل جعفری ، حافظ افضل فقیر، حافظ لدھیانوی ، ساغر صدیقی ، سراج الدین ظفر ، مظفر وارثی ، غلام رسول ازہر اور قیوم نظر سے معانقہ کرتا ہوا اب نوجوان شعراء یعنی سیف زلفی ، جلیل عالی ، سلیم کوثر، انور مسعود، احسان اکبر، عطا الحق قاسمی اور جعفر بلوچ کی بلائیں لے رہا ہے" ۔1؎

زیبا ناروی کی نعت گوئی :

زیبا ناروی کے کلام میں متعدد نعتیں موجود ہیں ۔ ان کے کلام میں نعتوں کی تعداد تیرہ ہے ۔ زیبا کے ہاں ہئیتوں کا تنوع ملتا ہے ۔ انہوں نے غزل کے انداز میں بھی نعتیں لکھی ہیں اور مخمس میں بھی رسول پاک کی مدح سرائی کی ہے ۔ نعت کا فن اگرچہ مسلمانوں کے ہاں بہت پرانا ہے مگر آج بھی نعت کے ضمن میں بہت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے ۔ یہ راستہ اگرچہ بہت دشوار ہے لیکن زیبا اس راستے کو بڑی خوبی سے پار کر گئے ہیں ۔ زیبا کی نعت گوئی کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس

1۔ تحسین فراقی " جدید اردو نعت گوئی ایک جائزہ " شام و سحر نعت نمبر ۔ شمارہ 1، 2 [illegible]

فن کے تقاضوں کو ہر لحظہ ملحوظ رکھا ہے ۔ انہوں نے نعتیہ شاعری کیلئے تمام تر ضروری اور بنیادی شرائط کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے ۔

نعتیہ شاعری کیلئے ضروری ہے کہ انسان قرآنی علوم سے واقف ہو اور اس چیز کا احساس زیبا کے کلام کے مطالعے سے فوراً ہو جاتا ہے ۔ ان کی شاعری میں قرآنی افکار قرآنی تعلیمات اور قرآنی تلمیحات نظر آتی ہیں ۔ زیبا میں بے پناہ دوق شعر تھی اور اس کا ثبوت ان کی قادر الکلامی سے ہوتا ہے ۔ قرآن و حدیث پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے جو ان کی نعتوں میں بھر پور طریقے سے ظاہر ہوتی ہے ۔ ان کی نعتوں میں قرآن و حدیث کا علم مصرعوں کی صورت میں ڈھل کر سامنے آیا ہے ۔ قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے شان رسول میں جو نغمہ سنجی کی ہے ۔ وہ زیبا کے عالمانہ اور شاعرانہ کمال کی آئینہ دار ہے ۔ ان نعتوں میں عقیدت و خلوص کی فراوانی ، تخیل کی سرمستی اور کیف و سرور کی کیفیت ہے ۔

نعت گوئی کیلئے بنیادی شرط یہ ہے کہ آنحضور کی سیرت پر گہری نظر ہو ۔ زیبا نے اپنی نعتوں میں سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں کا ذکر بھی کیا ہے تاکہ اس سے لوگوں کو اسوہ حسنہ سے واقفیت حاصل ہو سکے ۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبی چلتی پھرتی نظر آتی ہے ۔

مداح کیوں نہ خلق ہو ساری رسول کی
سیرت بھی خوب شکل بھی پیاری رسول کی

ہیبت ہوئی نگاہوں پہ طاری رسول کی

اک اک قدم پہ بات ہے بھاری رسول کی

ارشاد مصطفی کے اجالوں میں دیکھئے

قرآن و اہلبیت کی حجت ، تمام ہے

تکمیل دین حق ہے محمد کی ذات پر

اسلام کا نظام ، حقیقی نظام ہے

پھر آنحضور کے جمال و انوار کو نہایت دلفریب پیرایہ بیان دیا ہے ، یوں لگتا ہے کہ صورت مقدس کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال دیا ہے -

حبیب کبریا جیسی کوئی صورت نظر آئی

کوئی اے آسماں اتنا حسین پیکر بھی دیکھا ہے

القمر والشمس ہر ذرہ کے لب پر آگیا

آشکارا جلوہ محبوب داور دیکھ کر

آئینہ گرنے سامنے رکھ کر اک آئینہ

کونین کو دکھائی ہے صورت حضور کی

نظر نے خواب کے عالم میں یہ منظر بھی دیکھا ہے

مدینہ بھی مدینہ کا مہہ انور بھی دیکھا ہے

اس کے علاوہ زیبا کی نعتیہ شاعری نعت کی روایت میں اس طرح اضافہ کرتی ہے کہ انہوں نے آنحضور کی زندگی کے بعض واقعات اور صحابہ کرام کے بعض واقعات کو اپنے کلام میں جا بجا پیش کیا ہے ۔

جنگ احد بتائے گی طاقت حضور کی
غار حرا سے پوچھو عبادت حضور کی

صدیق کا ہے صدق ، تو فاروق کی اذان
عثمان پر حیا کا مرتبہ تمام ہے

زیبا نے آنحضور کے معجزات اور شمائل و اوصاف کو بھی اپنے کلام میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ اکثر جگہ کامیاب ہوئے ہیں ۔ آنحضور کے معجزات خصوصاً شق القمر کو موضوع بنا کر رسول پاک کی ستائش کی ہے اور آپ کی اعلیٰ شان کو دکھایا ہے ۔

ہوئے ہیں چاند کے دو ٹکڑے انگلی کے اشارے میں
نظر سے دیکھنے والوں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے

جھکے پھول اٹھے ، شجر بھی ، حجر بھی
مؤدب ، مودب ہیں شمس و قمر بھی
مذاق طلب ، کچھ تجھے ہے " خبر بھی "
حبیب خدا کے کرم ہیں ادھر بھی

زیبا نے اپنی نعتوں میں بیشتر مقامات پر واقعہ معراج کی تفصیل بیان کی ہے ۔
دراصل زیبا شب معراج کے واقعہ کے ذریعے بھی آنحضور کی عظمت و رفعت آشکارا کرنا چاہتے

ہیں ۔ آپ کی ذات کا معجزہ یہ تھا کہ آپ پل بھر میں عرش کی سیر کر آئے ۔ شب معراج کی شہادت قرآن پاک میں بھی دی گئی ہے ، اور زیبا نے اس کی شان دکھا کر آنحضور کی فضیلت بیان کی ہے ۔

یہ شب معراج تھی شان حبیب کبریا
مرحبا کہنے لگے سارے پیمبر دیکھ کر

ایک نعت جو مخمس کی حیثیت میں ہے ، اس میں معراج کا پورا واقعہ وضاحت سے پیش کیا ہے ۔ پہلے تو آنحضور کی آمد پر عرش بریں کا رنگ دکھایا جا رہا ہے کہ آپ کی تشریف آوری پر کس قدر خوشی منائی جا رہی ہے ۔

قائم ہوئے پرے درحقیقت یہ حور کے
فطرت نے خم لنڈھا دیے کیف و سرور کے
بولی زمیں کہ آج ارادے ہیں دور کے
چومے گا آسماں بھی قدم اب حضور کے

جاتی ہے عرش پر وہ سواری رسول کی

آپ کے احترام میں فرشتے بہ ادب نگاہیں بچھائے کھڑے ہیں ۔ آپ کے دل میں تو خدا سے قرب اور ملاقات کا جذبہ موجود تھا ہی ، خود خدا تعالی بھی اپنے محبوب سے ملنے کیلئے بے تاب تھا ۔

ہے اہتمام خاص ادھر جلوہ گاہ میں
طوفان شوق ادھر دل عرفاں پناہ میں

اللہ رے عروج یہ معراج شاہ میں

صف بستہ کس ادب سے فرشتے ہیں راہ میں

جاتی ہے عرش پر وہ سواری رسول کی

آنحضور کو جس شان کے ساتھ آسمانوں پر لے جایا گیا اس کا نقشہ دیکھئیے۔

فرش زمیں سے سوئے طرف آسماں چلے

روح الامیں بچھائے نظر ہم عناں چلے

قدسی ادب کے ساتھ لیے درمیاں چلے

کس دھوم دھام سے شہ کون و مکاں چلے

جاتی ہے عرش پر وہ سواری رسول کی

اپنی ایک اور نعت میں زیبا معراج کی مقدس رات کا ذکر کرتے ہوئے آنحضور کی شان اور رفعت و عظمت کا بیان اس طرح کرتے ہیں ۔

وہ رات معراج کی عجب تھی کہ دونوں عالم ملے ہوئے تھے

چراغ امید جل رہے تھے تمام گوشے سجے ہوئے تھے

زمیں معطر، فلک منور، حسیں ترانے چھڑے ہوئے تھے

کھلے ہوئے تھے گل تمنا ، حجاب سارے اٹھے ہوئے تھے

انہیں کے جلوے انہیں کی جانب/سے ملنے گئے ہوئے تھے (اُنہیں سے)

ایک اور بند دیکھئیے ۔

احد میں اک میم کا اضافہ بنا گیا ہے کچھ اور نقشہ

کچھ اور عالم کچھ اور صورت کچھ اور باتیں کچھ اور قصہ

ادھر تجلی ، ادھر تجلی ، نظام جلوہ ، پیام جلوہ

بہ شان و عظمت بحد منظر اٹھا جو پردہ کھلا یہ عقدہ

انہیں کے جلوے انہیں کی جانب انہیں سے ملنے گئے ہوئے تھے

اس نعت خصوصاً پانچویں مصرعے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیبا حقیقت محمدی کو الوہیت سے اتنا قریب تصور کرتے ہیں کہ " دوئی " کا شائبہ بھی نہیں رہتا ۔ یہ تصوف کا گہرا اثر ہے ۔ ٹیپ کے اس مصرعے کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے ۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

زیبا کی نعت کا مطالعہ کرتے ہوئے جو عنصر نمایاں انداز میں جلوہ گر ہوا ہے وہ عشق رسول کا جذبہ ہے ۔ عقیدت و احترام اور آپ سے والہانہ محبت کا اظہار انتہائی عروج پر نظر آتا ہے ۔ سادگی کے ساتھ جوش و ولولہ بھی کارفرما ہے لیکن احتیاط بھی ملحوظ رکھی ہے، اور کہیں بھی حد سے تجاوز نہیں کیا ۔ بعض نعتوں میں عاشقانہ انداز ہے ۔ ایک عاشق صادق کی طرح محبوب سے اپنی بے پناہ وابستگی اور دیوانگی کا نقشہ کھینچا ہے ۔ مثلاً

خیال سرور کونین میں ہم، پی کے ہیں رقصاں

ہمیں ساقی پلاتا ہے نگاہوں سے مئے عرفاں

محمد کے در پر جو خم ہو گیا

فرشتہ ، خدا کی قسم ہو گیا

بڑی قیمتی شے ہے عشق نبی

مقدر میں سب کچھ رقم ہو گیا

اٹھی سوئے طیبہ جو زیبا نظر

خوشی مل گئی ، دور غم ہو گیا

یہ عاشقانہ انداز جو ہماری شعری روایت کا حصہ ہے، عاشق کی عقیدت کی عکاسی کرتا ہے ۔ اور دل پر شاعر کی رسول خدا سے محبت کا گہرا نقش چھوڑتا ہے ۔ یہ جذبہ اور ذوق و شوق ظاہر کرتا ہے کہ شاعر نے محض رسماً نعت گوئی کا سلسلہ قائم/کیا نہیں بلکہ اپنے والہانہ جذبات کے اظہار کے تحت اپنایا ۔ اس لیے سچے جذبے کا اثر گہرا ہوتا ہے ۔ دیکھئیے ایک جگہ شاعر نے محبت رسول میں اپنی دیوانگی کو کس قدر جذبے کا رنگ دیا ہے۔

زبان اہل خرد پر ہیں ان کے افسانے

نماز عشق نبی پڑھ رہے ہیں دیوانے

عقیدت اور عشق رسول کی مثال دیکھئیے ۔

وفا کر رہا ہوں وفا کر رہا ہوں

محمد پہ خود کو فنا کر رہا ہوں

نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا کر رہا ہوں

نماز محبت ، ادا کر رہا ہوں

ان نعتوں میں جذباتی خلوص اور گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ ایک مسلمان کیلئے آنحضور کا نام قلب و روح کی تسکین کا باعث ہے ۔ آپ کا تصور ہی نگاہوں میں حسن و رعنائی بھر دیتا ہے ۔ ترستی ہوئی آنکھیں سیراب ہو جاتی ہیں ۔ زیبا کی بعض نعتوں میں جذب و مستی اور گھلاوٹ کی ایک کیفیت نظر آتی ہے جس کی نمائندگی ان اشعار میں ہوتی ہے ۔

محمد کا جس وقت نام آ گیا ہے۔ عجب روح و دل کو پیام آگیا ہے

ہمیں لطف کیف دوام آگیا ہے۔ عقیدت کا آئینہ کام آ گیا ہے

نگاہوں میں حسن تمام آ گیا ہے

زیبا کی شاعری میں یہ رنگ عقیدت آنحضور کی ولادت ، آپ کی شان و شوکت اور سطوت و عظمت کے ذکر کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ آنحضور کے آنے سے دنیا میں برپا ہونے والے انقلاب کا ذکر بہت عمدگی سے کیا گیا ہے ۔ آپ کے دنیا میں تشریف لانے سے قبل ہر طرف کفر و جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ خدا کے بجائے لات و منات کی پوجا کی جاتی تھی ۔ ظلم و ستم کا دور دورہ تھا ۔ لیکن آپ نے آ کر توحید کا جلوہ دکھایا ۔ بت پرستی کے بت ٹوٹ گئے ۔ کفر و جہالت کا خاتمہ ہو گیا ۔ آپ غریبوں کے ہمدرد ، دکھیاروں کے درماں ، بیواؤں کے والی ، حقداروں کے حامی بن کر آئے ۔ آپ کی آمد سے دنیا بھر میں رونق آ گئی ۔

خدا کے گھر میں شہ مدینہ خدا کا جلوہ دکھا کے مانے

بتوں کی رخصت ہوئی خدائی ہجوم ظلمت مٹا کے مانے

مرے محمد شہہ دو عالم شفیع محشر حبیب داور

تمام امت کو دو جہاں میں سبھوں سے بڑھکر بنا کے مانے

بیک تکلم بہ یک تجلی بہ یک توجہ بیک اشارہ

ہٹائے دیوار کفر و ظلمت حضور انور ہلا کے مانے

یہی وہ کعبہ ہے جس میں اک دن خدائی لات و منات کی تھی

یہی وہ کعبہ ہے جس میں حضرت چراغ وحدت جلا کے مانے

آنحضور کی فیضان نظر کے کرشمے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

جمال محبوب کبریا سے جہان کون مکاں ہیں روشن

یہ وہ تجلی حق ہے زیبا ، نگاہ و دل میں سما کے مانے

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت بحیثیت رحمتہ للعلمین بیان کی ہے اور تمام نبیوں سے بڑھ کر اور زمین و آسمان کی ہر چیز کیلئے قابل احترام شخصیت قرار دیتے ہوئے ایسا سماں باندھا ہے کہ دل میں بے اختیار حضرت محمد کی محبت موجزن ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے جیسے خدا کی ساری خدائی رسول اکرم کی شان میں نغمہ زن ہے ۔ یوں تو بے شمار اشعار اس سلسلے میں بے مثال ہیں تاہم چند اشعار پیش ہیں۔

نوع بشر کو آپ کے دم سے ملا شرف

نام رسول پاک کو حاصل دوام ہے

مشتاق سب پیمبر عالی مقام ہیں

ورد زباں سبھوں کے درود و سلام ہیں

محمد کے فدائی ہیں مکان و لامکاں دونوں
فدائی میں وہ آئے رحمتہ للعلمین ہو کر

آپ احمد المرسلین اور خاتم النبین ہونے کے حوالے سے وسیلہ رحمت اور وسیلہ نجات بھی ہیں ۔ چنانچہ اس حوالے سے بھی بعض اشعار زیبا کی نعتوں میں ملتے ہیں ۔

بگڑی ہوئی بنائیں گے امت کے خیرخواہ
دل کی مراد پائیں گے امت کے خیر خواہ
بخشش کا ذکر لائیں گے امت کے خیر خواہ
امت کو بخشوائیں گے امت کے خیرکا خواہ
اس پر خدائے کون و مکاں مہرباں ہوا
جس پر پڑی ہے چشم مروّت حضور کی

روضۂ رسول پر حاضری دینے کی آرزو ان کے ہاں بھی مچلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اور وہ خدا سے دعا گو ہیں کہ انہیں آنحضورؐ کے در پر پہنچا دے اور ان کا ارمان پورا کر دے ۔

جو اک گردش میں پہنچا دے مدینے تک مجھے زیبا
مری تقدیر کا ایسا کوئی چکر بھی دیکھا ہے
آرزو یہ ہے کہ اک دن یوں میسر دید ہو
دیکھتے ہی جائیں ہم طیبہ کا منظر دیکھ کر

آپ کے نقش قدم پر چلنا دنیا میں کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہے ۔

دستور زندگی ہے محبت حضور کی
آئین بندگی ہے، اطاعت حضور کی

شاعر کو آنحضور کا گدا ہونے پر فخر ہے ۔ یہ ایسا مقام ہے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں ۔

میں ہوں زیبا کوچۂ عشق محمد کا گدا
قدسیوں کو رشک ہے، میرا مقدر دیکھ کر

محمد کا جس پر کرم ہو گیا
اسے عالم سینۂ بہم ہو گیا

ہے سرفراز خلق میں امت حضور کی
رتبے بلند کر گئی نسبت حضور کی

آپ کی زیارت کا ذوق و شوق ایک اور نعت میں اس طرح نظر آتا ہے ۔

رسائی کی طلب شام و سحر ہے بیٹھتے اٹھتے
تصور میں فقط آقا کا گھر ہے بیٹھتے اٹھتے
بس ان کا آستاں پیش نظر ہے بیٹھتے اٹھتے
خیال مصطفے آٹھوں پہر ہے بیٹھتے اٹھتے

زیبا کی نعتوں میں جذبے کی لہر رواں دواں ملتی ہے ۔

بڑی پاکیزہ اک تنویر پھر جاتی ہے آنکھوں میں

ضیائے آیۂ تطہیر پھر جاتی ہے آنکھوں میں

کلام اللہ کی تفسیر پھر جاتی ہے آنکھوں میں

نبی کے نور کی تحریر پھر جاتی ہے آنکھوں میں

ان کی نعتوں میں تاثیر موجود ہے ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقیدت ، علمیت اور اس کے ساتھ ساتھ زبان پر عبور نے مل جل کر ان کے نعتیہ سرمائے کو اہم بنا دیا ہے ۔ زیبا کی نعت گوئی میں فنی مہارت اور طرز احساس کی بصیرت دونوں شامل ہوتی ہیں ۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں ان کی نعتیہ شاعری میں اپنی ساری جمالی اور جلالی خصوصیات کے ساتھ بروئے کار آتی ہیں ۔ زیبا کو پرانے علوم ، علم حدیث، اسلامی تاریخ اور سیرت پاک سے متعلق وسیع معلومات حاصل تھیں ۔ اسی کی بدولت وہ نعت گوئی میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ نعت گوئی کیلئے ان سارے علوم کو جاننا ضروری ہوتا ہے ۔

زیبا کی نعتوں میں مناجات کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے ۔ اسی طرز احساس کی نمائندگی حالی اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نعتوں میں کی تھی کہ مسلمانوں کو اس پر آشوب صورتحال سے نکلنے کیلئے آنحضور کے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے ۔ اس طرح ان کی نعت گوئی کا رشتہ گرد و پیش کی صورتحال سے استوار ہو گیا ۔ زیبا نے بھی اپنی نعتوں میں اس حقیقت کی نشاندھی کی ہے کہ آپ کا نام ہر مشکل سے نجات کا باعث ہے ۔ سب آپ کے نور سے فیض پاتے ہیں ۔ آپ کی برکتوں کے احسان کو تسلیم کرتے ہیں ۔

یا محمد مصطفیٰ کہتے ہیں جس دم دل سے ہم
پاتے ہیں چھٹکارا درد و غم کی ہر مشکل سے ہم

المدد فخر دو عالم المدد یا شہ دیں
آ پھنسی کشتی بھنور میں چھٹ گئے ساحل سے ہم

شاہ بطحا کے غلام اور اس قدر ہوں بے قرار
اے خدا شکرا گئے یہ کون سی منزل سے ہم

خانۂ دل میں ہے مہماں حسن محبوبِ خدا
فیض پاتے ہیں سراسر جلوۂ کامل سے ہم

ہم کو تابندہ نظر آتا ہے نقشِ مصطفیٰ
دیکھتے ہیں جس طرف زیبا نگاہ دل سے ہم

زیبا کی نعت گوئی محض عقیدت و محبت کا مرقع ہی نہیں بلکہ فنی شعور اور زبان و بیان کے عمدہ معیار کی بھی حامل ہے ۔ انہیں اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی یکساں دسترس تھی ۔ جس کی وجہ سے ان کی نعتیں پختہ فنی شعور پر دلالت کرتی ہیں ۔ آنحضور کی سیرت کا جو نقشہ شاعر نے کھینچا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے سیرت رسول کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے ۔ یوں زیبا کے ہاں نعتوں میں جذبے کے ساتھ ساتھ استدلالی انداز بھی رواں دواں ہے ۔ مجموعی طور پر ان نعتوں کی زبان پاکیزہ اور شستہ ہے، لیکن زبان و بیان میں عربی، فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں ، جذبے اور

احساس کے مطابق سبک ، شیریں اور پر شکوہ الفاظ اپنے اپنے موقعوں پر آئے ہیں ۔ کہیں تشبیہہ و استعارے سے بھی کام لیتے ہیں ۔

کہاں یہ اشک ہیں زیبا ہماری آنکھوں میں
شراب یاد نبی سے بھرے ہیں پیمانے

جنت و تسنیم و کوثر ہے، جمال مصطفے
کیا کریں ہم جنت و تسنیم و کوثر دیکھ کر

مختلف صنعتوں کے استعمال نے بھی ان کی نعتوں میں ایک نرالی شان پیدا کی ہے ۔ صنعت تضاد ، صنعت تلمیح ، صنعت ترصیع کا استعمال زیادہ ملتا ہے ۔ صنعت تضاد کی مثال دیکھئیے

در رسول پر اپنوں کا تذکرہ کیا ہے
مزا تو یہ ہے کہ آ کر جھکے ہیں بیگانے

کچھ اس ادا سے حبیب خدا نے درس دیا
جو بت کدے تھے نظر آئے وہ خدا خانے

صنعت تلمیح کا استعمال دیکھئے ۔

جنید و شبلی و منصور پی گئے کیسی
ذرا یہ راز تو سمجھیں کہاں ہیں فرزانے

ان نعتوں میں جذبہ اور سوز و گداز کی انتہا کے ساتھ ساتھ ایک صوتی آہنگ اور روانی جاری و ساری ہے جو شاعر کے جذباتی احساس کو شدید تر کر دیتی ہے اور

قاری پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ غرض یہ کہ زیبا کی نعتیں بے مثال جذبے اور ترنم کی حامل ہیں ۔ ان میں تغزل اور سرمستی کی فضا بھی ملتی ہے ۔ موسیقیت و شگفتگی کی لہریں بھی نظر آتی ہیں ۔

تصور کی دنیا میں جس آن نکلے　　شہہ دو جہاں یوں بصد شان نکلے

مری چشم حسرت کے ارمان نکلے　　مراحل تجلی کے آسان نکلے

نگاہوں میں حسن تمام آ گیا ہے

زیبا نے چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں کو اختیار کیا ہے اور سب بحروں میں ان کی طبیعت دریا کی طرح بہتی ہے ۔

لمبی بحر کی مثال دیکھئے ۔

مرے محمد شہہ دو عالم شفیع محشر حبیب داور

تمام امت کو دو جہاں میں سبھوں سے بڑھ کر بنا کے مانے

حضور اقدس تو ہیں بڑی شے، مگر غلامان شاہ والا

جب اہل باطل کی سمت گزرے پیام حق کا سنا کے مانے

چھوٹی بحر کی روانی بھی قابل دید ہے ۔

جو بجلی کی صورت ہنسا طور پر

وہی نور شمع حرم ہو گیا

مدینے کی جانب جو اٹھے قدم
فضا پھر غم پیچ و خم ہو گیا
وضوئے محمد کا پانی تمام
تبرک ، خدا کی قسم ہو گیا

ان میں شگفتگی اور نادر الکلامی کا ثبوت بھی ملتا ہے ۔ سہل ممتنع کی مثالیں بھی موجود ہیں ۔

الغرض یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر زیبا کی نعتوں کو نعت گوئی کی روایت میں اہم مقام دیا جا سکتا ہے ۔ زیبا کو فن نعت سے فطری مناسبت تھی ۔ انہوں نے روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کی نعتیہ شاعری کے افق کو پھیلایا اور فکر و فن کے اعتبار سے اردو نعت کی روایت میں اضافہ کیا ۔

سلام :

شبلی نے سلام کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

" اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل پر قائم ہوئی ۔ اقسام سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے مسدسوں کا طریقہ اختیار کیا لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے ۔ اس بنا پر انہوں نے غزل کی طرح سلام ایجاد

کیا ۔ سلام کی بحر وہی ہوتی ہے جو غزل کی ہوتی ہے ۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ ہوتا ہے ۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی ، بندش سادہ اور صاف ، مضمون درد انگیز اور پر تاثیر ہو" [1]۔

گویا سلام ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں رسول اکرم ، آئمہ کرام ، اہل بیت اطہار اور خاصان خدا کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے ۔ حضرت امام حسین اور ان کے اہل و عیال کا ذکر خصوصی طور پر ہوتا ہے ۔ ان اصحاب نے حق و صداقت کی خاطر جو عظیم قربانیاں دی تھیں ان پر خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے ۔ اس طرح ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد امت مسلمہ میں نیکی اور خیر کی ترغیب کا جذبہ ابھارا جاتا ہے ، اور یہی " سلام " کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے ۔۔ احسن زیدی لکھتے ہیں :۔

" اول اول سلام کا مقصد حضور اکرم اور دیگر بزرگان دین کی روحوں پر درود و سلام بھیجنا ہوتا تھا ، اور اس کیلئے ضروری نہیں تھا کہ شاعر غزل کی عروضی ہئیت استعمال کرے ۔ متقد مین کے ہاں مثلث مربع یا مخمس میں بھی سلام موجود ہیں ۔ زمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ادبی شعور بھی ترقی کرتا گیا اور مرثیہ گو شاعروں نے مجلس عزا کے بدلتے ہوئے تقاضوں

---

1 ۔ " موازنہ انیس و دبیر" ، سرتاج بکڈپو لاہور ، ص121

کے تحت سلام کی ہئیت اور نفس مضمون میں بھی تبدیلیاں کر دیں ۔ چنانچہ غزل کا عروضی سانچہ اس کیلئے مناسب خیال کیا گیا اور موضوع کو پھیلا کر واقعہ کربلا اور تذکرہ اہل بیت اس میں شامل کر دیئے گئے " ۔[1]

" سلام " کو ابتداء میں آنحضور پر درود بھیجنے اور دینی شخصیات کے اوصاف بیان کرنے کے طور پر برتا گیا لیکن بعض مرثیہ گو شاعروں نے آپ کے اوصاف حمیدہ اور آپ پر درود و سلام بھیجنے کیلئے اس صنف سخن کو مخصوص کر لیا ۔ چنانچہ شمیم احمد کا کہنا ہے :۔

" وہ نظمیں جن میں حضور سرور کائنات کی تعریف کی جاتی ہے اور جن میں لفظ سلام استعمال ہوتا ہے وہ بھی سلام کہلاتی ہیں "۔[2]

ایسے سلاموں میں مولانا احمد رضا خاں کا سلام ۔۔

" مصطفی جان رحمت پہ لاکھوں سلام " خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ جدید دور میں حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں کو بھی خصوصی شہرت حاصل ہوئی ہے ۔ حفیظ کا یہ سلام بہت مشہور ہے ۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی

1۔ " اردو میں منقبت نگاری " مقالہ پی ایچ ڈی اردو 1984ء مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

2۔ درس بلاغت ، ترقی اردو بیورو نئی دھلی ، ص 155

اردو شاعری میں سلام نے مرثیے کے ساتھ ہی جنم لیا اور ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت اختیار کر لی ۔ سلام میں فلسفہ اخلاق ، حزن و الم کے جذبات ، بے ثباتی کائنات اور دیگر مذہبی و اخلاقی موضوعات بیان کیے جاتے ہیں ۔ لیکن اب سلام کا تصور صرف کربلا کے المناک واقعات بیان کرنے کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ سلام عام طور پر مجالس عزاداری میں پڑھے جانے کیلئے لکھے جاتے ہیں اس لیے یہ درود اثر سے لبریز ہوتے ہیں ۔ سلام میں ابتداء میں ردیف کے طور پر سلام کا لفظ لایا جاتا تھا اور انہیں مربع و مفرد دونوں طرح سے لکھا جاتا رہا ، لیکن بعد میں جب لکھنو میں مرثیے کو ترقی ہوئی تو سلام کی یہ شکل بھی تبدیل ہو گی ، اور سلام کو غزل کی ہئیت میں لکھا جانے لگا جن محافل میں سلام پڑھے جاتے ہیں انہیں "مسالمہ" کہا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں :۔

" اردو مرثیہ کی طرح سلام نے بھی دکن میں جنم لیا ۔ مرثیہ گو شعراء سلام بھی کہا کرتے تھے ۔ شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد میں مرثیہ گوئی شروع ہوئی تو شمالی ہند کے بعض شعراء بھی نوحے، سلام اور مرثیے کہنے لگے ۔ فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی شہرہ آفاق فارسی کتاب کا اردو میں " کربل کتھا " کے نام سے ترجمہ کیا ۔ اس میں بارہ اشعار کی ایک نظم سلام کی تکنیک میں ہے ۔ سلام کو عروج لکھنو اور دہلی سے ہوا ۔ سودا کی کلیات میں بارہ سلام اور بہتر مراثی ہیں ۔ میر تقی

میر ، قائم چاند پوری اور مصحفی و میر حسن کے ہاں بھی سلام اور نوحے

موجود ہیں " 1 ۔

لکھنو میں مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ سلام گوئی کو بھی ترقی حاصل ہوئی ۔ مرزا دبیر کے کلام میں مراثی کے ساتھ ساتھ تین سو سلام شامل ہیں ۔ مرزا دبیر کے سلاموں ، نوحوں اور رباعیوں کی تعداد ان گنت ہے ۔ میر انیس نے بھی سلام پر طبع آزمائی کی ۔ ان کے سلاموں میں فصاحت ، سادگی ، شگفتگی و دلکشی ، بندش کی چستی اور روانی کے علاوہ دردو اثر کی فراوانی ہے ۔ دور جدید میں بھی سلام کہے گئے ہیں اور ان میں وہ شعراء قابل ذکر ہیں جو مرثیے کی صنف کو فروغ دے چکے ہیں ۔ ان میں عزیز لکھنوی ، احمد ندیم قاسمی ، کلیم عثمانی ، طفیل ہوشیار پوری ، اقبال عظیم ، مظفر وارثی ، سیف زلفی اور صہبا اختر نے بھی سلام لکھے ہیں ۔ اس صنف کو مستقل اپنانے والوں میں قیصر بارہوی ظفر شارب ، آل رضا ، نسیم امروہوی ، صہبا اکبر آبادی اور وحید الحسن ہاشمی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ یہ روایت عہد قدیم کی طرح آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور غم حسین کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گی ۔

زیبا ناروی کے غیر مطبوعہ کلیات میں کئی سلام شامل ہیں ۔ انہوں نے سلاموں کے سلسلے میں قدیم مروج ہئیت یعنی غزل ہی کو نہیں برتا بلکہ ان کے سلام غزل کے علاوہ مسدس اور مخمس کی ہئیت میں بھی ملتے ہیں ۔ اور یوں ان کے ہاں ہئیتوں کا تنوع موجود ہے ۔

---

1 ۔ سید صفدر حسین " رزم نگاران کربلا " (سنگ میل پبلی کیشنز لاہور) طبع اول 1977ء ص 21،22

ان سلاموں کی تعداد آٹھ ہے ۔ ان کے سلاموں کا انداز روایتی ہے ۔ عقیدت اور روایت کو مربوط کرکے سلام کے اشعار کی صورت دے دی گئی ہے اور تاثر کا اظہار کیا گیا ہے ۔ یہ سلام مجالس عزا کے اعتبار سے بہت خوب ہیں اس کے علاوہ ادبی معیار کے لحاظ سے بھی بلند ہیں ۔ سلام کی روایت عموماً واقعات کربلا سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ زیبا کے سلام بھی خالصتاً واقعات کربلا سے تعلق رکھتے ہیں ، البتہ کہیں کہیں اپنے تاثرات و کیفیات کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔

زیبا اہل بیت سے خصوصی لگاو رکھتے تھے ۔ وہ ان کے غم میں دل فگار تھے ۔ ان کی آنکھیں ان پاک ہستیوں پر ٹوٹنے والی قیامتوں پر اشکبار رہتی تھیں ۔ اس لیے وہ جہاں بھی ان مصائب کا ذکر کرتے ہیں ، ان کا قلم خون کے آنسو بہانے لگتا ہے اور اس سے نکلنے والا ہر لفظ سوگوار اور افسردہ معلوم ہوتا ہے ۔ شہدائے کربلا کی شہادت حضرت امام حسین پر جبر ، حضرت عباس پر ستم ، حضرت علی اکبر کی جواں شہادت ، معصوم علی اصغر کی پیاس ، یہ سب دلگداز واقعات انہیں غمناک کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ ان تمام کا ذکر اپنے سلاموں میں کرتے ہیں ۔

کربلا میں قیامت اٹھائی گئی

دم بدم اک شقاوت جتائی گئی

آنکھ رحم و کرم سے چرائی گئی

چاند سی شکل اکبر مٹائی گئی

ہر بلا ابن حیدر پہ لائی گئی

حضرت امام حسین کے اہل خاندان کو جس طرح ایک ایک کرکے ختم کیا گیا اس ظلم پر رد عمل کا اظہار دیکھئے ۔

زخم کھا کر گرے قاسم نامور
تیر سے حلق اصغر چھدا سربسر
اور خوش ہو رہے تھے بہت اہل شر
روئے جن و ملک رنگ یہ دیکھ کر

خون کی نہر ہر سو بہائی گئی

زیبا کے سلامی میں جذبہ و خلوص اور سوز و گداز کی شدت کچھ اس انداز سے ملتی ہے کہ ہر پڑھنے والی آنکھ نمناک ہو جاتی ہے ۔ وہ خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں ۔ غزل کی ہئیت میں اپنے دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

اے سلامی خاک میں خورشید پنہاں ہو گیا
شامیوں کا ہر ستم ظلمت بد اماں ہو گیا
لٹ گئی خاتون جنت کے گلستاں کی بہار
دوپہر میں سارا شیرازہ پریشاں ہو گیا
جس قدر چھینٹیں اڑیں پہنچیں جبین چرخ پر
شامل رنگ شفق خون شہیداں ہو گیا

میدان کربلا میں نواسۂ رسول کی آل و اولاد کو تین روز تک بغیر کچھ کھائے پئے کوفہ کی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ ظاہر ہے چند آدمی پوری فوج پر غلبہ نہیں پا سکتے/ تھے

چنانچہ دشمنوں کے ساتھ بےجگری سے لڑتے ہوئے یکے بعد دیگرے سب شہید ہو گئے -

قہر کے پھندے ہر سو لگائے گئے

تین دن بھوکے پیاسے ستائے گئے

خوب جی کھول کر ظلم ڈھائے گئے

پھر تہہ خاک مہماں سلائے گئے

تیغ ایک ایک پر آزمائی گئی

زیبا نے اپنے سلاموں میں شہادت کا منظر بڑے درد ناک انداز سے بیان کیا ہے اس کی مثال/دیکھئیے - مخمس میں

سر کٹ گیا ایک ایک کا   کوئی نہ باقی رہ گیا

روشن زمین کربلا   قاسم کا جب لاشہ اٹھا

اکبر گئے ، اصغر چلے

علی اکبر اور علی اصغر کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بیان میں خاص طور پر شدت آ جاتی ہے - ان جانثاروں کو جس امتحان سے گزرنا پڑا ، دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی -

آہ ایسا امتحاں ابن علی کے واسطے

کربلا کا ذرہ ذرہ دشمن جاں ہو گیا

نوجواں اکبر کا لاشہ کیا لحد میں دفن ہے

چودھویں کا چاند زیر خاک پنہاں ہو گیا

بے خطا معصوم اصغر بھی ہوئے رن میں شہید

حرملہ کا تیر پیوست رگ جاں ہو گیا

حضرت امام حسین نے اپنا پورا گھر بار خدا کی راہ میں لٹا دیا ۔ دین اسلام کو زندہ رکھنے کی خاطر جو عظیم قربانی آپ نے دی اسے قیامت تک یاد رکھا جائے گا اور آنسوؤں کے نذرانے پیش کیے جاتے رہیں گے ۔ اسلام کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی زندہ رہیں گے ۔ آپ کی یہ جنگ بادشاہت یا اقتدار کی جنگ نہیں تھی ، یہ تو حق و باطل کا معرکہ تھا ۔ اسلام کو زندہ رکھنے کا عزم تھا ۔ جسے تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا گیا ہے ۔ وہ اپنی جان دے کر اسلام کا نام بلند کر گئے ۔

اک اک نے سر کٹا دیا اسلام کے لیے

راہ خدا میں مٹ گئے مہمان کربلا

چالیں وہ اہل شر چلے	تیر ستم دل پر چلے
نیزے چلے خنجر چلے	سر دے کے یوں سرور چلے

اسلام زندہ کر چلے

زیبا نے ان سلاموں میں اکثر واقعات کربلا سمیٹ دیے ہیں ۔ ان کو پڑھنے سے میدان کربلا میں اہل بیت کے شب و روز ، ان کی حالت ، اس ماحول کی پوری تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ ہم ہر واقعے سے آگاہ ہو جاتے ہیں ۔ یزید نے جس طرح بیعت کیلئے آپ کو مجبور کیا اور حضرت امام حسین نے انکار کر دیا ، پھر اس کے بعد کے سارے حالات

جن سے امام حسین کو گزرنا پڑا یعنی آپ کا اپنے خاندان کے بہتر افراد کے ساتھ اپنے مسکن کو چھوڑ کر کربلا کے میدان میں خیمہ زن ہو جانا ، یزید کا آپ کے اہل و عیال پر پانی بند کر دینا ، ننھے بچوں کا پیاس میں بلکنا ، امام حسین کے خاندان کے ایک فرد کا یکے بعد دیگرے شہید ہونا ، حضرت امام حسین کا بہنوں کو تسلی دینا اور آخر کار خود بھی بہادری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش فرمانا پھر آپ کی قربانی کے بعد خیموں کو آگ لگا دینا اور پاکیزہ عورتوں کو شام کے دربار میں لے جانا ، باقی افراد کے ساتھ نہایت برا سلوک کرنا ، ان تمام واقعات کے متعلق معلومات ہمیں زیبا کے سلاموں میں مل جاتی ہیں ۔ ان اشعار میں جو سوز ، تڑپ اور درد ہے وہ ہمیں اس واقعہ کی شدت کا احساس دلاتا ہے ۔

مکے سے جو چلا تھا پہنچے کربلا کبھی — اب تک دکھائی دیتا ہے وہ کارواں مجھے

اصغر یہ کہہ رہے تھے تبسم کے روپ میں — لاکر تھمائیے تو کوئی تیر و کماں مجھے

زیبا کے سلاموں میں یزید کیلئے شدید نفرت اور حضرت امام حسین اور ان کے جانثار ساتھیوں کیلئے انتہائی عقیدت اور خراج تحسین موجود ہے ۔ وہ اہل بیت کے عزم و حوصلہ اور پاس احکام خدا وندی کو احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یزید اور اس کی فوج کو ملامت کرتے ہیں ۔ اہل بیت کا ہر عمل قابل تحسین اور لشکر یزید کا ہر فعل قابل نفرین ہے ۔

اس طرف مد نظر ہے منزل صبر و رضا

اس طرف ظلم و ستم کی راہ ہیں اشقیا

ہر قدم پر سامنے ہیں تیغ تو رنج و محن

دار سے نیزوں کے چھلنی ہو گیا سارا بدن

یہ بھی ہے معلوم ملنے کا نہیں دو گز کفن

مرضی حق پر ہیں کیا کیا شاد شاہ بے وطن

زیبا نے اپنے سلاموں میں آنسوؤں کے نذرانے اور عقیدت کے پھول حضرت امام حسین کی خدمت میں پیش کیے ہیں ۔

سلام ان پہ کہ ظاہر ہوئے سپر کی طرح

حسین آئے ہیں ہم سب میں چارہ گر کی طرح

غم امام میں بہتے ہیں میری آنکھوں سے

کچھ اشک لعل کی مانند ، کچھ گہر کی طرح

انہیں واقعات کربلا کے منظر نہیں بھولتے ۔ بھوک پیاس کا عالم ، ماتم ، خیموں کے اجڑنے کا نقشہ ، لڑائی وغیرہ ان تمام جزئیات کی تفصیل سے تصویر کشی ملتی ہے ۔ مثلاً

جناب حر کی یہ صورت ہوئی لڑائی میں

جبیں کے بل نظر آنے لگے تبر کی طرح

موجیں پکارتی ہیں یہ اب تک فرات کی

پیاسے شہید ہو گئے مہمان کربلا

آنکھیں لگی ہوئی ہیں شب و روز اس طرف
میری نظر میں ہے چمنستان کربلا
چلو میں لے کے چہرہ پہ ملنے لگے حسین
معصوم کا لہو سر میدان کربلا

اس خونریز منظر کو دیکھ کر کائنات کا ہر ذرہ محو یاس ہے ۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے اور دھرتی جل گئی ہے ۔ لیکن ظالموں کو رحم نہیں آتا ۔ مندرجہ ذیل سلام مخمس کی ہئیت میں ہے ۔ اس میں تصویر کشی دیکھئیے۔

اف اف یہ خونی داستاں — آف یہ ستم اف یہ سماں
لوٹا گیا کل کارواں — کوئی ہے بس محو فغاں
شبیر پر خنجر چلے

ہلنے لگی ساری زمیں — تھرا گیا چرخ بریں
ایسے ستم دیکھے نہیں — عباس پر ٹوٹے لعیں
شکیزہ جب بھر کر چلے

حضرت امام حسین بے مثال شوق و جذبے کے مالک ہیں ۔ دشمن ان پر وار کرتے ہیں لیکن وہ ہنسی خوشی اسے خدا کی رضا سمجھ کر قبول کرتے جا رہے ہیں۔ زیبا کہتے ہیں کہ حضرت امام اپنی امت کی بخشش کا ذریعہ ہیں ۔

بخشش امت کی خاطر غم اٹھاتے ہیں حسین
دم لبوں پہ ہے دعائیں کرتے جاتے ہیں حسین

کربلا میں دم بدم آزار پاتے ہیں حسین

مجری راہ خدا میں سر کٹاتے ہیں حسین

قہر برساتے ہیں اعدا مسکراتے ہیں حسین

آپ کے عزم و استقلال میں کوئی دراڑ پیدا نہیں ہوئی ۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی رنجیدہ خاطر نہیں ہوئے ۔ آپ ایک شہید کی موت مرے ۔ آپ نے اپنی جان قربان کر دی لیکن اپنے اصولوں سے روگردانی کرنا گوارا نہ کیا ۔

رہ گئے ابن علی تنہا کوئی حامی نہیں دشمن جاں کون سا کوئی نہیں شامی نہیں

پھر بھی ان کے عزم و استقلال میں خامی نہیں خندہ برلب آپ ہیں کچھ رنج ناکامی نہیں

قہر برساتے ہیں اعدا مسکراتے ہیں حسین

لیکن انہیں یقین ہے کہ عاشقان رسول کی یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی ۔ ان کا یہ خون رنگ لائے گا اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا مل کر رہے گی ۔

خون ناحق حشر بن کر رنگ اک دن لائے گا شق زمیں ہوجائےگی اور آسماں تھرائے گا

ہر شقی اپنے کئے پر سربسر پچھتائے گا اس سے بڑھ کر کیا کوئی زیبا ستایا جائے گا

قہر برساتے ہیں اعدا مسکراتے ہیں حسین

زیبا نے ان موضوعات کو محض رسمی طور پر نہیں باندھا بلکہ پورے شعور، توجہ اور فکر و فن کی جولا نگاہ بنایا ۔ یہ اشعار ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں ۔ وہ امام حسین کے غم میں رونے کو عبادت قرار دیتے ہیں اور بخشش کا وسیلہ بھی ۔

خون دل رہا جو اے زیبا غم شبیر میں

حشر کے دن اس کی بخشش کا بھی ساماں ہو گیا

دعا مانگتے ہیں کہ میں آپ کا گدا ہوں ، اپنی نوازش کرم مجھ پر بھی فرمائیے تاکہ میری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں ۔

زیبا کے حال زار پہ بھی چشم لطف ہو

وہ آپ کا غلام ہے سلطان کربلا

جو آپ کا غلام ہو جائے اسے پھر کوئی غم نہیں رہتا ۔ آپ کی رحمت کے زیر سایہ وہ ہر پریشانی سے دور رہتا ہے ۔ کربلا کا غم اتنا مقدس اور عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں دوسری غموں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ۔

مجھ کو جلائے آئی ہیں کیا غم کی بجلیاں

میں ہوں فدائے جلوہ سلطان کربلا

زیبا ناروی کے سلاموں میں سوز و گداز ، تڑپ اور شدت پائی جاتی ہے ۔ بہ عشق حسین میں سرشار تھے ۔ انہیں اہل بیت کے ذکر سے خصوصی لگاؤ تھا ۔ ان کی داستان کہنے میں دلی سکون محسوس کرتے تھے ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ان کے غم میں میرے اشک بہتے رہیں گے ۔

ذکر حسین پاک ہے بے حد رواں مجھے

سمجھے نہ انجمن میں کوئی بے زباں مجھے

بھولے گی حشر تک نہ شہادت حسین کی
رلوائے گا لہو یہ غم جاوداں مجھے

بجھتا نہیں ہے شعلۂ غم اہل بیت کا
بہا رہے ہیں کس لیے اشک رواں مجھے

زیبا کسی کے دل کی لگی دیکھتا ہے کون
دنیا سمجھ رہی ہے فقط نوحہ خواں مجھے

انہیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ حضرت امام حسین کے غم سے سرشار اور ان کی محبت میں دیوانے ہیں ۔

جنوں کی داد ملے گی حسین سے مجھ کو
وہ مسکرائیں گے محشر میں داد گو کی طرح

اڑے ہیں لے کے مجھے شاہ کربلا کی طرف
بروئے کار ہیں جذبات ، بال و پر کی طرح

ظاہر ہے کہ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت وہی شخص جان سکتا ہے جس کے دل میں اہل بیت کیلئے الفت و عقیدت کا جذبہ ہو ۔

سمجھ سکیں گے وہی گرم آنسوؤں کو مرے
ملا ہے سوز جنہیں شمع کے جگر کی طرح

سلام کہنے میں بھی زیبا عاجزی کا اظہار کرتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں کہ آپ کے شایان شان آپ کو نذرانہ عقیدت پیش کر سکوں ۔

سلام کہنے کی جرأت کہاں مجھے زیبا

انھیں کہہ گئے سب کچھ گل و شرر کی طرح

آپ کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ کائنات کی ہر شے سلامی کیلئے بے تاب ہے - قیامت کے روز آپ اس شان سے جلوہ گر ہوں گے کہ آسماں تک سر جھکا دے گا - مسدس کی ہیئت میں کہتے ہیں -

اس ادا سے ہر سطر تحریر ہونی چاہئیے

رونما تحریر سے تنویر ہونی چاہئیے

آئین قرآں کی یوں تفسیر ہونی چاہئیے

حسن کی منہ بولتی تصویر ہونی چاہئیے

آسماں جھک جائے اس ذات گرامی کیلئے

اور چڑھتا چاند اتر آئے سلامی کیلئے

سبھی زمانے میں عالی مقام کہتے ہیں

بہار و باغ و گل تر سلام کہتے ہیں

عیاں ہوا ہے مہہ نیم ماہ مجری کو

وہ آئے ہیں جنہیں آخر امام کہتے ہیں

زیبا نے ایک اور سلام مخمس ترجیع بند کی ہیئت میں لکھا ہے - اس میں انھوں نے حضرت امام حسین کی رفعت و عظمت کا بیان تفصیل سے کیا ہے ، اور آپ پر سلام بھیجا ہے - آپ کے دم سے شہادت کی شمع میں روشنی پیدا ہوئی ہے - آپ کی شہادت نے بہت

واضح کر دیا کہ وفا کا راستہ کون سا ہے اور ان کی شہادت کا مقصد دین حق کی سربلندی ہے ۔ ان شہیدوں کا لہو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے ۔ یہ معرکہ اس سے پہلے روئے زمین پر نہ کبھی ہوا تھا اور نہ آئندہ ہو سکے گا ۔ آپ روز قیامت شفاعت کا راز ہیں ۔ حضرت امام حسین صبر و استقامت کی مثال ہیں ۔ آپ نے شہادت کا فرض ادا کر دیا ہے ۔ آپ کے خاندان کا کوئی فرد زندہ نہ بچ سکا ۔ جس پر زلزلہ آگیا ، زمین کانپ گئی ۔ آسمان لرز اٹھا ۔ یہ ایسا حادثہ ہے جو سر محشر بھی رنگ لائے گا ۔ کیونکہ یہ ایسا قتل ہے جس کا خون بہا ادا نہیں کیا جا سکتا ۔ مثال کے طور پر ایک بند دیکھئیے ۔

سلام ان پہ کہ آئین رہبری لائے　　سلام ان پہ کہ آداب آگہی لائے

سلام ان پہ کہ تنویر حق رسی لائے　　سلام ان پہ کہ اسرار بندگی لائے

حسین شمع شہادت میں روشنی لائے

بحیثیت مجموعی زیبا کے سلاموں میں جذبات و عقیدت کی فراوانی ملتی ہے ۔ اسلام سے محبت ، اہل بیت سے عقیدت اور تخیل کی بلندی کی بھی عکاسی ہوتی ہے ۔ ان کی شاعرانہ مہارت اور پر گوئی ان سلاموں سے ظاہر ہوتی ہے ۔ انہوں نے عقیدت کے سیلاب میں بہہ کر حقیقت اور فن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے ۔ ان میں روانی اور شگفتگی ہے ۔ تراکیب عمدہ ہیں ۔ ان سلاموں کی سلاست کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ زیبا شیعہ حضرات کی مجالس میں خصوصی طور سے شریک ہوتے تھے ۔ اور وہاں پڑھنے کیلئے زیادہ تر سلام اور مرثیے لکھتے تھے ۔ ان مجالس میں آہ و زاری کو بنیادی دخل ہوتا ہے ۔ اسی لیے یہ اشعار پر تاثیر اور درد و کرب سے مملو ہیں ۔ زیبا سلام

کہتے وقت خود بھی اس کیفیت میں ڈوب جاتے تھے جس کے باعث ان کے سلاموں میں سوز و گداز اور تڑپ پیدا ہو گئی ہے ۔ انہیں یقین ہے کہ آپ کا تذکرہ قیامت تک اسی طرح ہوتا رہے گا ۔

رہے گا تذکرہ اہل بیت محشر تک   یہ مختصر تو نہیں ، ذکر مختصر کی طرح

واقعات کی مناسبت سے کہیں کہیں فارسی تراکیب اور عربی الفاظ کا بھی استعمال ہے ۔ لہجہ اگرچہ دھیما ہے مگر جوش اور شدت بھی دکھائی دیتی ہے ۔ پیچیدگی نہیں ہے ۔ منظر نگاری کے خوبصورت نمونے نظر آتے ہیں ۔ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد جو حالات ان کے اہل خانہ کو درپیش آئے ان کی حقیقی عکاسی دیکھئیے ۔

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا بعد قتل شاہ دیں

عابد بیمار پر ہر ذرہ گریاں ہو گیا

کاٹ کر کوفہ میں مظلوموں کے سر لائے گئے

جو سلامت بچ گیا وہ نذر زنداں ہو گیا

ان سلاموں میں خوبصورت اور انوکھی تشبیہات و استعارات ہیں ۔ یہ چیزیں کلام کو حسن بخشتی ہیں ۔ زیبا نے بھی اپنے سلاموں کو اس حسن سے مزین کیا ہے ۔

نوجواں اکبر کا لاشہ کیا لحد میں دفن ہے

چودھویں کا چاند زیر خاک پنہاں ہو گیا

غم امام میں بہتے ہیں میری آنکھوں سے

کچھ اشک لعل کی مانند ، کچھ گہر کی طرح

ہے چشم منتظر جمال امام عصر
رشک سحر ہماری شب انتظار ہے

صنعت تضاد کی مثال دیکھئیے ۔

علی کے نور نظر ہیں جہاں ضیا افگن
وہاں کی شام بھی تابندہ ہے سحر کی طرح

رثائے مذہبی :
================

مرثیے کئی قسموں کے ہوتے ہیں ۔ مرثیے کی دیگر اقسام کے بارے میں ہم ایک الگ باب میں بحث کریں گے ۔ لہذا یہاں محض مذہبی مرثیوں کی روایت کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے گا ۔ اردو میں یہ صنف موضوعاتی لحاظ سے واقعات کربلا سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے اور اس مفہوم میں اس نے اردو شاعری میں خوب ترقی کی ہے ۔ اس سے مراد وہ مرثیے ہیں جو حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اور کربلا کے دیگر واقعات پر مبنی ہوں ۔

مرثیہ تمام اصناف سخن میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو مرثیہ عربی اور فارسی مرثیے سے قدرے مختلف چیز ہے ۔ ابتداء میں اس کی کوئی واضح شکل نہ تھی ۔ اس کے علاوہ مرثیہ ایک مرکب صنف ہے ۔ اگرچہ اس میں قصیدے کی طرح مختلف انسانوں کی مدح کی جاتی ہے ۔ مثنوی کی طرح واقعات بیان کیے جاتے ہیں

اور نظم کی طرح منظر نگاری اور غزل کی طرح جذبات نگاری کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود مرثیے کی انفرادیت برقرار رہتی ہے ۔

مذہبی مرثیوں میں جا بجا ایسے اخلاقی اشارے ملتے ہیں جن میں لوگوں کو نیکی اور راست روی کی تلقین کی گئی ہے ۔ حضرت امام حسین اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باطل کے خلاف ڈٹ جانا اور حق کی خاطر جان دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے ۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مرثیہ شیعہ مذہب اور شیعوں کے عقائد سے متعلق ہے ۔ چونکہ مرثیے میں کربلا کے واقعات کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے ، اس لیے واقعات و بیانات میں ایک طرح کا منطقی ربط قائم رکھنے کیلئے مرثیے کے اجزائے ترکیبی وضع کیے گئے ، جو چہرہ ، سراپا ، رخصت ، آمد ، رجز ، رزم ، شہادت ، بین اور دعا پر مبنی ہیں ۔ مذہبی مرثیے میں اجزائے ترکیبی کا یہ سلسلہ میر ضمیر نے قائم کیا لیکن تمام مرثیوں میں ان اجزاء کی موجودگی یا ترتیب لازمی نہیں ۔ مرثیہ کسی بھی جزو سے شروع کیا گیا ہے ۔ موضوع کے لحاظ سے یہ مرثیے چونکہ واقعات کربلا سے متعلق ہوتے ہیں اس لیے ان میں اکثر مضامین مشترک ہوتے ہیں ۔

اردو مرثیے کا سراغ دکنی شعراء کے ہاں ملتا ہے ۔ بعد کے دور میں بھی بہت سے شاعروں نے مرثیے لکھے جن میں آبرو ، میر ضاحک ، سودا ، میر ، مصحفی ، نظیر اکبر آبادی ، قائم چاند پوری وغیرہ اہم ہیں ۔ شاہان اودھ کے دور میں شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ لکھنو میں شیعوں کی مخصوص رسوم اور عزاداری کے ساتھ مرثیہ گوئی کا رواج قدرتی تھا ۔ اس

دور میں یوں تو بے شمار شعراء نے مرثیے لکھے مگر خلیق اور ضمیر اور دلگیر اور فصیح نے اور پھر انیس اور دبیرؔ نے مرثیے کو انتہائی عروج و کمال تک پہنچا دیا ۔ خلیق کی زبان فصیح و سادہ ہے ۔ میر ضمیر نے مرثیے کی صورت تبدیل کرکے اسے زیادہ دلچسپ بنایا ۔ مرثیے کی ترقی میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔

میر ضمیر نے مرثیے کی ظاہری شکل متعین کر دی تھی اور اسے لکھنو کی فضا کے مطابق بنا دیا تھا ۔ انیس اور دبیر نے مرثیے میں داخلی تبدیلیاں کیں ۔ میر انیس کے مرثیے، مرثیہ نگاری کا شاہکار ہیں ۔ ان کی زبان سادہ اور رواں ہے ۔ دبیر کی زبان پر شکوہ اور فارسی ، عربی آمیز ہے ۔ ان شعراء کی باہمی مسابقت سے مرثیے کو بڑی ترقی ملی ۔ بعد ازاں بیشتر شعراء نے مذہبی مرثیے کہے اور اردو مرثیے کے ذخیرے میں اضافہ کیا اور تنوع سے ہمکنار کیا ۔

زیبا ناروی کے کلام میں مذہبی مرثیے بھی بکثرت موجود ہیں ۔ ان میں روایتی انداز نمایاں ہے ۔ حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء کی بہادری اور تلوار اور گھوڑے وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں ۔ واقعہ نگاری کو بھی مرثیے میں شامل کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ شاعر حضرت امام حسین کی شہادت پر منتج ہونے والے ایک ایک واقعے کو تفصیل سے پیش کرتے ہیں ، اور اس سلسلے میں حضرت امام کے ساتھ پیش آنے والے مصائب ، ان کے ساتھیوں کی مشکلات ، دشمنوں سے مقابلہ غرض ہر طرح کے واقعات کو بیان کیا ہے ۔ اس میں رخصتی کے وقت جذباتی کیفیت اور احساسات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے ۔ کہیں رزمیہ عناصر بھی

مرثیے میں شامل ہو گئے ہیں ۔ حضرت امام حسین کے ساتھی تعداد میں کم ہونے کے باوجود حوصلے اور ہمت میں یزیدی فوج سے کہیں بڑھکر ہیں ۔ یہ مردان خدا دشمن پر اپنی بہادری کا سکہ جما دیتے ہیں ۔ مرثیے کا اختتام المناک ہوتا ہے تاکہ سامعین اور قارئین پر اس کا تاثر قائم ہو سکے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں ، اور مرثیے کا مقصد بھی یہی قرار دیا گیا ہے ۔

مرثیے میں واقعات کے بیان کا بڑا اہم دخل ہے ۔ چنانچہ واقعات کو پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ ربط و تسلسل کا خیال رکھتے ہیں ۔ مرثیہ میں متنوع واقعات کو بھی بیان کیا جاتا ہے ۔ اس میں رزمیہ واقعات بھی آ جاتے ہیں ۔ چنانچہ زیبا کہیں حضرت امام حسین کی پیدائش کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور کہیں کربلا کے میدان میں روانہ ہونے سے پہلے کا نقشہ کھینچتے ہیں ۔ ان تمام واقعات کے بیان میں جذبات نگاری کا خیال رکھتے ہیں۔

منظر نگاری کو بھی مرثیہ گوئی میں بہت اہمیت دی گئی ہے ۔ زیبا نے اپنے مرثیوں میں تمام ماحول کے مناظر کو بیان کیا ہے ۔ مختلف واقعات کی اس عمدگی سے تصویر کشی کی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ زیبا کے مرثیوں میں کردار نگاری کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے ۔ تمام ابیات کے کردار بہت عمدگی سے پیش کرتے ہیں ۔ زیبا ناروی کے مرثیے میں حضرت امام حسین کے عظیم کردار اور شخصیت کا تعارف اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

وہ حسین ابن علی دختِ نبی کے پیارے　　　وہ حسین ابن علی جن سے مصائب ہارے
وہ حسین ابن علی جن پہ نچھاور تارے　　　وہ حسین ابن علی جن پہ تصدق سارے

لال زہرا کے، پسر حیدر کرار کے ہیں

مرحلے سہل، جنہیں خلق میں اشارکے ہیں

دین و دنیا میں لیا جن کا سہارا سب نے جن کے دروازے پہ دامن کو پسارا سب نے

بحر زخار کا سمجھا ہے کنارا سب نے راکب دوش نبی کہہ کے پکارا سب نے

شمع دیں جس نے لہو دے کے فروزاں کر دی

بو ترابی کی حقیقت بھی نمایاں کر دی

راہ تسلیم میں انداز اہم رکھا ہے سر بلند اپنی روایت کا علم رکھا ہے

حق نمائی کو جہاں بڑھ کے قدم رکھا ہے آل عمران نے حقیقت کا بھرم رکھا ہے

یہ وہ ہستی ہے کہ تنقید نہیں ہو سکتی

یہ وہ ہستی ہے کہ تردید نہیں ہو سکتی

زیبا نے مرثیے کی صنف کی تمام ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس صنف کو اپنایا ہے انہیں مرثیے سے طبعی مناسبت تھی ۔ عام شاعری کے مقابلے میں مرثیے کا آغاز نسبتاً بعد میں کیا ۔ اس سلسلے میں ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں :۔

" پہلا مرثیہ 1976ء میں کہا ، معنوی طور پر میرانیس اور دوبیر سے متاثر ہیں ۔ مرثیے میں میر انیس کا رنگ نمایاں ہے ۔ پہلے مرثیے کا مطلع ہے ۔۔۔

" تو سن طبع رسا عرصۂ تحریر میں ہے"

مرثیے کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ جدید اور مختصر مرثیے کا میں قائل

نہیں ہیں ۔ مرثیہ بہر حال مرثیہ ہے اور اس کے اپنے تقاضے ہیں جن

کو پورا کرنا پڑتا ہے" ۔[1]

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیبا نے مرثیے میں روایت کی پوری پیروی کی ہے ۔ زیبا بنیادی طور پر داغ اسکول کے غزل گو شاعر ہیں[1] ۔ مرثیے میں انہوں نے مرثیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تغزل کا رنگ ہر مصرعے میں ابھر کر سامنے آیا ہے ۔ میدان کربلا میں جنگ کے مناظر بہ تفصیل بیان کیے ہیں ۔

جنگ میں کام نہ کچھ تیز نگاہی آئی ۔ سامنے دیدہ دشمن کے سیاہی آئی

تیغ شبیر کو جب ایک جماہی آئی ۔ ہر طرف لشکر اعدا میں تباہی آئی

سر پہ سر کٹنے لگے ہو گئے بے سر لاکھوں

دیکھ کر شان وغا کھا گئے چکر لاکھوں

رن پڑا ایسا کہ دنیائے حسیں کانپ گئی ۔ آسماں کانپ اٹھا اور زمیں کانپ گئی

پہنچی فریاد سر عرش بریں کانپ گئی ۔ طور یہ دیکھ کے فطرت کی جبیں کانپ گئی

غیب سے آئی ندا ، صبر و رضا پر ہو نظر

ہاتھ رک جائیں لڑائی سے خدا پر ہو نظر

زیبا نے مرثیوں میں زبان و بیان کے بہترین وسائل سے کام لے کر فنکاری کا نہایت اچھا اظہار کیا ہے ۔ ان کے ہاں ہمیں روانی ، فصاحت و بلاغت اور ذخیرۂ الفاظ پر دسترس نظر آتی ہے ۔ واقعات نگاری اور منظر نگاری کے خوبصورت مرقعے دکھائی دیتے ہیں ۔ جذبات اور کردار نگاری نے ان کے مراثی میں تاثیر پیدا کر دی ہے ۔

1۔ ضمیر اختر نقوی " اردو مرثیہ پاکستان میں" پبلشر سید اینڈ سید ایم جناح روڈ کراچی

منقبت :

منقبت عربی زبان کا لفظ ھے ۔ اس کا مادہ (ن ۔ ق ۔ ب) ھے ۔ اس کی جمع مناقب آتی ھے ۔ اردو میں یہ لفظ تعریف ، توصیف ، ثنا کے معنوں میں آیا ھے ۔ خصوصاً اھل بیت اور صحابہ کی تعریف کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ھے ۔ نسیم اللغات کے مولف نے اسے بزرگان دین کی مدح قرار دیا ھے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد صغیر الدین لکھتے ھیں :۔

" اردو میں حمد ، نعت ، منقبت اور مدح تعریف و توصیف کیلئے آتے ھیں اور لغوی اعتبار سے ھم معنی ھیں ۔ لیکن ان کے اصطلاحی معنی مختلف ھیں اور ان کا استعمال ممدوح کے اعتبار سے ھوتا ھے ۔ اگر صحابہ کرام اھل بیت اور بزرگان دین ھیں تو اس کیلئے منقبت کا لفظ استعمال کرتے ھیں اور اگر مطلقاً کوئی سر بر آوردہ شخصیت ھے تو اس کیلئے مدح کا لفظ لاتے ھیں " 1۔

اسی طرح ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ھیں اصطلاح میں :۔

" اگر آنحضرت کے سوا کسی دوسرے بزرگ یا صحابی یا امام کی تعریف کی جائے تو اسے منقبت کہیں گے " 2۔

بزرگان دین کے فضائل نظم و نثر دونوں میں بیان کیے گئے ھیں لیکن ان کی منظوم مدح سرائی کو ھی اصطلاحی معنوں میں منقبت کہا جاتا ھے ۔ چنانچہ " اقسام شعر" کے زیر عنوان

1۔ " مضمون صحابہ کرام کی نعت گوئی" ڈاکٹر محمد صغیرالدین مطبوعہ نعت نمبر مریر خامہ شعبہ اردو ، سندھ یونیورسٹی ۔

اپنے ایک مضمون میں شمیم احمد نے منقبت کو شعر کی ایک علیحدہ صنف قرار دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :-

" ایسے اشعار جن میں صحابہ رسول علی الخصوص حضرت علی یا آئمہ کرام یا صوفیا کی تعریف کی گئی ہو منقبت کہلاتے ہیں ۔ یہ کسی نظم کے حصے کے طور پر یا لگ سے نظم یا قصیدے کی شکل میں لکھے جا سکتے ہیں" (1)

منقبت کا موضوع وہ اعلی دینی شخصیت بن سکتی ہے جو کسی قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتی ہو اور پسندیدہ فضائل کی حامل ہو ۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور ڈاکٹر ابو الفتح محمد مغیر الدین نے اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور بزرگان دین کو منقبت کا موضوع قرار دیا ہے ۔

اہل بیت اطہار منقبت نگاری کا نہایت اہم موضوع ہے ۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ان کے فضائل کا ذکر کئی جگہ آیا ہے ۔ صحابہ کرام آنحضور کے جانثاروں کی وہ جماعت ہیں جنہوں نے نہ صرف آنحضور کی محبت سے فیض حاصل کیا بلکہ اپنی جان پر کھیل کر اسلام کی حفاظت کی ۔ اللہ تعالی اور رسول کریم کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ قرآن و حدیث میں ان کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے ۔

منقبت دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک رسمی جو شعری روایت کے مطابق تبرک کے طور پر کہی جاتی ہے اور دوسری مقصدی منقبت کہلاتی ہے جو ایک صنف سخن کے طور پر مروج ہوئی ہے ۔

1۔ درس بلاغت ترقی اردو بیورو نئی دہلی

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں میں جو اصناف شاعری مقبول ہوئیں ان میں نعت اور منقبت سر فہرست ہیں ۔ آنحضور خدا تعالیٰ کے نور ہیں ۔ مسلمانوں کو آپ سے دلی عقیدت ہے اور اسی حوالے سے آپ کے اہل بیت ، اصحاب اور اولیاء بھی محترم ٹھہرے اس تصور نے عقیدت مندی کے جذبات کو گہرا کیا اور منقبت نگاروں نے اس سلسلے میں بہترین اشعار لکھے ۔ اس قسم کی شاعری کیلئے عمدہ و لطیف زبان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تاکہ اس میں ایک خاص طرح کی دل آویزی آئے ۔ چنانچہ منقبت نگاروں نے اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا جس کی وجہ سے منقبت کی فضا پاکیزہ اور پر نور ہو جاتی ہے ۔ منقبت نگاروں نے صحابہ اور آئمہ کرام سے عقیدت کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اعلیٰ اخلاق کیلئے ممد و معاون ہوتے ہیں ۔ ان کے پیغامات ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں کیلئے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم شعراء نے بھی بزرگان دین سے عقیدت کا اظہار کیا ہے ۔

یہ بات طے ہے کہ بہترین ذکر آنحضور کا ہے اور ان کے بعد صحابہ کرام ، اہل بیت اور اولیاء کا تذکرہ باعث رحمت و برکت ہے ۔ ان اصحاب کی توصیف کا ایک سبب یہ ہے کہ انہیں آنحضور سے وابستگی ہے اور ان بزرگوں نے دین کے فروغ میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں ۔ اسی لیے ان سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ یہ بھی آنحضور سے ہی محبت کا ایک راستہ ہے ۔

جہاں تک منقبت کے آغاز کا تعلق ہے، اس سلسلے میں جمہرہ اشعار العرب کے مصنف نے

عبداللہ بن عباس کی سند سے روایت کی ہے کہ آنحضور تک یہ بات پہنچی کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر کے خلاف زبان درازی کی ہے ۔ آپ نے منبر پر تشریف فرما ہو کر خدا کی حمد و ثنا بیان کی ۔ پھر حضرت حسان سے کہا کہ ابوبکر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ لاؤ حضرت حسان نے حضرت ابوبکر کی تعریف میں جو اشعار پڑھے وہ منقبت نگاری کی تاریخ میں اولین حیثیت رکھتے ہیں ۔ یوں حضرت ابوبکر صدیق وہ پہلی شخصیت ہیں جنہیں منقبت کا موضوع بنایا گیا ۔ اس زمانے میں حسان بن ثابت کعب بن زہیر، فرزدق ، کمیت بن زیدالاسدی وغیرہ نے اہل بیت کی محبت کا اظہار کیا ہے۔(1)

عربی شاعری کے بعد فارسی شاعری میں فردوسی نے صحابہ کرام کی توصیف کی ہے ۔ ان کے قصیدے حمد ، نعت اور اولیائے کرام کی منقبت میں ہیں ۔

فارسی شاعری میں منقبت اہل بیت اور اصحاب رسول کی شان میں لکھے گئے ۔ تصوف کے زیر اثر صوفیا کے تذکرے بھی منقبت کا موضوع بن گئے ۔ حکیم سنائی نے امام علی موسی رضا کی منقبت میں پہلا قصیدہ لکھا ۔ ان کے علاوہ شیخ فرید الدین عطار، مولانا روم ، شیخ سعدی کے ہاں بھی منقبتیں ملتی ہیں ۔ عراقی نے خواجہ بہاو الدین زکریا کی شان میں جو منقبت لکھی ہے وہ ان سے عراقی کی گہری وابستگی کا اظہار کرتی ہے ۔ جامی نے حضرت علی کی کی شان میں اشعار لکھے ہیں اور خواجہ بہاو الدین نقشبندی کے ساتھ دلی محبت ظاہر کی ہے ۔ حافظ شیرازی کے ہاں بھی ایک منقبتی غزل موجود ہے ۔ جس میں حضرت علی اور

1۔ احسن زیدی "اردو میں منقبت نگاری ۔ مقالہ پی ایچ ڈی اردو 1984ء مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

حضرت موسی رضا کاظمی سے عقیدت پیش کی گئی ہے ۔ امیر خسرو نے " مثنوی مطلع الانوار" کے زیر عنوان خواجہ نظام الدین اولیاء کی منقبت لکھی ہے ۔

عرفی ، غنیمت کنجاھی ، عبدالقادر بیدل برصغیر کے معروف فارسی گو شاعر ہیں ۔ جن کے ہاں منقبت موجود ہے ۔

اردو میں منقبت نگاری کے نقوش بہت قدیم سے نظر آتے ہیں ۔ جب محمد بن قاسم ہندوستان پہنچا ۔ اس زمانے میں مختلف صوفیائے کرام تبلیغ اسلام کیلئے برصغیر آئے ۔ انہوں نے خطابات کیلئے کئی طریقے اپنائے ۔ ان صوفیاء میں بعض شاعر بھی تھے ۔ انہوں نے اپنے نظریات و تصورات کو بیان کرنے کیلئے شعری پیرایہ اختیار کیا ۔ اس دور کی شاعری میں اللہ تعالٰی کی حمد ، آنحضور کی نعت ، اور آئمہ اھل بیت اور صوفیا کی منقبت جیسے موضوعات نے نمایاں جگہ حاصل کی ۔ پروفیسر نجم الاسلام لکھتے ہیں :-

" اردو شاعری میں مدحیہ شاعری کا قدیم ترین نمونہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے وہ اشعار ہیں جن میں حمد و نعت کے مضامین کے بعد خواجہ نصیر الدین چراغ دھلوی کی مدح کی گئی ہے" [1]

مسلمانوں کے مخصوص مذھبی تصورات نے اردو شاعری کے مضامین اور اسالیب پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے ۔ چنانچہ اس دور میں حمد ، نعت ، اور منقبت وغیرہ خصوصی طور پر رائج رہیں ۔ شاعر اپنی منظومات کے آغاز میں خدا کی حمد اور نعت کے بعد کسی بزرگ کی تعریف کرتے تھے ۔

---

1 ۔ مضمون " دکنی اردو میں مدحیہ شاعری " قصیدہ نمبر صریر خامہ سندھ یونیورسٹی ص99

اور اس بات کو ثواب کا باعث خیال کرتے تھے ۔ اسی سبب سے منقبت کو فروغ حاصل ہوا ۔

اردو میں منقبت نگاری کا سلسلہ امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے ۔ ان کے بعد سودا ، میر تقی میر ، قائم چاند پوری اور میر حسن نے اچھی منقبتیں کہی ہیں ۔ دکنی دور میں مثنوی نگار آغاز مثنوی میں منقبت کے اشعار لکھتے تھے ۔ مرزا غالب نے بھی منقبت کہی ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے بعض منقبتی غزلیں لکھی ہیں ۔ داغ کے مجموعۂ کلام " مہتاب داغ " کے آغاز میں ایک ایسی غزل ہے جو حمد ، نعت اور منقبت کا خوبصورت سنگم ہے ۔ انھوں نے " شیخ عبدالقادر جیلانی " کی منقبت لکھی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی مدح میں ایک غزل بھی لکھی ہے ۔

یہ دل محبوب سبحانی کے صدقے   محی الدین جیلانی کے صدقے

تمھاری ذات سے ہے نظم عالـــم   جہان بانی کے سلطانی کے صدقے

فدائے شمع پروانہ ہوئے داغ   ہم اپنے قطب ربانی کے صـــدقے

ان کے علاوہ نظیر اکبر آبادی ، ناسخ ، منیر شکوہ آبادی ، میر ضمیر ، میر انیس ، مرزا دبیر ، امیر مینائی اور عزیز لکھنوی کے ہاں بھی منقبتیں ملتی ہیں ۔

جدید دور میں مولانا احمد رضا خاں ، حسرت موہانی ، علامہ اقبال ، جوش ملیح آبادی ، حفیظ جالندھری ، جمیل مظہری کے ہاں منقبت نگاری کے نمونے ملتے ہیں ۔ چند ایک مثالیں دیکھئیے ۔ حسرت موہانی نے غوث پاک کی شان میں یہ منقبت لکھی ہے۔

دستگیری کا طلبگار ہوں شیاً للہ　　　میر بغداد میں بیمار ہوں شیاً للہ

حال دم شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن　　　آج میں درپئے اظہار ہوں شیاً للہ

علامہ اقبال کی وہ نظمیں جو انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت بلال کے بارے میں لکھی ہیں ۔ منقبت کی ذیل میں آتی ہیں ۔ حضرت ابوبکر کی توصیف میں لکھتے ہیں ۔

پروانے کو چراغ ہے ، بلبل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

جوش ملیح آبادی حضرت علی کے دیوانے ہیں ۔ آپ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ۔

حرم سے مجھ کو وحشت ہے خدا سے بھی شکایت ہے

مگر تجھ سے محبت ہے میں دیوانہ ہوں دیوانہ

احمد رضا نے ایک منقبت " غوث الاعظم جیلانی " سے متعلق لکھی ہے ۔ جس کا مطلع ہے ۔

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا

اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا

منقبت کے مستقبل کے بارے میں احسن زیدی کا خیال ہے ۔

" جب تک دنیا بزرگان دین سے خالی نہیں ہو جاتی اور جب تک مذہب انسانیت کی روحانی فلاح کا ضامن ہے اور جب تک شاعری کا فن زندہ ہے، مناقب لکھے جاتے رہیں گے" ۔[1]

---

1 ۔ اردو میں منقبت نگاری ۔ مقالہ پی ایچ ڈی اردو ، 1984ء مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

زیبا ناروی نے مذھبی جذبات و احساسات کو پیش کرنے کیلئے منقبت کو بھی ذریعۂ اظہار بنایا ۔ ان منقبتوں کے مطالعے سے اندازہ ھوتا ھے کہ انھیں اھل بیت اطہار اور بزرگان دین سے دلی عقیدت ھے ۔ ان اصحاب کی مدح سرائی میں انھوں نے جوش ، جذبے اور سوز کا اظہار کیا ھے ۔ زیبا کی بارہ غیر مطبوعہ منقبتیں دستیاب ھو سکی ھیں ۔ ان میں سے چار حضرت علی کی ، دو حضرت خواجہ معین الدین چشتی ، دو حضرت امام حسین ، ایک خواجہ نظام الدین اولیا ، ایک حضرت عمر، ایک حضرت امام حسن اور ایک منقبت زیبا نے اپنے پیرو مرشد شاہ محمد عبدالشکور سے متعلق لکھی ھے ۔ زیبا نے کلاسیکی روایت کو اپناتے ھوئے منقبت نگاری کو ایک نیا رنگ عطا کیا ھے ۔ انھوں نے منقبت کی صنف میں اسلوب اور ھئیت کے اعتبار سے جدتیں پیدا کیں ۔

زیبا نے جس ھستی کی منقبت بھی کہی ھے اس کی مدح کا حق ادا کر دیا ھے ۔ انھوں نے جس ھستی کی مدح میں بھی قلم اٹھایا ، اس کی عظمت ، شان و شوکت ، بزرگی اور پاکیزگی کو نئے انداز اور نئے رنگ سے بیان کر دیا ھے ۔ یہ منقبتیں ان کے جذبوں کی ترجمان اور ان کی اھل اللہ سے سچی محبت اور عقیدت کی شاھد ھیں ۔ ھر منقبت جوش محبت سے لبریز ھے ۔ زیبا نے مادی منفعت کی خاطر امراء و وزرا کی مدح سرائی نہیں کی بلکہ صرف بزرگان دین کی شان میں قلم اٹھایا ھے ۔ انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اھل خاندان میں سے اکثر افراد کی مدح کی ھے ۔ وہ علی کے نام لیوا ، حسن ، حسین کے عاشق اور اھل بیت کی محبت سے سرشار تھے ۔ انھوں نے دل کی گہرائیوں سے انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ھے ۔ ان کے مناقب میں جذبوں کی فراوانی ھے ۔

رہےیا حضرت علی سے گہری عقیدت رکھتے تھے ۔ اس لیے زیادہ تر مناقب حضرت علی کے بارے میں ہیں ۔ ان میں حضرت علی کی مدح کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے ۔ حضرت علی کی شان و شوکت ، علم ، بہادری اور نیکی و پرہیز گاری کو دلپذیر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ۔ آپ کی وجاہت اور رعب و دبدبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

آپ کی ہیبت ایک ایک پر چھاتی ہے آپ کے سامنے کوہ بھی رائی ہے

ذوالفقار آپ کے واسطے آئی ہے ۔ المدد یا علی المدد یا علی

آپ کی آمد سے گلشن ہستی میں بہار آ گئی ہے ، فلک نثار ہونے کو تیار ہے ، سورج بے حجاب ہو گیا ہے ۔ آنحضور بھی حضرت علی کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے ہیں ۔ ہر طرف آپ کا چرچا ہے ۔ حضرت علی کے تشریف لانے سے کفر و جہل کا خاتمہ ہو گیا ہے ۔

انہیں کا ذکر انہیں کا ہے ہر طرف چرچا تمام شہرہ ہے خیبر شکن کی آمد کا

اڑا ہے کفر و جہالت کا رنگ بھی کیا کیا یہ ہوش باتیں ، کہ جائے ادب ہے اے زیبا

جہاں میں دھوم ہے کعبے میں بو تراب آئے

حضرت علی کی مدح یوں بیان کرتے ہیں ۔

علی ولی ہیں علی وصی ہیں ، تمام ولیوں کی دھن علی ہیں

یہ سب نے جانا ، یہ سب نے مانا علی کی مسجد علی کا منبر

آپ کو عرش کے پاس لایا گیا آپ کو کل ایمان بنایا گیا

آپ کو اسم اعظم میں پایا گیا المدد یا علی المدد یا علی

ان مناقب سے زیبا کا خلوص اور محبت عیاں ہے ۔ یہ ان کے داخلی جذبات کے ترجمان ہیں ۔

حضرت امام حسین کی مدح میں جب اپنا قلم اٹھاتے ہیں تو ہر طرف پھول بکھرنے لگتے ہیں ۔ الفاظ چونکہ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں اس لیے جذبات و تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ حضرت امام حسین کے اوصاف بڑے احسن طریقے سے بیان کرتے ہیں ۔ آپ کی ذات کو زمین و آسمان کیلئے باعث فخر قرار دیا ہے ۔ آپ کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں ۔

بہار و باغ و گل تر سلام کہتے ہیں

حضرت امام حسین کے بلند رتبے اور مقام کے پیش نظر گلشن کا نکھار، چودھویں کے چاند کی ضیا، دریا کی روانی، گل نرجس سب آپ کی آمد کے منتظر نظر آتے ہیں ۔ اور جب آپ اس دنیا میں تشریف لے آئے تو فطرت کے ان نظاروں میں مسرت و شور عود آیا ۔

آئینہ کونین منور نظر آیا　　　ہر ذرے کا تابندہ مقدر نظر آیا

تاریک بیاباں بھی اجاگر نظر آیا　　　گلزار کا ہر گوشہ معطر نظر آیا

محبت کا تقاضا ہے کہ آپ کے قدموں میں جان نچھاور کر دی جائے ۔

موقوف ہے عقبیٰ میں کرم ان کے کرم پر

ہو جاؤ فدا حجت آخر کے قدم پر

امام حسین کی ذات اقدس کا ذکر اس پر وقار انداز سے کرتے ہیں کہ قاری کے دل میں بے اختیار آپ کی محبت جاری و ساری ہو جاتی ہے ۔

وہ سامنے ہیں ان کی تجلی کو چوم لے

اے چشم شوق اب تجھے کیا انتظار ہے ۔

زیبا تمام ہستیوں کا ذکر والہانہ محبت اور بے خودی کے ساتھ کرتے ہیں - ان کے اوصاف کا بیان نہایت واضح اور شاندار ہے - زیبا نے ان آئمہ کرام کے داخلی محاسن کے ساتھ ساتھ ظاہری خصوصیات مثلاً حسن و جمال اور جاہ و مرتبہ کا ذکر بھی کیا ہے - ان کی عظمت ، بزرگی ، شرافت ونجابت ، علم و عمل ، حیا و پاکیزگی ، فیوض و برکات اور معجزات و کرامات کو وضاحت سے بیان کیا ہے - زیبا کی طبیعت درویشانہ و قلندرانہ تھی - صوفیا اور بزرگوں کے مزارات پر باقاعدگی سے حاضری دیا کرتے تھے بلکہ شاہ محمد عبدالشکور صاحب کے آستانے سے پوری طرح وابستہ تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کے دل میں ان بزرگوں کیلئے بے پناہ عزت و احترام موجود تھا - ان کی مدح سرائی کو وہ آخرت میں کامیابی کا سبب خیال کرتے تھے - زیبا نے جب بھی کسی کی مدح سرائی کیلئے صفحہ قرطاس پر قلم چلایا ، عقیدت والفت کے موتی بکھرتے چلے گئے - ان کے انگ انگ سے محبت و عقیدت کے شرارے پھوٹتے ہیں جنہیں انہوں نے منقبت میں سمیٹ دیا ہے -

حضرت علی کی خدمت میں نذرانہ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں -

وسیلہ بخشش کا ہاتھ آیا کسی تردد بغیر زیبا

علی کے گھر کا غلام بن کر زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

حضرت امام حسین کی مدح میں ان کی تمام تر عقیدت مندیاں چھلک پڑتی ہیں - آپ کے اوصاف کو اس طور بیان کرتے ہیں کہ آپ کا جلوہ اور شخصیت کا عکس قارئین پر عیاں ہو جاتا ہے -

قدم قدم پہ بڑھا رتبۂ امام حسن

نظر نظر میں تھا جلوہ امام حسن

بیان وروئے محمد کا آئینہ سمجھو

شبیہ پاک ہو یا گذشتہ امام حسن

رضا و صبر و تحمل کی منزلوں کے لیے

نظر کے سامنے ہے جادۂ امام حسن

حضرت عمر فاروق کی مدح پر شکوہ اور پروقار انداز سے بیان کی ہے ۔ حضرت عمر کی سلطنت کی حدود اور فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں آنحضور سے جو محبت اور قربت تھی اس کا تذکرہ اس شان سے کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کی عظمت و سطوت کا سکہ دل میں بیٹھ جاتا ہے ۔ آپ کی دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔

جدا نہ ہوتے تھے حضرت سے حضرت فاروق

تھی ناگوار محمد کو فرقت فاروق

جہاں میں ذکر ہے فاروق کی خلافت کا

ہے یادگار زمانہ خلافت فاروق

اگرچہ کی ہے صحابہ نے دین کی خدمت

مگر سبھوں میں نمایاں ہے خدمت فاروق

حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی مدح میں زیبا نے جو مناقب لکھے ھیں ۔ اُن میں ان عظیم شخصیتوں کی فیض رسانی کا عالم دکھایا ھے ۔ ان کے در پر لوگوں کا ھجوم اس بات کا گواہ ھے کہ ان کا فیض خاص و عام ھر ایک کیلئے ھے ۔ زیبا ان درباروں کی شان و شوکت اور ھیبت کے نقوش اپنے ذھن میں محسوس کرتے ھیں ، اور ان کی خواھش ھے کہ حق کی یہ روشنی ان کے دل و دماغ کو منور کرتی رھے ۔ یہ منقبت کچھ دعائیہ انداز لیے ھوئے ھے ۔

کہیں بائیس خواجہ ھیں کہیں دربار کلیر ھے

نصیر و کاکی و سلطاں ھیں ، فیضان قلندر ھے

جمال حق سے جو کاشانہ ھے زیبا منور ھے

غم دوری میں ھر دم یہ دعا میرے لبوں پر ھے

وھی عالم وھی نقشہ وھی صورت رھے باقی

الٰہی دھلی و اجمیر کی عظمت رھے باقی

ان منقبتوں میں زیبا اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے ھوئے اپنے آپ کو بے بس تصور کرتے ھیں ۔ وہ ان کے شربت دیدار کے پیاسے اور ان کے در کے گدا ھیں ۔ ان کی حسرت ھے کہ حضرت معین الدین چشتی اس بھکاری کو اپنے فیض و کرم سے نوازیں ۔ محبت و عقیدت کی انتہائی کیفیت دیکھئے ۔

لٹائے جائیں گے تم پر گہر غریب نواز مچل رھی ھے مری چشم تر غریب نواز

نگاہ چارہ گری سے جو دیکھ لو مجھ کو نہ درد دل ھو نہ درد جگر غریب نواز

مجھے بھی نور حقیقت کی دید حاصل ہو لگاؤں آنکھوں سے میں خاک در غریب نواز

مجھ کو مل جائے گا میرا چاہا میری جھولی رہے گی نہ خالی

میرے خواجہ ہیں اجمیر والے ان کے در پر ہوں میں بھی سوالی

زیبا نے ایک طرحی منقبت اپنے پیرو مرشد حضرت شاہ محمد عبدالشکور صاحب کی عقیدت میں لکھی ہے ۔ اس میں زیبا نے اپنے مرشد کے روحانی اوصاف اور ان کی بزرگی کی خصوصیات بیان کی ہیں ۔ آپ کی روحانی تجلیات کا یہ عالم ہے کہ ہر طرح کے لوگ آپ کے آستانے پر جمع ہیں ۔ آپ کے عقیدت مندوں کا ایک کارواں ہے جو آپ کی محبت اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔

زندہ جاوید ہیں دنیائے ذوق و شوق میں

جس قدر ہیں کشتگان نیر و عبدالشکور

ان مناقب میں بزرگوں کی تعریف و توصیف ہی بیان نہیں کی گئی بلکہ جذبات نگاری میں بھی مہارت دکھائی گئی ہے ۔ واقعات کی تفصیل سے تصویر کشی کی ہے ۔ خوشی کا ذکر پرشکوہ الفاظ میں کرتے ہیں ۔ حضرت علی کی ولادت باسعادت کے موقع پر خوشی و مسرت کا اظہار یوں کیا ہے کہ چاروں طرف پھول ہی پھول کھلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں ۔

چمن میں غنچے کھلے سراسر زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

فضائے کعبہ ہوئی منور زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

خوشی میں جھومے حبیب داور زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

عجب ہے عالم عجب ہے منظر زمیں کے اوپر فلک کے نیچے

زیبا ناروی کی منقبتیں کونا گوں فنی خوبیوں اور شعری محاسن کی حامل ہیں - انہوں نے فنی طور پر اس صنف میں اپنے کمالات دکھائے ہیں - زیبا کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے منقبت کو مختلف ہئیتوں میں لکھا ہے - مسدس کی ہئیت بھی ہے، مربع کی بھی، قطعہ، ترجیع بند، ترکیب بند اور غزل کی بھی - حضرت امام حسین کی منقبت غزل کی ہئیت میں ہے -

آئینہ شان جلوہ پروردگار ہے

اہل نظر کو دعوت جشن بہار ہے

آمد ہے آج اس کی گلستان دہر میں

میدان ضبط و صبر کا جو شہ سوار ہے

حضرت علی کی یہ منقبت مربع ترجیع بند ہئیت کی ایک شکل ہے -

آپ کی گفتگو ہے سند یا علی　　　کون ہے جس کو ہو رد و کد یا علی

آپ ہیں کل اماموں کے جد یا علی　　　المدد یا علی المدد یا علی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی مدح مسدس کی ہئیت میں ہے -

دلی میں اہل دل کی آج بھی ہیبت رہے باقی　　نمایاں جابجا ہر شان ہر شوکت رہے باقی

جو ہے اپنی جگہ اس نقش کی زینت رہے باقی　　وہی منظر وہی جلوہ وہی جلوت رہے باقی

وہی عالم وہی نقشہ وہی صورت رہے باقی

الٰہی دہلی و اجمیر کی عظمت رہے باقی

حضرت علی کے جشن ولادت کے سلسلے میں لکھی گئی منقبت کی ہئیت مخمس ہے -

کہو بہار سے گلشن پہ اب شباب آئے

زمیں پہ نور فشاں کہکشاں شتاب آئے

فلک سے ماہ منور بھی ہمرکاب آئے

نثار ہونے کو سورج بھی بے حجاب آئے

جہاں میں دھوم ہے کعبے میں بوتراب آئے

زیبا کے مناقب میں بلند آہنگی اور پر شکوہ الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ جن سے اپنے ممدوح کی شان بیان کرنے میں جوش و جذبہ پیدا کرتے ہیں ۔ انہیں اپنے موضوع کی نزاکت اور اہمیت کا خیال رہتا ہے اور اس کی مناسبت سے کہیں دھیمے اور کہیں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں جو شدت تاثر کو گہرا کرتے ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے مناسب الفاظ کا لانا شاعر کا کمال ہوتا ہے ۔ اس سے اس کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ زیبا کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل تھا ۔ ان کے پاس شاندار اور عمدہ الفاظ کا بے پناہ خزانہ تھا ۔ وہ قدرت کلام کی خوبی کی وجہ سے اس مرحلے سے کامیاب گزرتے ہیں ۔ پر شکوہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے زیبا کے مناقب میں ایک طرح کی سطوت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود تحریر کی شگفتگی اور روانی میں کمی نہیں آتی ، نہ یہ الفاظ ثقیل محسوس ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ۔

ارفع و اعلیٰ ہے شان شہ عبدالشکور

عرش تک ہے مزدہ خوان شہ عبدالشکور

ارماں کے سفینے ہیں تو پانی کی ردا ہے　　حال دل بیتاب عریضوں پہ لکھا ہے

جو لہر نظر آتی ہے پیغام بکف ہے　　ہر موج ، رواں حجتِ آخر کی طرف ہے

اگر ایک طرف زیبا مشکل الفاظ لاتے ہیں تو دوسری طرف ان کے ہاں نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ بھی ہیں ۔ بعض مناقب کی زبان صاف اور رواں ہے ۔

عمر سے پوچھ لے کوئی رسول کی عظمت　　رسول سے کوئی پوچھے حقیقت فاروق

وہ سر نہیں نہ ہو سودا عمر کا جس سرمیں وہ دل نہیں نہ ہو جس دل میں الفت فاروق

تشبیہہ و استعارہ اور صنائع بدائع بھی کہیں کہیں شعری حسن میں اضافے کا باعث بنتے ہیں ۔ ان کے بر محل اور عمدہ استعمال سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے ۔ چنانچہ تقریباً تمام اصناف میں اس فن سے کام لیا گیا ہے ، اور سبھی شاعروں نے ان کی مدد سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے ۔ زیبا ناروی بھی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے حسین اور خوبصورت تشبیہات تخلیق کی ہیں ۔ یہ تشبیہیں اور استعارے انھوں نے گرد و پیش سے بھی لیے ہیں ۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور نظر تیز ہے ۔ وہ دریا کنارے لگے میلوں کو بھی دیکھتے ہیں اور سبزے کے نئی پوشاک بدل لینے کو بھی سراہتے ہیں ، اور ان سب تبدیلیوں کا منبع اور مرکز حضرت امام عصر کی ذات کو گردانتے ہیں ۔ تشبیہہ کی مثال دیکھئیے ۔

ادھر ہے چودھویں کا چاند ، ادھر رشک مہ کامل

نگاہ خلق رقصاں ہے ، زمیں پر بھی فلک پر بھی

کرنیں مہہ شب تاب کی آ آ کے زمیں پر

قرباں ہوئیں ، خطہ خضرے کے حسین پر

حیات عشق مجلی ہے آئینے کی طرح

نگاہ شوق یہ ہیں جلوہ گر غریب نواز

تشبیہات کے علاوہ زیبا نے صنعت حسن تعلیل ، صنعت تلمیح اور رعایت لفظی کا استعمال بھی بڑے ہی لطیف پیرائے میں کیا ہے ۔ ان کو پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ زیبا نے شعوری کوشش کر کے ان صنائع بدائع کا التزام نہیں کیا بلکہ خیالات کے بہاو کے ساتھ خود بخود ہی یہ فنی خصوصیات ان کے اشعار میں در آئی ہیں ، اور اشعار کے تاثر اور حسن میں اضافہ ہو گیا ہے ۔ ان لوازمات کی چند ایک مثالیں یہ ہیں ۔

ہے چودھویں شعبان کی شب کتنی سہانی　　　سبزے نے بدل ڈالی ہے پوشاک پرانی

آپ پر علم کا باب عالی کھلا　　　آپ سوئے سر بستر مصطفےٰ

تمہارے در پہ نہ اڑ کر اگر پہنچ پاؤں　　　فضول ہیں یہ مرے بال و پر غریب نواز

ترا دو ناؤ مری ، میں گھرا ہوں طوفاں میں　　　پتہ نہیں کہ ہے ساحل کدھر غریب نواز

اس کے علاوہ زیبا نے تکرار لفظی اور اندرونی قوافی کے استعمال سے تاثیر پیدا کی ہے۔

جلوہ حق نما وہ سراپا مرحبا مرحبا وہ سراپا　　　آن اہل صفا میں انوکھی شان اہل رضا میں نرالی

کام آیا ہے جذب تصور پردے اٹھے بحسب تصور　　　لوٹ لے اے نظر بڑھ کے جلوا ، سامنے ہے وہ دربار علی

الفاظ کا الٹ پھیر جو ان کی غزلیات میں نمایاں ہو کر اپنا تاثر چھوڑتا ہے ، زیبا کی منقبتوں میں بھی کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے ۔

ادھر زمیں پر ادھر فلک پر ادھر فضا میں ادھر فضا میں

علی کا قبضہ ، علی کا جلوا ، علی کی مسجد علی کا منبر

زیبا نے ان مناقب میں بہت سی تراکیب اختراع کی ہیں ۔ یہ تراکیب زیبا کی اختراعی زبانت اور نادر الکلامی کی حامل ہیں ۔ مثال کے طور پر وقار چشت ، سلطان ہند ، معین دیں ، غریق موج تصور ، ساقی فطرت ، حجت آخر ، حیات عشق ، نگاہ چارہ گری ، رشک سحر ، گلستان دھر وغیرہ ۔

زیبا ناروی نے بحیثیت مجموعی مناقب میں سادہ اور آسان زبان استعمال کی ہے ۔ ان کے مناقب موسیقیت اور ترنم جیسی خصوصیات سے بھی خالی نہیں ہیں ۔ ان میں روانی پائی جاتی ہے ۔ ایسے مناقب دلوں سے ہوتے ہوئے روحانی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں اور گداز کی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں ۔

مجھ کو مل جائے گا میرا چاہا میری جھولی رہے گی نہ خالی
میرے خواجہ ہیں اجمیر والے ان کے در پر ہوں میں بھی سوالی
فیض خواجہ کا عالم تو دیکھو ، دم بدم لطف پیہم تو دیکھو
ہو گیا وہ غنی دو جہاں میں آپ نے اک نظر جس پہ ڈالی
آگئے ڈھب طریقت کے اس کو ، مل گئے راز وحدت کے اس کو
جس نے بھی چشتیہ در سنبھالا ، عاقبت اپنی اس نے سنبھالی

زیبا ناروی کے مناقب سے ان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے کا اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ درباروں پر بھی جاتے ہیں ، نصیر و کاکی اور سلطان کی قلندری کے بھی شیدائی ہیں ۔ دھلی و اجمیر کی محافل سے بھی واقف ہیں ۔ زیبا ان ہستیوں سے صرف عقیدت ہی نہیں

رکھتے، ان کے وسیلے سے خدا کی رحمت و مدد کے طلبگار بھی ہیں ۔ مشکل میں ان کا آسرا لیتے ہیں ۔

آرزو دل کی اتر رہی ہے زندگی پر خوشی چھا رہی ہے
آپ کے در کا خادم ہے زیبا ، آپ کے در سے کیوں جائے خالی

آپ کے خادموں میں ہے وہ بھی ملا
آپ سے ہے بہت کچھ اسے آسرا
آپ زیبا کی سن لیجئے التجا
المدد یا علی ۔ المدد یا علی

ان تمام مناقب میں زیبا نارو ی نے اہل بیت اطہار، آئمہ کرام اور بزرگان دین سے اپنی دلی وابستگی اور گہری عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے ۔ خود کو ایک عاجز اور منکسر بندے کے طور پر ظاہر کیا ہے ۔ خلوص و جذبات کی فراوانی ملتی ہے ۔ شاعر نے ان کی مدح سرائی محض رسمی طور پر نہیں کی بلکہ اپنے مذہبی شعور و احساسات کے تحت ان موضوعات کو نظم کیا ہے ۔ ان سے زیبا کی مذہبی دلچسپیوں اور دینی معلومات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان مناقب میں سوز و گداز اور روحانی پیاس کی تڑپ دکھائی دیتی ہے ۔ زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے ۔ ان کے پڑھنے سے قاری پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے ۔ الغرض ان مناقب میں تاثر اور دل آویزی کی شان پائی جاتی ہے ۔

قـصـيـدہ :

لـفـظ قصیدہ عربی لفظ " قصد " سے بنا ہے ۔ اس کے لغوی معنی ارادہ کرنے کے ہیں ۔ گویا قصیدے میں شاعر کسی خاص موضوع پر اظہار خیال کا قصد کرتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی " مغز" کے ہیں ۔ یعنی قصیدہ اپنے موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے دیگر اصناف شعر کے مقابلے میں وہی نمایاں اورامتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی جسم و اعضا میں سر یا مغز کو حاصل ہوتی ہے ۔ فارسی میں قصیدے کو" چامہ " بھی کہتے ہیں ۔

قصیدہ ہئیت کے اعتبار سے غزل سے ملتا ہے ۔ قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے ۔ بعض اوقات درمیان میں بھی مطلعے لائے جاتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ ہئیت کے لحاظ سے قصیدے کی دو قسمیں ہیں ایک تمہید یہ جس میں قصیدے کے چاروں اجزا تشبیب ، مدح ، گریز اور دعا موجود ہوتے ہیں ۔ دوسرا مدحیہ جو تشبیب اور گریز کے بغیر براہ راست مدح سے شروع ہوتا ہے ۔ اردو میں مروج اصناف سخن میں قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جس کی شناخت کیلئے اس کے موضوع اور ہئیت کو زمانہ قدیم ہی سے مساوی حیثیت دی گئی ہے ۔ نظم کی مانند قصیدے میں خیالات مربوط و مسلسل ہوتے ہیں چنانچہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر قصیدے کا کوئی نہ کوئی عنوان ہوتا ہے ۔

قصیدے کیلئے کوئی ایک موضوع متعین نہیں ۔ اس میں مدح ، ذم ، وعظ و نصیحت اخلاق و حکمت اور حکایت و شکایت وغیرہ کا بیان ہوتا ہے ۔ دراصل عربی قصیدے کے موضوعات

میں بڑی وسعت تھی ۔ مگر فارسی شاعروں نے قصیدے کو خوشامد اور حصول انعام کیلئے بادشاہوں کی تعریف یا ناراضی اور مایوسی میں ان کی مذمت تک محدود کر لیا۔اردو قصیدے کا سب سے بڑا موضوع مدح ھے ۔ البتہ دیگر موضوعات پر بھی بہت سے قصیدے لکھے گئے ھیں ۔

قصیدے کی زبان عموماً پر شکوہ اور لہجہ بلند آھنگ ہوتا ھے ۔ اس کیلئے الفاظ و تراکیب پر رعب اور با وقار ہونے چاھئیں ۔ تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع میں جدت طرازی ، ندرت اور مبالغہ آمیزی ھو اور انداز بیان پر زور و پر جوش ھو تو قصیدہ زیادہ موثر ھو گا ۔ معیاری قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں توازن اور تناسب ہوتا ھے ۔ اس میں ناممکن الوقوع مبالغہ آرائی سے اجتناب ضروری ھے تاھم قصیدہ گو شعراء نے مبالغے ھی کو قصیدہ کی جان سمجھا ھے ۔

اردو شاعری میں قصیدے کی روایت فارسی سے آئی ھے اس لیے معنی و ھئیت دونوں اعتبار سے اس پر فارسی قصائد کا اثر نمایاں ھے ۔ اردو شاعری کے دکنی دور میں یوں تو بہت سے شعراء مثلاً مشتاق رستمی ، ملک خوشنود ، شاہ امین الدین اعلی ، نصرتی ، قلی قطب شاہ ، غواصی ، افضل قادری وغیرہ نے قصیدے لکھے ، مگر ان سب میں نصرتی کو اعلی درجے کا قصیدہ نگار مانا جاتا ھے ۔ شمالی ھند کے شعراء میں ولی ، میر ، تاباں ، فغاں ، مصحفی اور دیگر بہت سے شعراء نے قصیدے لکھے ۔ مگر فن قصیدہ گوئی کے نقطۂ نظر سے سودا ، انشا ، غالب ، مومن اور ذوق اردو کے بہترین قصیدہ گو مانے جاتے ھیں ۔ سودا کے مزاج کو قصیدہ گوئی سے بڑی مناسبت تھی ۔ ان کے قصیدے تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے دوسرے

قصیدہ گو شاعری سے بڑھ کر ہیں ۔ ڈاکٹر ضیا احمد بدایونی کے بقول قصیدہ کو حقیقی معنوں میں قصیدہ انہوں نے ہی بنایا ۔ غالب نے صرف چار قصیدے لکھے مگر ان کا معیار بہت بلند ہے ۔ غالب کے قصیدے عبدالسلام ندوی کے بقول " اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں " ۔

مومن نے بھی متعدد قصیدے لکھے مگر دو کے سوا ان کے سب قصائد حمدیہ اور نعتیہ ہیں ۔ انہوں نے قصیدے کو جھوٹی خوشامد سے پاک رکھا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے ۔ بعد کے دور میں محسن کاکوروی نے عمدہ نعتیہ قصیدے لکھے ۔ عزیز لکھنوی کے مذہبی قصیدے قابل ذکر ہیں ۔ منیر شکوہ آبادی ، امیر مینائی اور سحر لکھنوی وغیرہ نے بھی اچھے قصیدے لکھے ۔

زیبا ناروی کا بھی ایک قصیدہ دستیاب ہوا ہے جو حضرت عباس علمدار کے جشن ولادت کے سلسلے میں لکھا گیا ہے ۔ قصیدے عام طور پر غیر مردف ہوتے ہیں لیکن زیبا کا یہ قصیدہ مردف ہے ۔ یہ غالب کی مشہور غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے ؎

جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کی زمین میں لکھا ہے ۔ مطلع دیکھئے:-

فطرت ہے شان صبح گلستاں لیے ہوئے

غنچے کھلے ہیں کیف کا ساماں لیے ہوئے

زیبا نے قصیدے کے صرف تین اجزا ، تشبیب ، گریز اور مدح سے کام لیا ہے ۔ یوں

قصیدے کی روایت سے اجزاء کی حد تک انحراف کیا ہے ۔ وہ خود اس طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

هر نقطہ، ایک نکتہ، علم الحیات ہے — هر لفظ اک روایت خنداں لیے ہوئے

اس کی تشبیب نہایت خوبصورت ہے ۔ یہ بہاریہ تشبیب ہے ۔ بہار کے موسم کے اعتبار سے مختلف مناظر بیان کیے گئے ہیں اور نہایت دلفریب انداز اختیار کیا ہے ۔ تشبیب قصیدے کا دلچسپ ترین حصہ قرار دیا جاتا ہے ، تاکہ قاری اس دلچسپ انداز بیان سے متاثر ہو کر باقی اشعار سننے کیلئے متوجہ ہو جائے ۔ چنانچہ زیبا نے بھی منظر نگاری اور تصویر کاری کی مدد سے تشبیب میں دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ ایک مذہبی قصیدہ ہے ۔ مذہبی قصیدے کی تشبیب بھی پاکیزہ ہونی چاہئیے ۔ اس لحاظ سے بھی اس میں ایک لطافت موجود ہے ۔ گلستاں کے حوالے سے ترتیب وار مختلف چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ، صبح ،گلستان ، غنچے، شبنم ، پھول ، موج ہوا ، سنبل وغیرہ کا بیان ہے ۔

شبنم کی آب و تاب کا آئینہ بن گیا — ہر پھول اپنا چاک گریباں لیے ہوئے

دیکھو فضا کی گود میں رقصاں لطافتیں — موج ہوا ہے سنبل پیچاں لیے ہوئے

لالہ مسرتوں سے " شفق رنگ" ہو گیا — رنگ حنا سرور کا ساماں لیے ہوئے

اترے ہیں آسماں سے جگنو زمین پر — دامن میں اپنے رنگ چراغاں لیے ہوئے

پھر بڑی خوبصورتی سے اپنے اصلی موضوع یعنی ولادت حضرت عباس کے بیان پر آگئے ہیں۔ مدح کی طرف آتے ہوئے بہت عمدگی سے ماهرانہ انداز میں گریز اختیار کی ہے ۔ گریز کا مقصد تشبیب اور مدح میں ربط پیدا کرنا ہے ۔ اس اعتبار سے گریز کی خوبی یہ ہونی

چاہئیے کہ مختصر ہو اور بڑے سلیقے سے اصل مطلب کی طرف لے جائے ۔ اس مقام سے کامیابی کے ساتھ گزرنا ہر شاعر کا کام نہیں لیکن زیبا کا کمال یہ ہے کہ وہ اس مرحلے کو اچھے طریقے سے پار کر جاتے ہیں اور قصیدہ دو لخت نہیں ہوتا ۔ مثلاً گریز دیکھئیے ۔

وہ دیکھو آگئے مری بزم خیال میں　　　سوغات حسن یوسف کنعاں لیے ہوئے

اک مطلع حسیں مجھے لکھنا پڑا ہے اور　　　جس کی پھبن ہے شرح نمایاں لیے ہوئے

یہ اشعار کہہ کر گویا مجسم تصویر کھینچ دی ہے اور قاری اپنی آنکھوں کے سامنے وہ سارا منظر محسوس کرتا ہے ۔ قصیدوں میں مدح کے حصوں میں عموماً مبالغے سے بھی کام لیا جاتا ہے ۔ ممدوح کے درجے کے مطابق مدح کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد اپنے ممدوح کی درازی عمر یا جاہ و جلال کے اضافے کیلئے دعا مانگی جاتی ہے ۔ مذہبی قصائد میں ذوق سلیم ، کلاسیکی ضبط و اعتدال اور توازن سے کام لینے کی ضرورت خاص طور پر ہوتی ہے ۔ ان تخلیقات میں شاعر مبالغے کی حد تک بھی پہنچ جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ۔ زیبا نے بھی حضرت عباس علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے خالص جذباتی اور عقیدت مندی کا انداز اپنایا ہے ۔ حسن میں خلوص اور تقدس کا بہت خیال رکھا گیا ہے ۔ روانی اور سادگی اس مدح کا لازمی حسن ہے ۔ مدح اور تعریف و توصیف میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں :-

وہ چاند جس کے رخ پہ ہے کونین کی نظر　　　وہ چاند جو ہے حسن فراواں لیے ہوئے

بہادری اور ہمت و مردانگی کا نقشہ اشعار میں یوں کھینچا ہے ۔

چہرے پہ ہے وقار کا غازہ ملا ہوا　　　بازو ہیں قوت شہ مرداں لیے ہوئے

ماتھے پہ ہر شکن ہے عبارت خلوص کی　　　معصومیت ہے عظمت انساں لیے ہوئے

آپ کی عظمت و رفعت اور شان کا ذکر اس طرح سے کیا ہے ۔

جھولا جھلانے آئی ہیں حوریں بہشت کی   خدمت کا اشتیاق ہے رضواں لیے ہوئے

بحیثیت مجموعی زیبا کے اس قصیدے میں روایتی قصیدے کے پورے اجزاء کو تلاش نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لحاظ سے یہ قصیدہ انفرادیت کا حامل ہے ۔ اس میں زیبا نے شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے ۔ اپنے آپ کو دبیر وقت کہا ہے، اوریہ بتایا ہے کہ جب یہ قصیدہ وہ لکھ رہے ہیں تو ان کی ساری صلاحیتیں اپنے جوش پر ہیں ۔

فکر جواں ہے نوح کا طوفاں لیے ہوئے   طبع رواں ہے تخت سلیماں لیے ہوئے

آئی دبیر وقت کی انگڑائی، دیکھنا   تاریخ لکھ رہا ہے قلم داں لیے ہوئے

عقیدت کی فراوانی کا بیان دیکھئیے ۔

زیبا وہ آگیا ہے علی کے حضور میں   جس کی فضا ہے نذر دل و جاں لیے ہوئے

شاعر نے قصیدے میں تمثال کاری کی خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں جس سے حسن اور رنگینی میں اضافہ ہو گیا ہے ۔

شبنم کی آب و تاب کا آئینہ بن گیا   ہر پھول اپنا چاک گریباں لیے ہوئے

اسی طرح ایک شعر میں تجرید کو تمثیل کا روپ یوں دیا ہے ۔

دیکھو فضا کی گود میں رقصاں لطافتیں   موج ہوا ہے سنبل پیچاں لیے ہوئے

صنعت حسن تعلیل کا استعمال بھی اشعار میں تاثیر اور خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

سورج کی ہر کرن سے ہے مصروف گفتگو   نرگس روش پہ دیدہ حیراں لیے ہوئے

زیبا ناروی کی مذہبی شاعری کا مختلف اصناف یعنی حمد ، نعت ، سلام ، منقبت قصیدہ اور مرثیہ کے حوالے سے فکری و فنی جائزہ لینے کے بعد زیبا کے ہاں بعض خصوصیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں -

سب سے اہم بات جو زیبا کی شاعری میں اجاگر ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ زیبا کو مذہب سے خصوصی لگاؤ ہے - ان کی مذہبی حس پوری طرح بیدار ہے - زیبا مذہبی تعصب سے بہت دور تھے - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی خاص مکتبۂ فکر سے ہی متعلق شاعری نہیں کی ، بلکہ ہر عقیدے اور مسلک سے بالاتر ہو کر دین اور اکابرین دین کی محبت کا اظہار کیا ہے - وہ حمد خدا بھی لکھتے ہیں ، نعت رسول بھی کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اہل بیت ، ائمہ اطہار اور بزرگان دین سے بھی خصوصی لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں - ان اصحاب کے بیان میں مبالغے سے کام لے کر اپنی شاعری میں حسن و خوبصورتی کا اضافہ کرتے ہیں -

زیبا نے مذہبی شاعری میں تقریباً تمام اکابر شخصیات کی ذات پر قلم اٹھایا ہے اور ان کے مناقب لکھے ہیں - یوں ان بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرکے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرکے زیبا نے مذہبی شاعری کے دائرے کو وسیع کیا ہے -

زیبا کی مذہبی شاعری بیشتر شعراء کی طرح اخلاقی اقدار کے فروغ میں معاون ثابت ہوتی ہے - وہ اکابر شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کے دل میں ان کی پیروی کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے - ان ہستیوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور جس طرز عمل کا اظہار کیا ، اس کی تقلید کی طرف رجحان بڑھتا ہے - اس طرح زیبا نے اپنی مذہبی شاعری میں

اعلی اخلاق و اقدار اور روحانی پہلوؤں سے دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ زیبا ایک مشاق فنکار بھی ہیں - انہوں نے شاعری کے فنی وسائل کو بھر پور طور پر برتا ہے - ان کا شعور پختہ اور زبان و بیان پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ جب وہ مناقب میں کسی کی مدح کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بہت پر جوش اور بلند آہنگ ہو جاتا ہے، لیکن جب سلام اور مرثیے لکھتے ہیں تو ان کے انداز بیان میں سوز و گداز اور رقت آ جاتی ہے -

زیبا فن کے روایتی انداز کو ہر حال میں ناگزیر سمجھتے ہیں - اس کے با وجود زیبا لکیر کے فقیر نہیں ہوتے - ان کا شعور انہیں فن کی نئی نئی سمتوں سے روشناس کراتا ہے۔ زیبا نے کئی اصناف میں اپنی جدت طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور ہئیت اور موضوع کے لحاظ سے تنوع برتا ہے -

مجموعی طور پر زیبا کی مذہبی شاعری بڑی دل آویز اور پر تاثیر ہے، جو پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر قائم کرتی ہے - اس طرح زیبا کا فنی و فکری رتبہ بلند ہو جاتا ہے -

باب چهارم :

دیگر اصناف سخن

شاعری مختلف اصناف میں کی جاتی ہے ۔ بعض اصناف کی شناخت ہئیت (FORM)
ہے، اور بعض کی موضوع یا مواد (CONTENT) ۔ اور بعض اصناف دونوں حوالوں سے پہچانی
جاتی ہیں ۔ چنانچہ وہ اصناف جو مخصوص ہئیت کی بنا پر اپنی شناخت رکھتی ہیں، انہیں
اصطلاحاً ہئیتی اصناف کہا جاتا ہے ۔ مثلاً مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، رباعی
اور قطعہ وغیرہ ۔ وہ اصناف جنہیں ہم ان کے موضوع کی وجہ سے پہچانتے ہیں، اصطلاحاً موضوعی
اصناف کہلاتی ہیں ۔ مثلاً مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب ۔ اسی طرح سے وہ اصناف سخن
جن کی شناخت مساویانہ طور پر موضوع اور ہئیت سے ہوتی ہے، انہیں اصطلاحاً موضوعی ہئیتی
اصناف کا نام دیا جاتا ہے ۔ مثلاً قصیدہ اور غزل وغیرہ ۔

ہر شعری ہئیت ایک قابل شناخت ظاہری شکل ضرور رکھتی ہے جسے دیکھتے ہی ہم
فوراً پہچان لیں کہ یہ فلاں ہئیت ہے، لیکن وہ شے جسے ہم صنف سخن کہتے ہیں التزاماً
اپنی شناخت کیلئے ایسی کوئی ظاہری شکل نہیں رکھتی ۔ یہاں تک کہ وہ اصناف جن کی پہچان
میں ان کی ہئیت بڑی حد تک ایک بنیادی عنصر کا درجہ رکھتی ہے، وہ بھی محض ہئیت ہی
کی بنا پر اپنی صنفی شناخت قائم نہیں کرتیں ۔ ہئیت کے سوا کچھ اور بھی ضروری چیزیں ہوتی
ہیں جو کسی صنف سخن کو صنف کے درجے پر پہنچاتی ہیں ۔ ان میں ظاہری ہئیت کے
علاوہ اندرونی ہئیت بھی صنفی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہو سکتی ہے ۔ مثلاً رباعی میں اس
کے چار مصرعے (الف الف ب الف) ہی واحد وسیلۂ شناخت نہیں ۔ ان چاروں مصرعوں کا رباعی
کے مقررہ ۲۴ اوزان میں سے کسی ایک وزن میں ہونا بھی ضروری ہے ۔ بصورت دیگر یہ چار
مصرعے رباعی کے بجائے قطعہ کہلائیں گے ۔ یہی صورت غزل کی صنفی شناخت میں بھی سامنے

آتی ہے ۔ مطلع ، ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار اور مقطع کے موجود ہونے سے کوئی شعری تخلیق بہ حیثیت صنف سخن غزل نہیں کہلائے گی جب تک کہ اس کا ہر شعر موضوع کے لحاظ سے نظم ہی کے غزل نہیں ۔ خواہ ہم اسے مسلسل غزل کا نام ہی دے دیں ۔ یہاں غزل صرف ایک ہئیت ہے ۔ یعنی شاعر نے غزل کی ہئیت میں نظم کہی ہے ۔ قصیدے اور مثنوی میں صنفی شناخت کیلئے ہئیت کے دوش بدوش ان کے مخصوص موضوعات بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ۔ مرثیے ، واسوخت اور شہر آشوب کی صنفی شناخت کی واحد اساس ان کا موضوع ہے ۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں صنف کا تصور محض کسی ایک ہی عنصر پر انحصار نہیں کرتا ۔

مختلف اصناف اپنی صنفی شناخت کیلئے مختلف عناصر رکھتی ہیں ۔ کہیں منتشر الخیالی ، کہیں تسلسل خیال ، کہیں موضوع ، کہیں اندرونی ہئیت اور مخصوص اوزان ، کسی صنف سخن کو صنف کے درجے تک پہچاننے کے وسیلے ہیں ۔ صنف محض ہئیت کا نام نہیں ہے ۔ ہر ہئیت صنف کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی ۔ ہئیت محض ایک طرز اظہار ہے ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اصناف مثلاً غزل ، رباعی وغیرہ کی صنفی شناخت میں ان کی مخصوص ہئیتوں نے کلیدی اور بنیادی کردار ضرور ادا کیا ہے ۔

بعض اصناف جو عام لوگوں میں اپنے موضوع کی بنا پر مقبول ہیں اور اسی حوالے سے بحیثیت صنف کے پہچانی جاتی ہیں ، ان پر بھی بسا اوقات ہئیت کا تصور حاوی ہو جاتا ہے۔ قصیدہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ غزل کی ہئیت کے حوالے سے ہی قصیدے کی صنفی شناخت ہوتی ہے ۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کی شناخت موضوع اور ہئیت دونوں وسیلوں سے ہوتی ہے۔

اردو شاعری میں غزل اور مثنوی کی دوھری حیثیت ھے - ایک طرف تو یہ دونوں مکمل اصناف ھیں ، دوسری طرف یہ مقبول ترین ھئیتیں بھی ھیں - ان کے مخصوص میدان سے ھٹ کر ان کی ھئیتوں میں دیگر اصناف سخن لکھی جا سکتی ھیں - حالی ، اقبال اور جوش وغیرہ نے اپنی نظموں کیلئے غزل اور مثنوی کو بہ حیثیت شعری ھئیت کے اختیار کیا - مثنوی کے سلسلے میں یہ بات ضروری ھے کہ اسے صنف سخن کا درجہ دیتے وقت اس کے موضوع اور ھئیت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے -

ھئیت کی بنا پر اصناف سخن کی درجہ بندی کا ایک منطقی جواز یہ ھے کہ اس طرح اصناف کی تعداد محدود اور قابو میں رکھی جا سکتی ھے - موضوعات چونکہ ھئیتوں کے مقابلے میں لا محدود ھوتے ھیں ، لہذا اگر خالصتاً انہیں کو صنفی شناخت کا اصول و معیار قرار دیا گیا تو اس سے اصناف کی تعداد غیر ضروری طور پر بڑھ جانے کا خدشہ لاحق ھو سکتا ھے - مگر یہ جواز ان صورتوں میں بہرحال قابل قبول نہیں ھو سکتا جہاں کوئی موضوع ھماری شعری روایت کا ایک حاوی رجحان بن چکا ھے اور اس کی وجہ سے کوئی صنف سخن وجود میں آنے کے بعد اپنی مستقل شناخت بنا چکی ھو، اس معاملے میں جب بھی صنفی شناخت کی گفتگو ھو گی تو اس کے موضوع ھی کو بنائے ترجیح قرار دیا جائے گا - مرثیہ ، واسوخت ، شہر آشوب اسی اصول ھی کے تحت آئیں گے - اس کے بر خلاف جب بھی غزل پر بات ھو گی ، ھئیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ غزل کی شناخت کا تمام تر دار و مدار اسی پر ھے -

گویا واضح ہوا کہ صنفی شناخت کیلئے مضبوط و توانا شعری روایت کے پیش نظر ، موضوع اور ہئیت کو بہ قدر ضرورت ملحوظ رکھنا ہو گا ۔ یعنی کچھ اصناف سخن کی شناخت موضوع پر مبنی ہو گی ، کچھ کی ہئیت پر ، بعض کی مساویانہ طور پر موضوع اور ہئیت دونوں پر ہو گی ۔ بعض کی موضوع پر ہو گی اور نہ ہئیت پر ۔ مثلاً نظم اور گیت ۔

زیبا ناروی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور یہی ان کی پہچان ہے ۔ لیکن انہوں نے مختلف ہئیتوں اور صنفوں میں نظم گوئی بھی کی ہے ۔ مثلاً رباعی ، قطعہ ، خمسہ یا مخمس مثنوی ، مسدس ، قصیدہ ، مرثیہ ، نعت ، حمد ، منقبت ، سلام وغیرہ ۔ یہ تمام اصناف اور ہئیتیں کلاسیکی شاعری کی ہیں اور ان کی ظاہری ساخت بحر ، مصرعوں کی خاص تعداد اور مخصوص ترتیب قوافی ہے ۔ جدید ہئیتوں میں سے بعض (مثلاً معرا نظم ، آزاد نظم) میں ان کی پابندی اس نوعیت کی نہیں ہے ۔ زیبا ناروی نے محض کلاسیکی ، شعری ہئیتوں کو ہی درخور اعتنا خیال کیا ہے ۔ نئی ہیئتوں میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا ، لہذا اس اعتبار سے بھی وہ روایتی شاعر ہیں مگر ان کے ہاں موضوعاتی تنوع ہے ۔ جیسے انہوں نے مذہب معاشرت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نظمیں لکھی ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ سہرے ، قطعات تاریخ اور فرمائشی منظومات بھی ان کے کلام میں شامل ہیں ۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس سے متعلق شاعری پر ہم ایک الگ باب میں بحث کر رہے ہیں ۔ یہاں اس کے علاوہ شاعری کا جائزہ لیا جائے گا ۔

رباعی :

رباعی عربی لفظ " ربع " سے بنا ہے ۔ رباعی میں " ی " نسبتی ہے ۔ گویا رباعی کے لغوی معنی ہیں " چار چار " ۔ اصطلاحاً اس سے وہ شعری ہئیت مراد ہے ، جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو ۔ رباعی کے چاروں مصرعوں میں خیال مربوط و مسلسل ہوتا ہے اور آخری مصرعے میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے ۔ اس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرا بے قافیہ ۔ تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کی مثالیں مل جاتی ہیں اور بعض لوگوں نے اسے مستحسن قرار دیا ہے ۔

رباعی کا ابتدائی نام ترانہ تھا ۔ ایک مطلع اور ایک شعر یعنی دو ابیات کی وجہ سے اس کا نام دوبیتی بھی رہا ہے ۔ چار مصرعوں کے سبب اسے چہار مصراعی بھی کہا گیا ۔

غزل کی طرح رباعی بھی مردف اور غیر مردف ہو سکتی ہے خواہ صرف قافیہ لائیں یا قافیہ ردیف دونوں ۔ چونکہ عربی شاعری میں ردیف کا رواج نہ تھا اس لیے قدیم فارسی دان عربی شعراء نے اکثر غیر مردف رباعیاں کہی ہیں ۔

رباعی بحرِ ہزج مثمن (اخرب یا اخرم) میں لکھی جاتی ہے اور اس کے چوبیس اوزان مقرر ہیں ۔ رباعی کی ظاہری ہئیت میں ایسی کوئی مخصوص و اہم بات نہیں جو اسے صنف کی حیثیت سے شناخت کرائے ۔ اس کی صنفی شناخت ان مخصوص اوزان میں مضمر ہے ، جن میں سے اگر کسی ایک وزن میں بھی کوئی دو شعر نہیں ہیں تو وہ رباعی نہیں کہلائیں گے ، انہیں قطعہ کہا جائے گا ۔ [1]

---

1 ۔ شمیم احمد " اصناف سخن اور شعری ہئیتیں " تخلیق مرکز ۔ 33 اے شاہ عالم گیٹ لاہور ص 70

رباعی اردو کی مختصر ترین صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان ، وحدت فکر اور تسلسل بیان کی پابندی از بس ضروری ہے ۔ رباعی میں تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقاء کے خوبصورت اظہار کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں ۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب موضوع کی مطابقت سے ایسا بر محل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے ۔ پہلے مصرعے میں متناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خد و خال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اس طرح رباعی کے پہلے تین مصرعے گویا رباعی کے مجموعی شاعرانہ حسن و اثر کیلئے ایک لطیف اور سادہ فضا تیار کرتے ہیں جس سے سامع اکثر بے خبر رہتا ہے ۔ لیکن یہی سادہ و پرکار فضا جب چوتھے مصرعے میں ڈرامائی انداز سے سامنے آتی ہے تو بڑی جرأت آزما بن جاتی ہے ۔

رباعی کے دو مصرعوں بالخصوص چوتھے مصرعے پر رباعی کی عمدگی اور تاثیر کا انحصار ہوتا ہے ۔ اس لیے آخری مصرع زور دار ہونا چاہئیے ۔ مولانا حامد حسن قادری نے ایک منقبتیہ رباعی میں چوتھے مصرعے کی اہمیت و عظمت کا اظہار عجیب و غریب انداز سے کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :-

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی

زیبا ہے مگر حضور کو تاج شہی

ہے خاتمہ حسن عناصران پر

ہیں مصرعۂ آخر اس رباعی کے وہی

اس کے علاوہ چونکہ رباعی پر قلیل الالفاظ اور کثیرالمعانی صنعت کا اطلاق ہوتا ہے ۔ اس لیے جب تک موضوع کی مطابقت سے مناسب و موزوں اسلوب بیان ہاتھ نہ آ جائے ، کامیاب رباعی کا وجود میں آنا مشکل ہے ۔ اس لیے فنی پابندیوں کے ساتھ زبان کی صحت ، سلاست روانی اور بلاغت کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہئیے ۔ ایران کے قدیم ترین علم فن محمد بن قیس رازی مصنف " المعجم فی معایر الاشعار العجم " کا خیال ہے کہ رباعی کو قوافی کس موزونیت ، الفاظ کی شیرینی ، معانی کی لطافت ، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور دوسرے لسانی محاسن سے مالا مال اور الفاظ کی بے جا تقدیم و تاخیر ، تعقید لفظی و معنوی اور ابتذال و فحش گوئی سے بالکل پاک ہونا چاہئیے ۔ [1]

چونکہ رباعی میں ایک وسیع مضمون کو سمیٹ کر بیان کیا جاتا ہے ، اس لیے ایجاز و اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ رباعی اپنی نوعیت و خصوصیات کی بنا پر ایک مشکل صنف سخن ہے ۔ اس کی بحر عام طور پر دشوار سمجھی جاتی ہے اس لیے کثیر تعداد میں رباعیاں نہیں کہی گئیں ، لیکن اس کے باوجود یہ صنف ہر عہد میں مقبول اور محترم رہی ہے ۔ چنانچہ ہر بڑے شاعر نے تھوڑی بہت رباعیاں ضرور کہی ہیں ۔ گویا جب تک کوئی شاعر قدرت بیان اور قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ رباعی کے مخصوص اوزان و بحور سے ذہنی ہم آہنگی و مناسبت نہ رکھتا ہو، رباعی گوئی کی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔

1۔ فرمان فتح پوری " اردو رباعی " (فنی و تاریخی ارتقاء) مکتبہ سنگ میل کراچی ص 2

جہاں تک رباعی کے موضوعات و مضامین کا تعلق ہے ۔ ابتداً اس میں مذہب کے زیر اثر صرف حمد ، نعت اور توحید کا ذکر ہوتا تھا ۔ رفتہ رفتہ متصوفانہ خیالات کے ساتھ معارف و حقائق کا دخل خاص طور پر ہونے لگا ۔ لیکن چونکہ قدیم صوفیائے کرام مصلح اخلاق اور مفکر دین بھی ہوا کرتے تھے ۔ اس لیے صوفیانہ رنگ میں مواعظت پند اور حکمت و فلسفہ بھی شامل ہوا اور اس طرح رباعی نے ایک بڑے شعبہ حیات کو محیط کر لیا ۔ رباعی میں غزل کی سی لچک اور وسعت ہے ۔ جس طرح مختلف دور کی غزل میں مختلف رجحانات ملیں گے بالکل اسی طرح رباعیاں بھی اپنے عہد کی آئینہ دار نظر آئیں گی ۔ اس لیے رباعی کے موضوعات کی حد بندی نہیں کی جا سکتی ۔ حمد ، نعت ، منقبت ، دنیا کی بے ثباتی ، تصوف ، فلسفہ ، عشق ، سیاست ، اخلاقیات ، مناجات ، منظر نگاری ، غرض دنیا کے ہر موضوع پر رباعی کہی جا سکتی ہے ۔ باعتبار موضوع اس کا دامن بے حد وسیع ہے ۔

رباعی فارسی شعرا کی ایجاد ہے ۔ رودکی اولین رباعی گو مانا جاتا ہے ۔ فارسی میں بابا طاہر عریاں ، عمر خیام ، سرمد ، ابوسعید ابو الخیر ، فرید الدین عطار ، سعدی وغیرہ معروف رباعی گو ہیں ۔ اردو کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں ۔ اردو میں حمدیہ ، نعتیہ ، مدحیہ ، خمریہ ، عشقیہ ، فلسفیانہ اور اخلاقی غرض ہر نوعیت کی رباعیاں موجود ہیں ۔ قلی قطب شاہ ، سراج اورنگ آبادی ، ولی ، درد سودا ، میرؔ ، انشاء ، میر حسن ، نظیر ، ذوق ، غالب ، مومن ، انیس ، دبیر ، حالی ، اکبر وغیرہ نے شاندار رباعیاں لکھی ہیں ۔ دور جدید میں اقبال ، امجد حیدر آبادی ، جوش ، یگانہ ، فانی

فراق ، محروم ، عبدالباری آسی ، اثر صہبائی اور دیگر بہت سے شاعروں نے رباعی کی طرف توجہ دی ۔ بعض شاعروں نے رباعیات کے مجموعے بھی شائع کیے"۔[1]

زیبا تاروی کی جو رباعیات مختلف رسائل میں شائع ہوئیں ، وہ تعداد میں تو نسبتاً کم ہیں ، لیکن ان کی غیر مطبوعہ رباعیات کی تعداد 56 ہے ۔ ان میں بہت سی فکری اور فنی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔

ان کی رباعیات کے موضوعات زیادہ تر حمد ، عشق اور اخلاقیات سے متعلق ہیں ۔ زیبا کی رباعیوں میں روایتی انداز ملتا ہے ۔ بے ثباتی کائنات ، پند و نصائح اور غور فکر کی دعوت جو اکثر شعراء کی رباعیوں کا موضوع رہا ہے، زیبا کے ہاں بھی نظر آتی ہے ۔ اس کے علاوہ ان رباعیوں کی اساس انسانی زندگی ، انسانی عظمت اور صوفیانہ مضامین ہیں۔ انہوں نے زندگی کی عام اور مسلمہ حقیقتوں کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ایک منفرد اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کشمیر کے قضیے اور زبان اردو کی اہمیت کو بھی انہوں نے اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا ہے ۔ اس طرح ان کی رباعیات مضامین کے اعتبار سے تنوع کی حامل ہیں ۔ کسی میں تعلی کا پہلو ہے، کسی سے اخلاقی اقدار کی پامالی کا غم چھلکتا ہے تو کسی سے غم دوراں کی شکایت کا پہلو نکلتا ہے ۔

زیبا تاروی کی رباعیوں میں زیادہ تر تصوف و معرفت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں ۔ وہ مظاہر فطرت میں ہر طرف اللہ کے جلوے دیکھتے ہیں اور ہر چیز میں انہیں خداتعالیٰ کا حسن

1۔ رفیع الدین ہاشمی " اصناف ادب " سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۔ 1979ء

اور اس کی قدرت کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ خدا سے براہ راست مخاطب ہونا چاہتے ہیں ۔ اس سے روحانی تعلق کے خواہاں ہیں ۔ اس لیے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ تو مجھے اپنے قرب سے نواز ۔ تیرے یہ مظاہر جو میرے سامنے ہیں ، در اصل گھونگٹ ہیں جو تیرا چہرہ مجھ سے چھپائے ہوئے ہیں ۔ تو مجھ سے اوجھل نہ رہ اور مجھے اپنے دیدار سے فیضیاب کر ۔ درج ذیل رباعی بظاہر مجازی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن تغزل کی روایت کے مطابق اس رباعی میں بھی مجاز اور حقیقت کا معانقہ اور ربط باہم محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

کچھ ہو جو پرکھ بات ہماری تولو
کیوں گنگ بنے بیٹھے ہو منہ سے بولو
در پردہ یہ کیا دعوہ یکتائی ہے
چہرہ تو دکھاؤ ہمیں گھونگٹ کھولو

شاعر یہ چاہتا ہے کہ اسے ایسا ساقی ملے جو معرفت کی شراب مہیا کرے ۔ وہ ایسا شخص ہو جو اسے عشق کی انتہا تک لے جانے والا ہو ۔ یعنی ایسا صوفی جو اپنی عبادت و ریاضت میں اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ سلوک کی منزلوں تک رسائی حاصل کرنے کیلئے صوفیانہ الاؤ میں جل کر کندن بن چکا ہو اور جب ہم اس کی طرف رجوع کریں تو ہمیں اس کی سچائیوں اور اس کی قوت کا احساس فوراً ہو جائے ۔ زیبا کہتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی ساقی مجھے ملے تو میں اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کیلئے تیار ہوں ۔ ساقی کی ایک نگاہ میری دنیا بدل سکتی ہے ۔

پی کر نہیں پھر ہوش میں آنے والا

دیکھے تو ادھر مست بنانے والا

میں منتظر چشم کرم ہوں زیبا

ہو بھی کوئی آنکھوں سے پلانے والا

زیبا چونکہ ایک صوفی منش انسان تھے اس لیے وہ دنیا داری اور جاہ و حشم سے زیادہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر حال میں خدا تعالی کا شکر ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا جس نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا ، اس کی عظمت اور بڑائی کا بیان بس سے باہر ہے ۔ اس کی عنایات بے حد و حساب ہیں ۔ وہ جس قسم کی زندگی عطا کرے ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں ۔

مے خانہ ہستی میں جئے جاتے ہیں

ہم شکر بہرحال کیے جاتے ہیں

زیبا وہ مئے ناب ہو یا زہر کے گھونٹ

ساقی جو پلاتا ہے پئے جاتے ہیں

زیبا ناروی کے ہاں رندانہ مضامین بھی بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ اپنے رندانہ اور سر خوشی ، شوق و مستی کا ذکر کرتے ہیں کہ زاہد یا ظاہری عبادت کرنے والے مجھ سے ناراض ہیں لیکن میں اپنے ذوق کے ہاتھوں مجبور ہوں ، اور جب سر محفل مجھے ساقی نظر آ جاتا ہے تو میں اپنی توبہ کو بھول جاتا ہوں ۔

مجھ پر نہ حرم والے ہوں نکلے پہلے

سر تھیں یہ فضائیں کہ ہٹھلے پی لے

ساقی سے نگاہیں جو سر بزم لڑیں

توبہ نے کہا ٹوٹ کے بس لے پی لے

زیبا بظاہر نظر آنے والی شراب سے ہی محظوظ نہیں ہوتے ، وہ آنکھوں ہی آنکھوں

سے بھی اس کی لذت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں ، اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔

دیکھی بھی نہیں گو مئے ناب آنکھوں سے

مل جاتا ہے پینے کا ثواب آنکھوں سے

وہ رند ہوں میں ، چشمک ساقی کی قسم

پیتا ہوں سلیقے کی شراب آنکھوں سے

ان کی کیفیات رندانہ مختلف ہیں ۔ وہ شراب پیتے ہیں لیکن یہ معرفت کی شراب ہے

جو جدا نوعیت کی حامل ہے ۔ اس کا ذکر مندرجہ ذیل رباعی میں کرتے ہیں ۔

عرفان طلب جذبہ ہستی ہے جدا

ہر کیفیت رندی و مستی ہے جدا

پیتا ہوں ! مگر میں نہیں پیتا یہ شراب

واللہ مری بادہ پرستی ہے جدا

زیبا ناروی کی رباعیات میں کئی مقامات پر عشق و محبت کے معاملات کی عکاسی کی گئی

ہے ۔ محبت میں انسان ہر قسم کی تکالیف اور درد برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے ۔ دنیا اسے خواہ کتنے ہی طعنے دے اور آزار کیوں نہ پہنچائے ، وہ انہیں اہمیت نہیں دیتا ۔ لیکن محبوب کی ایک ہی نفرت بھری نگاہ اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیتی ہے ۔ دل کا آئینہ کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا ہے ۔ اس جذباتی کیفیت کا بیان یوں کرتے ہیں ۔

الفت میں غم و رنج یہ سہہ جاتا ہے
جو چاہے زمانہ اسے کہہ جاتا ہے
ان کی نگہہ قہر جو پڑتی ہے کبھی
آئینہ دل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے

زیبا نے " عید کے دن " کے عنوان سے بعض رباعیات لکھی ہیں ۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ محبوب بغیر عید کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ لوگ خوشیاں منا رہے ہیں لیکن عاشق کو کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی ۔ جبکہ محبوب اسے بھول کر خود رنگینیوں اور مستیوں میں ڈوبا جشن و طرب کے نغمے الاپ رہا ہے ۔ ایسے میں عاشق کے درد بھرے دل سے یہ آواز نکلتی ہے۔

گھر بیٹھے ہوئے جشن منایا تم نے
جس لطف کے طالب ہوئے پایا تم نے
بھولے سے بھی ہم یاد نہ آئے تم کو
یوں عید کے دن ہم کو بھلایا تم نے

وہ عید کی خوشیاں لہو رو کے منا رہا ہے اور اسے یہ دکھ محبوب نے دیا ہے -

اس لیے اس کی خواہش ہے کہ کاش محبوب آ کر یہ دیکھ لے کہ وہ کس حال میں ہے-

اک بار نظر اپنی اٹھا کر دیکھیں

رونے کا تماشا بھی رلا کر دیکھیں

آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو عید کے دن

اے کاش مری عید وہ آکر دیکھیں

عاشق ایک لمحے کیلئے بھی محبوب کے خیال سے باز نہیں رہ سکتا - ہر دم اسی کی یاد میں مگن اور اسی کے غم میں سلگتا رہتا ہے - اس کا ذکر ایک رباعی میں یوں کرتے ہیں -

یاد ان کی نہ دم بھر کو بھلائی میں نے

فرصت غم فرقت سے نہ پائی میں نے

ہر رنج ہر آزار رہا دوش بدوش

مل مل کے گلے عید منائی میں نے

عاشق کیلئے وہی دن عید کا ہو سکتا ہے جب اس کا منظور نظر اس کے سامنے ہو- اس لیے وہ آسمان پر نکلے ہوئے چاند سے التجا کرتا ہے کہ وہ معجزہ دکھائے اور اس کے چاند کو بھی لے آئے -

گردوں پہ رہے جلوہ نما عید کے دن

اعجاز سر شام دکھا عید کے دن

پر نور ہوں میں میرا سیہ خانہ بھی

اے چاند ، مرے چاند کو لا عید کے دن

زیبا ناروی کی رباعیوں میں ایک پہلو یہ ابھرتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں اور اتنا حوصلہ اور ہمت نہیں رہتی جتنی کہ عشق کو برداشت کرنے کیلئے درکار ہوا کرتی ہے ۔ طبعیت میں سستی آ جاتی ہے ۔ پہلا سا جوش اور توانائی نہیں رہتی ۔

گرمی ہو کہ برسات ہو ، یا ہو سردی

کافور ہے ہر کار ہوئی یا مردی

اعصاب ہوئے سست وہ کس بل نہ رہا

پیری نے جوانی میں کمر خم کر دی

دل ، دماغ ، ذہن ، نظر سب کی کیفیت و حالت پہلے جیسی نہیں رہتی ۔ سب کچھ بدل کر رہ جاتا ہے ۔ جوانی کی رزم و بزم کا شائبہ تک نہیں رہتا ۔ اور وہ مثیل صادق آتی ہے کہ بڑھاپا سو بیماریوں کی جڑ ہے ۔ زیبا اپنی ایک رباعی میں بڑھاپے کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

ذہن و نظر و دل کی تباہی توبہ

رہ رہ کے یہ اعضاء کی جماہی توبہ

اب رزم کہاں ، بزم کہاں اے زیبا

" یک پیری و صد عیب الٰہی توبہ "

ان رباعیوں میں زیبا نے جو مضمون بیان کیا ہے، اسی قسم کے خیالات کو غالب نے بھی اپنی ایک غزل میں سمویا ہے - مثلاً چند اشعار دیکھئیے -

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ وسال کہاں
مضمحل ہو گئے قوی غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اخلاقی مضامین رباعی کی جان ہیں - قدیم رباعیات میں زیادہ تر اخلاقی مضامین ہی ملتے ہیں - شعراء مختلف انداز سے لوگوں کو پند و نصیحت کرتے ہیں ، اور اچھے کام کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں - زیبا ناروی کی رباعی کا بیشتر حصہ اخلاقی موضوعات پر مشتمل ہے - اکثر رباعیات میں انہوں نے اخلاقی اقدار کا ذکر کیا ہے جو اب پامال ہو گئی ہیں - ان کی نظر میں زندگی کا حسن بھی اخلاقی قدریں ہیں - انسانی قدریں ہی حسن ، خیر اور صداقت کے ناموں سے موسوم ہیں ، اور مہذب معاشروں کا سرمایہ ہیں - زندگی میں خیال و عمل کا حسن ان قدروں سے ہی ترتیب پاتا ہے - زیبا ناروی کو گلہ ہے کہ مسلمانوں میں اقدار کی پاسداری کا شعور نہیں رہا ، ایک دوسرے کا ادب ، لحاظ ختم ہو چکا ہے - نفسا نفسی کا دور دورہ ہے - احساس مر چکا ہے -

جو آئے عمل راس ، وہ باقی نہ رہا
اک دوسرے کا پاس وہ باقی نہ رہا

کہنے کو مسلمان ، مسلمان تو ہے
افسوس کہ احساس وہ باقی نہ رہا

کہیں نصیحت کرتے ہیں کہ غصہ اخلاق کو تباہ کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ اس لیے انسان کو غصے پر قابو رکھنا چاہئیے ۔

میخانہ اخلاق میں لا کر پی جا
نظروں سے زمانے کی بچا کر پی جا
غصہ جو کسی بات پر آ جائے تجھے
اس آگ کو پانی میں بجھا کر پی جا

زیبا ناروی عملی زندگی میں بڑے ہمدرد ، انسان دوست اور رحمدل واقع ہوئے تھے ۔ اس لیے وہ اپنے کلام میں انسان دوستی اور ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ وہ اس شخص کو انسان نہیں سمجھتے جس کے دل میں مظلوم کیلئے ہمدردی نہ ہو اور جو دوسرے کی تکلیف پر تڑپ نہ جائے ۔ جو لوگ احساس سے عاری اور فتنے برپا کرنے والے ہوتے ہیں ، زیبا انہیں انسانیت کیلئے باعث شرم قرار دیتے ہیں ۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔

مانا کہ سر بزم چمن ہوتے ہیں
لیکن صفت زاغ و زغن ہوتے ہیں
زیبا پس پردہ جو اٹھائیں فتنے
وہ ننگ آدب دشمن فن ہوتے ہیں ۔

ان کے نزدیک انسان کی طمانیت انسانیت کی خدمت میں مضمر ہے -

زیبا ناروی کے ہاں ایک اور اہم موضوع بے ثباتی کائنات کا ہے - یہ موضوع بھی رباعی کا روایتی موضوع ہے - زیبا بنیادی طور پر ایک روایت پسند شاعر ہیں - اس لیے انہوں نے کچھ تو روایت سے اثر قبول کیا اور کچھ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو بیان کیا - موت ایک اٹل حقیقت ہے - جس دن موت کا پیغام آنہکا انسان کو ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں ملے گی - اس حقیقت کا ذکر اشعار میں یوں کیا ہے -

اک سانس ہوا لینے کی مہلت نہ ملی

دنیا کو مٹا لینے کی مہلت نہ ملی

بالیں پہ اجل آئی جو لینے کیلئے

گردن بھی پھرا لینے کی مہلت نہ ملی

دنیا فانی ہے - ہر چیز ختم ہو جائے گی - مال و زر ساتھ نہیں جائے گا ، ہر رشتہ ، ناتا ٹوٹ کر رہ جائے گا - زیبا دنیا کی اس عارضی زندگی سے دل نہ لگانے کی تلقین کرتے ہیں --

احباب زر و مال سے منہ موڑ گئے

رشتے جو تھے دم بھر میں وہ سب توڑ گئے

کچھ لے نہ گئے ساتھ عدم کے رہ رو

خود چل دیئے سامان یہیں چھوڑ گئے

زیبا ناروی کے ہاں ایسی رباعیات بھی مل جاتی ہیں جن میں ان کی ذات کا عکس دکھائی دیتا ہے - ان کی زندگی جن محرومیوں یا دکھوں میں گزری ، اس کا ذکر اپنی رباعیوں میں کرتے ہیں - انہیں کئی غموں سے دوچار ہونا پڑا - اور آہوں اور سسکیوں میں راتیں بسر کرنا پڑیں - انسان پریشان ہو تو اپنے خیالات کو متاسب اور دلکش الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا - پرکیف مضامین سے اپنے کلام کو آراستہ نہیں کرسکتا - زیبا اپنی ذاتی نامرادیوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں -

اس طور سے کٹ جاتی ہیں غم کی راتیں
کچھ جی کے بہلنے کی یہی ہیں گھاتیں
مظلوم ہوں آہوں کا سہارا لے کر
میں چرخ سے کرتا ہوں ہوائی باتیں

یہاں تک کہ وہ عبادت میں بھی ان رنج و الم سے چھٹکارا نہیں پا سکتا - اس کا ذہن بھٹکتا رہتا ہے -

گزری ہوئی روداد زمانہ پڑھیے
کیا عہد کا پہلے تھا فسانہ پڑھیے
میں پڑھتا ہوں تکبیر غم و رنج و الم
احباب یہ کہتے ہیں دوگانہ پڑھیے

زیبا ناروی کی رباعیوں میں معاشرتی موضوعات بھی ملتے ہیں - وہ آج کے انسان سے بہت نالاں ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت و مروت نہیں برتتے - ایک دوسرے سے ہمدردی

نہیں کرتے ۔ لوگوں کی نظریں بدل گئی ہیں احباب بیگانہ ہو گئے ہیں۔ مال و زر کے غلام بن گئے ہیں۔ حسن کا زیبا کو بے حد دکھ ہے۔

دیرینہ مراسم پہ نہ چلنا دیکھا

بچ بچ کے سر راہ نکلنا دیکھا

خیر اور تو جو کچھ بھی ہوا عید کے دن

احباب کی نظروں کا بدلنا دیکھا

زیبا اپنے ارد گرد معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ پرانے دستور و مراسم بدل کر رہ گئے ہیں ۔ قدیم تہذیبی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے ۔ اب کسی کو کسی کا احساس نہیں ہے ۔ دنیا خود غرض ہو گئی ہے ۔

جو طور بھر طور تھے معقول گئے

دنیا کے وہ دستور وہ معمول گئے

غربت میں کسی نے بھی نہ پوچھا ہم کو

احباب ہمیں عید کے دن بھول گئے

دنیا میں مکر و فریب نے انسان کو تباہ کر دیا ہے ۔ فہم و فراست جیسی خصوصیات باقی نہیں رہیں ۔

آئینہ ہستی بھی ہر زیب دنیا

ادراک سے بالا ہے شہب دنیا

دنیا نے کیا مکر سے انساں کو تباہ

اللہ رے دنیا میں فریب دنیا

زیبا ناروی انسانی عظمت کے قائل ہیں اور اس کا ثبوت ان کی رباعیوں سے بھی ملتا ہے ۔ وہ اس چیز کے قائل ہیں کہ انسان میں تسخیر کا مادہ موجود ہے ۔ اگر وہ نگاہ بھی اٹھا دے تو کائنات کی تمام قوتیں مسخر ہو جائیں اور چاند ستارے مطیع ہو جائیں ۔

مانوس نظر شام و سحر ہو جائیں
محکوم ابھی شمس و قمر ہو جائیں
بھولے سے اٹھاوں جو نگاہ تسخیر
کونین مرے زیر اثر ہو جائیں

ان کے نزدیک مسلمان کا مقام بہت بلند ہے ، اور اگر وہ اپنے عقائد پر کامل یقین رکھتا ہو تو بڑے بڑے کارنامے سر انجام دے سکتا ہے اور آفاق کی حدوں کو چھو سکتا ہے ۔

میدان قیامت کے دکھا دیتا ہے
مشرق کو یہ مغرب سے ملا دیتا ہے
جب ہوش میں آتا ہے مسلمان کبھی
پانی مہ و انجم کو پلا دیتا ہے ۔

زیبا ناروی کی بعض رباعیوں میں واقعہ کربلا سے متعلق دلدوز مناظر بھی پیش ہوئے ہیں ۔ زیبا جب کربلا کے واقعات ذہن میں اور آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں تو انہیں ہر طرف اداسی نظر آتی ہے ۔ فرات کی لہریں رنج و الم سے لبریز اور ہر موج ماتم کرتی دکھائی دیتی ہے ۔ لیکن واقعہ کربلا کو بھی انہوں نے زمانی تسلسل کے ساتھ مربوط کیا ہے اور یوں عصری شعور یہاں بھی آ گیا ہے ۔

یاد ستم کرب و بلا آتی ہے
غم دیدہ و نم دیدہ ہوا آتی ہے
دریائے فرات اب بھی ہے مصروف الم
ہر موج سے ماتم کی صدا آتی ہے

زیبا نے اپنی رباعیوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی ہے ۔ جو مزدور کو اس کا جائز حق بھی نہیں دیتا اور استحصال کا شکار رکھتا ہے ۔ اس کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ۔ مزدور جو رات دن ایک کرنے کے بعد روپیہ پیدا کرتا ہے، اسی روپیہ بنانے والے کے ہاتھ پر مزد رکھتے وقت ظالم سرمایہ دار سو سو حیلے بہانے کرتا ہے تاکہ اسے کم سے کم دے ۔ یہ نظام حساس انسان کو خون کے آنسو رلاتا ہے ۔ زیبا نے اپنے دل کے درد کا احساس یوں دلایا ہے ۔

کانٹوں کے بچھونے پہ یہیں سوتا ہے
سرمایہ پرستوں پہ لہو روتا ہے
یہ خاک کا غازہ یہ فلاکت کا لباس
مزدور پسینے سے جبیں دھوتا ہے

دنیا ان کے نزدیک میخانہ ہے جہاں مختلف قسم کی شرابیں انسان کو مست کر دیتی ہیں ۔ اس لیے وہ دنیا میں آنے کو ایک ناکردہ گناہ کی سزا قرار دیتے ہیں ۔

جتنی بھی بلندی ہو یہاں پستی ہے
بے شبہ خرابات جہاں مستی ہے

افکار علائق نے بتایا ہم کو

ناکردہ گنا ہی کی سزا ہستی ہے

زیبا ناروی نے تین رباعیات بعنوان " یوم اقبال " لکھی ہیں جن میں انہوں نے اقبال کے یوم ولادت کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے یہ دعا کی ہے کہ اقبال کا دن تاریخ میں جلی حروف میں لکھا جاتا رہے اور مسلمان ہر سال مل جل کر اس دن کو مناتے رہیں اور اقبال کے افکار کی روشنی میں اپنے اعمال کو درست راہوں پر ڈال سکیں - تاکہ ان کیلئے کامیابیوں کے دریا ہو جائیں -

مل جل کے مسلمان منائیں ہر سال

اس باب میں تابندہ ہو طرز اعمال

زیبا یہ دعا ہے کہ بعنوان جلس

تاریخ میں روشن رہے یوم اقبال

ان کے نزدیک اسلام کی عظمت و توقیر کو جلا بخشنے اور مستحکم رکھنے کا راز اقبال کے نقش قدم پر چلنے میں ہے -

اسلامی اصولوں پر کاربند رہنے سے مسلمان صاحب تدبیر بن جاتا ہے - اور اس کیلئے ایثار، عمل اور صدق و وفا کو اپنانا ضروری ہے -

خوش فکر بنو صاحب تدبیر بنو

اسلام کی منہ بولتی تصویر بنو

ایثار ، عمل ، صدق ، صفا ، نظم اصول

اقبال کے ہر خواب کی تعبیر بنو

زیبا ناروی داغ کے دبستان سے وابستہ تھے - اور ان شعراء کے ہاں زبان اردو بنیادی حیثیت رکھتی تھی - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زبان کی اصلاح و درستی کی طرف خاص توجہ دی اور اس کا معیار بلند کیا - زیبا نے بھی اردو زبان سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کے فروغ کیلئے اپنی بساط بھر کوشش کی - انہوں نے 9 رباعیات میں اردو کی شان ، اس کی عظمت اور اہمیت کا بیان کیا ہے - مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دلی کی یہ ایجاد تمام عالم میں نور بن کر چھائی ہوئی ہے اور اللہ کی مہربانی سے ساری دنیا میں اردو کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے - یہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی - فصاحت کی تکمیل اردو سے ہی ہوتی ہے - یہ جدا انداز کی مالک ہے اور ادب کے چمن کی روح ہے -

اللہ و غنی رفعت و شان اردو

دلچسپ و دل آویز بیان اردو

دلی کی یہ ایجاد جہاں گیر ہوئی

چھائی ہوئی ہے نور جہان اردو

ہر ملک میں اردو کلام اور پیام پہنچ چکا ہے اور دوسری قوموں کو اس کے لطف کا اندازہ ہو گیا ہے -

لندن کو ملا لطف کلام اردو

قائم ہوا جرمن میں نظام اردو

کس ملک میں پہنچا نہیں اردو کا پیام

ہر ملک میں پہنچا ہے پیام اردو

ہماری تہذیب و تمدن کیلئے روشنی کا مینار اردو ہے، اور اس کی ترقی کیلئے مدد گار ہے۔

کیا چیز ہیں ، کچھ بھی نہیں کنکر پتھر

خود راہ سے ہٹ جائیں گے سنگین منظر

تہذیب و تمدن کی یہ ہے مشعل راہ

آگے بڑھو اردو کا سہارا لے کر

زیبا کو فکر ہے کہ اردو زبان مٹ نہ جائے کیونکہ بہت سے لوگ اس کے دشمن ہو چکے ہیں ۔ ہم چاہے خود ختم ہوجائیں ، اردو تا ابد قائم رہے ۔ اسی سے ہمارا نام زندہ ہے۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اردو کو مٹانے والے نیست و نابود ہو جائیں اور ان کے ارادے خاک میں مل جائیں ۔

رنجور ہوں اردو کو مٹانے والے

بس دور ہوں اردو کو مٹانے والے

اڑ جائیں زمانے سے الہی آمین

کافور ہوں اردو کو مٹانے والے

زیبا کی تلقین یہ ہے کہ اردو کو آگے بڑھانے اور قائم رکھنے کیلئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے سیکھا جائے ۔ اپنی گرفت اس پر ڈھیلی نہ ہونے دی جائے ۔

اسی طرح سے زیبا ناروی نے " قضیہ کشمیر " کے عنوان سے سات رباعیاں کہی ہیں ۔ جس میں انہوں نے کشمیر کو مسلمانوں کی جاگیر قرار دیا ہے اور اس عزم کا اعادہ کیا ہے

کہ اللہ کے حکم سے کشمیر مسلمانوں کا مقدر بنے گا اور دشمن کو اپنے ناپاک ارادوں میں ناکامی ہو گی ۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ۔

سو سال چلی خوب ستم رانوں کی
جنگل نہیں بستی ہے یہ انسانوں کی
غاصب سے کہو دور رہے دور رہے
کشمیر ہے جاگیر مسلمانوں کی

ہم مرد مجاہد ہیں ، اپنے موقف پر ڈٹے رہیں گے ۔ تقسیم تو وہ چیز کی جاتی ہے جو دو افراد کا حق ہو ، لیکن کشمیر تو ہے ہی ہمارا اس لئے ہم اسے ٹکڑوں میں بٹنے نہیں دیں گے ۔

تقسیم کی تلوار سر کٹنا کیسا
جو مال ہمارا ہو وہ بٹنا کیسا
مٹ جائیں گے ہم مرد مجاہد ہیں اگر
کشمیر کے میدان سے ہٹنا کیسا

مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے اور ان سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ کشمیر کو جنت کہا جاتا ہے اور جنت تو مسلمانوں کیلئے ہوتی ہے اس لیے انہیں یہ دولت ملنی چاہئیے ۔

اللہ کی رحمت ہے مسلماں کیلئے
حق یہ ہے کہ یہ دولت ہر مسلماں کیلئے

کہتے ہیں کہ جنت ہے زمین کشمیر

جنت ہے تو جنت ہے مسلماں کےلئے

زیبا مسلمانوں کو اس عزم میں پختہ کرتے ہیں کہ وہ خود دار رہیں گے اور کشمیر کو چھین

لیں گے ۔

تا زیست ، یہ جاگیر نہ بٹنے دیں گے

کچھ ہو، کسی تدبیر نہ بٹنے دیں گے

دعویٰ ہے یہ خود دار مسلمانوں کا

مر جائیں گے کشمیر نہ بٹنے دیں گے

یہ اسلام کی جاگیر ہے جسے ہر قیمت پر سنبھال کر رکھنا ہے ۔ زیبا تلقین کرتے ہیں

کہ اے مرد مجاہد تجھے چوکس رہ کر اس پاک سرزمین کی حفاظت کرنی چاہئے تاکہ دشمن

اپنے حیلوں میں کامیاب نہ ہو سکے ۔

اسلام کی جاگیر نہ جانے پائے

جنت کی یہ تصویر نہ جانے پائے

وقت آگیا اے مرد مجاہد ہشیار

اب ہاتھوں سے کشمیر نہ جانے پائے

اسی طرح ایک رباعی میں زیبا نے اس امید کی کرن چمکتی دکھائی ہے کہ دشمن کی

تمام چالیں ناکام ہو جائیں گی ۔ وہ ہمیں دیکھ کر گھبرا رہا ہے اور بھاگنے کی تیاری میں

ہے ۔ ہم ہی کشمیر کے اصل وارث ہیں ۔

زیبا ناروی کے ہاں رباعیات میں شاعرانہ تعلی کا عنصر بھی موجود ہے ۔ انہیں اپنے موضوعات و مضامین کی انفرادیت و اہمیت پر فخر ہے ۔ انہیں احساس ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعے محفل میں ہنگامہ برپا کر سکتے ہیں ، اور معمولی مضامین میں اپنے دلکش انداز کی بدولت رنگا رنگ پھول کھلا سکتے ہیں ۔

وہ دعوت دیتے ہیں کہ اگر کسی شخص میں اہلیت ہے تو وہ اسے ظاہر کرے ، اور چھپ کر بیٹھنے کی بجائے سامنے آئے ۔ ان کا کوئی حریف جو اپنی شاعری پر ناز کرتا ہے، مقابلہ کرنے کیلئے ان کے ساتھ میدان میں اترے ۔ تاکہ فیصلہ ہو جائے ۔

جب لطف ہے فکر گہر افشاں لائیے
یہ کیا ! کہ پس پردہ رہے بل کھائیے
رکھتا ہو جو قبضے میں کوئی ضرب حریف
میدان ہے خالی ، سر میداں آئیے

زیبا نے اپنی رباعیات میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ عمر خیام بہت بڑا رباعی گو تھا ، لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت بھی جتا رہے ہیں کہ اگرچہ میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میں بھی خیام جیسا ہوں لیکن شاعر ضرور ہوں ۔ میری شاعری الہامی نہیں بلکہ میں اپنے ذاتی احساسات و تاثرات کو شعر کا روپ دیتا ہوں ۔ نہ ہی میں شراب پی کر اس کی لغزشوں میں کھو جاتا ہوں ۔ میں تو صرف اپنے بلند تخیل کی مدد سے واقعات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہوں ۔

ایسے مری تخئیل میں الہام نہیں
لغزش کی اداؤں سے مجھے کام نہیں

ہر کیفیت رندی و مستی کی قسم

شاعر ہوں مگر دعوی خیام نہیں

اگر فن اور اسلوب کے لحاظ سے زیبا ناروی کی رباعیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں روایت کی پاسداری کا انداز بھی ملتا ہے اور ان کے مزاج کی خصوصیات بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ زیبا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا سادہ اور عام فہم انداز ہے ۔ وہ مشکل پسندی کے بجائے آسان زبان استعمال کرتے ہیں ۔ زیبا ناروی کی رباعیات مردف اور غیر مردف دونوں صورتوں میں پائی جاتی ہیں ۔ لیکن پیرایۂ اظہار نہایت لطیف ہے ۔

ان کی رباعیوں میں کہیں کہیں لفظی تصویر کاری بھی ملتی ہے لیکن الفاظ و تراکیب نہایت آسان ہیں ۔ زیبا متحرک تصویروں کے ذریعے جادو جگاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر میدان کربلا کا ایک منظر دیکھئیے ۔

یہ عصر، یہ انداز تصادم دیکھو

اصغر کی نگاہوں کا تکلم دیکھو

اک تیر ترازو ہے گلے میں لیکن

معصوم کے ہونٹوں پہ تبسم دیکھو

رباعی میں اگرچہ چار مصرعوں میں مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے لیکن زیبا ناروی نے بعض رباعیوں پر عنوانات قائم کیے ہیں اور ان کے تحت ایک ہی موضوع سے متعلق کئی رباعیات کہی ہیں ۔ یہ ان کا منفرد تجربہ ہے ۔ معنوی سطح پر زیبا ناروی کی رباعیاں پرتاثیر ہیں ۔ دلکش انداز بیان اور پر خلوص جذبات کی بدولت ان میں گداز اور تاثیر کی کیفیت

پیدا ہو گئی ہے -

زیبا نے رباعیوں میں کہیں ترکیب سازی سے بھی کام لیا ہے بلکہ ترکیب در ترکیب سے کلام میں خوبصورتی پیدا کی ہے - مثلاً روح چمنستان ادب ، کلک پر جبرئیل ، پروردہ دربار ولی ، عرفان طلب ، مانوس نظر ، امواج مضامین ، افکار علائق ، دعوہ یکتائی ، ننگ ادب وغیرہ -

زیبا نے رباعیوں میں خوبصورت تشبیہہ و استعارات کی مدد سے اسلوب کو دلکش بنایا ہے -

ع کھلتا ہوا خوش رنگ کنول اردو ہے

ع دلی میں ہے جمنا کا کنارا اردو

ع ہر آنکھ کا عالم میں ہے تارا اردو

بعض مقامات پر تناسب لفظی سے کام لیتے ہیں -

ع دلی کی یہ ایجاد جہاں گیر ہوئی
چھائی ہوئی ہے نور جہاں اردو

ع دلی نے بنایا ہے اسے شاہ جہاں
تاریخ میں ممتاز محل اردو ہے

اس کے علاوہ ان کی رباعیوں میں مختلف صنعتوں کا بھی بے ساختہ استعمال ہوا ہے - مثلاً صنعت تضاد کا استعمال وغیرہ - (بگڑی ، بنائی) ، (آسان ، دشوار) ، (بلندی پستی) -

تنسیق الصفات کی مثال دیکھئیے ۔

ایثار ، عمل ، صدق ، صفا ، نظم اصول

زیبا کے ہاں رباعیوں میں آہنگ و ترنم کی خصوصیات نمایاں ہیں ۔ انھوں نے تکرار لفظی سے کام لے کر شعروں کے حسن اور موسیقی میں اضافہ کیا ہے ۔

اسلام کی عظمت بنو ، تویر بنو
خود دار بنو، تیغ بنو، تیر بنو
تقدیر بناتی ہے اگر مد نظر
اقبال کے ہر خواب کی تعبیر بنو

اس کے علاوہ کہیں کہیں عربی ، فارسی اسلوب کا بھی اثر ہے ، لیکن بحیثیت مجموعی ان میں سادگی کی خصوصیت غالب درجہ رکھتی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ متنوع اسالیب بیان اور رنگا رنگ مضامین کی وجہ سے زیبا کی رباعیاں رباعی کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر سکتی ہیں ۔

قطعہ :

قطعہ کے لغوی معنی کسی چیز کے " ٹکڑے یا جزو " کے ہیں ، لیکن اصطلاح میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل بیان کیا گیا ہو ۔ قطعے میں ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے گویا قطعے کی ہئیت قصیدے کی ہوتی ہے مگر قطعے میں مطلع نہیں ہوتا ۔ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

" شاعری کی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو ۔ قافیے کی ترتیب میں غزل اور قصیدے سے مشابہ ہو مگر مطلع کی موجودگی ضروری نہیں ۔ البتہ تمام اشعار میں ایک ہی مضمون ادا کیا جانا ضروری ہے" ۔[1]

قطعہ کم از کم دو شعروں کا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے ۔ قطعات کیلئے اوزان کی کوئی قید نہیں ۔ یہ چھوٹی سے چھوٹی اور لمبی سے لمبی بحر میں لکھے جا سکتے ہیں ۔ چونکہ قطعہ کیلئے بحر کی کوئی پابندی نہیں اس لیے قطعہ رباعی کی بحر میں بھی لکھا جا سکتا ہے مگر اس کیلئے ضروری یہ ہے کہ اشعار دو سے زیادہ ہوں ورنہ وہ قطعہ نہیں رہے گا رباعی بن جائے گا ۔

قطعے کے اشعار بے ربط نہیں ہوتے بلکہ تسلسل کے حامل ہوتے ہیں ۔ یہ انفرادی طور پر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔ ان کا کام زنجیر کی مختلف کڑیوں کا سا ہے جو مل کر زنجیر کو

1۔ خواجہ محمد زکریا " اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " مجلس ترقی ادب لاہور ص 317

مکمل کرتی ہیں ۔ قطعے میں سب سے اہم چیز مرکزی خیال ہے اور اسی کے گرد تمام اشعار کہے جاتے ہیں جن کا مقصد اس مرکزی خیال کی وضاحت ہوتا ہے ۔ قطعے کیلئے ابتدا ، وسط اور انتہا میں ربط ضروری ہے ۔ پورا قطعہ پڑھنے کے بعد خیال کی تکمیل ہوتی ہے ۔ بہترین قطعہ وہ ہے جس کا ایک شعر پڑھ کر ہم رک نہ جائیں بلکہ فوراً اگلے اشعار کی طرف متوجہ ہوں ۔ یہ تبھی ممکن ہے جب خیالات مربوط ہوں ، بیان صاف و رواں بلکہ شگفتہ اور برجستہ بھی ہو تاکہ بے کیفی نہ پیدا ہو سکے ۔ خواہ مخواہ کی طول کلامی سے کام نہ لیا جائے اور خیال بھی مکمل ہو ۔

قطعہ کیلئے کوئی موضوع مقرر نہیں ۔ قطعہ نگار ہر طرح کے واقعات و بیانات ، نظریات و خیالات اور احساسات و جذبات کو نظم کر سکتا ہے ، بشرطیکہ پورا قطعہ معنوی اعتبار سے مکمل اکائی ہو ۔

اردو کی دیگر اصناف کی مانند (رباعی کے علاوہ) قطعہ بھی عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں آیا ۔ اس لیے قطعہ نگاری کی روایت کا سراغ لگانے کیلئے عربی کے قدیم ماخذ کو دیکھنا ضروری ہے ۔ عربی شاعری میں قطعہ ایک مستقل صنف کا درجہ رکھتا تھا اور قدیم عرب شاعروں نے قطعات کہے ہیں ۔ عربی شاعری کے تذکروں میں مشہور عربی شاعروں کے قطعات بطور نمونہ موجود ہیں جن میں امراؤ القیس ، زھیر بن ابن سلمی ، نابغہ ، اعشی ، لبید بن ربیعہ ، عمرو بن کلثوم ، طرفہ بن العبد ، حارث بن حلزہ ، کعب بن زھیر اور حسان بن ثابت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

فارسی میں جن شعراء سے قطعات نگاری وابستہ کی جاتی ہے ان میں محمد بن وصیف ، محمود وراق ، شہید بلخی ، فیروز مشرقی اور ابو سلیک گرگانی اہم ہیں ۔ فارسی میں قطعہ نگاری کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عربی کے مقابلے میں یہاں قطعہ نگاری کی روایت مستحکم ہے ۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں فارسی شاعری نے ترقی کی اور فارسی قطعہ نگاروں میں عنصری ، بابا طاہر عریاں ، سنائی ، مسعود سعد سلمان ، انوری ، ظہیری خاقانی ، سعدی شیرازی ، امیر خسرو اور ابن یمین نے اپنے کمالات دکھائے ۔ ان لوگوں نے قطعہ کو بام عروج تک پہنچا دیا اور اخلاقی موضوعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بعض خصوصیات ایسی داخل کر دیں جو اس کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئیں ۔ مثلاً اشعار کی محدود تعداد ، زبان کی سادگی اور برجستگی ، مضامین کی حقیقت و واقعیت وغیرہ انہی شعراء کے قطعات کی بدولت پیدا ہوئیں ۔[1]

فارسی قطعات کی اس روایت سے اردو شاعری نے ایک مدت تک بہت استفادہ کیا اور مضامین و اسالیب میں اس کی پیروی کی مگر دور جدید میں اردو قطعات میں بعض ایسے تجربے ہوئے ہیں جنہوں نے اس روایت میں بہت توسیع کی ہے ۔

اردو شاعری میں جو دکن سے شروع ہوتی ہے، بہت سے قطعات ملتے ہیں ۔ اس دور میں سب سے اہم شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے ، اس نے غزل و دیگر اصناف کے علاوہ قطعات

1۔ خواجہ محمد زکریا ۔ " اردو میں قطعہ نگاری " نذیر حسین ندرت پرنٹرز لاہور 1977ء ، ص 22

کو خاص اہمیت دی ہے ۔ اور ایک ہی موضوع پر کئی کئی قطعے لکھے ہیں ۔ اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ ، غواصی ، ولی کے ہاں بھی قطعات کا سراغ ملتا ہے ۔ شمالی ہند میں حاتم ایک نامور شاعر ہے اور اس کے کلام میں بھی قطعات دکھائی دیتے ہیں ۔ حاتم کے بعد سے اردو غزل کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے جس میں اکثر نامور شعراء مثلاً سودا ، میر ، سوز میر حسن ، مصحفی ، انشا ، رنگین اور جرات نے قطعات کہے ہیں ۔ نظیر اکبر آبادی کو مسلسل گوئی سے خاص لگاؤ اور دلچسپی تھی ۔ اس لیے انہوں نے بھی اچھے قطعات لکھے ۔ حالی نے پہلی بار قطعہ پر خاطر خواہ توجہ دی ۔ ان کے قطعات مضامین کے تنوع کی وجہ سے اردو قطعہ نگاری میں بہت اہم ہیں ۔ اس کے بعد شبلی ، آزاد ، اکبر الہ آبادی ، اسماعیل میرٹھی ، چکبست ، ظفر علیخاں ، اقبال ، جوش ، اختر شیرانی ، احسان دانش ، فیض سیماب اکبر آبادی ، نعیم صدیقی ، احمد ندیم قاسمی ، اختر انصاری دہلوی ، جاں نثار اختر ، انور مسعود اور بہت سے دوسرے شعراء نے سیاسی ، طنزیہ ، رومانی اور مزاحیہ قطعات کہے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

" دور قدیم میں قطعات کی طرف کم توجہ کی گئی تھی ۔ اس کا جدید دور میں ازالہ کیا گیا ۔ طویل و مختصر قطعات میں تکنیک اور مضامین کے لحاظ سے بڑی تبدیلیاں ہوئیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ادب میں حالی ، شبلی ، اقبال ، ظفر علیخاں ، جوش ، احسان دانش ، احمد ندیم قاسمی ، اختر انصاری اور جاں نثار اختر وغیرہ ایسے نام ہیں جو اردو قطعے کو اردو رباعی سے کہیں آگے لے گئے ہیں " ۔1

1۔ خواجہ محمد زکریا ۔ " قدیم اصناف شعر" (نقوش اور سٹیٹ پریس لاہور)۔ ص ۱۱۱

زیبا ناروی نے دوسری اصناف سخن کی طرح صنف قطعہ پر بھی خوب زور قلم آزمایا ہے - ان کے قطعات کئی رسائل میں شامل ہوتے رہے - ان کے علاوہ زیبا کے غیر مطبوعہ قطعات کی تعداد بے شمار ہے جن میں سے راقمہ کو صرف تیس قطعات حاصل ہوئے ہیں- مختلف موضوعات پر کئی کئی قطعوں میں اظہار خیال کیا گیا ہے - لیکن ایک ہی موضوع سے متعلق طویل قطعات بھی ملتے ہیں، اور ان میں طرز اظہار بھی مختلف ہو گیا ہے - یعنی فنی اعتبار سے تنوع زیبا کے قطعات کی خصوصیت ہے -

ہم ذیل میں سب سے پہلے ایسے قطعات کا جائزہ لیتے ہیں جن پر زیبا ناروی نے عنوانات قائم کیے ہیں - مثلاً " صبح پاکستان " کے عنوان سے زیبا کا جو قطعہ ہے اس میں انہوں نے 14 اگست کے دن کو مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم دن قرار دیا ہے - یہ خدا کی خاص عنایت ہے کہ اس نے ان کیلئے ایک پاک وطن قائم کیا - زیبا آج اس مقدس سر زمین پر کھڑے ہو کر سورج کو طلوع ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں جس نے دنیا کی تاریخ پر ایک نام کا اضافہ کیا ہے -

آج کی صبح حسین ہر خاص لطف کردگار
آج کا دن ہر نگاہوں میں نہایت باوقار
آج کی تاریخ ہر ملت کے سینے پر رقم
آج کا سورج ہے پاکستان کا آئینہ دار

اسی طرح سے زیبا نے " قائداعظم " کے زیر عنوان چار قطعات کہے ہیں - پاکستان کا قیام قائداعظم کی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے - زیبا نے قائداعظم کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف اور ان کی کمال بینی کو خراج تحسین پیش کیا ہے - مندرجہ ذیل قطعے میں قائداعظم

کی فراست کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی جنگ مثبت تھی اور تعمیر کا پیش خیمہ تھی ۔ آپ کی زندگی زمانے بھر کیلئے مثالی نمونہ ہے ۔ آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا ہر شخص معترف ہے۔

بیاں کیوں کر نہ ہو ہر سو کمال قائد اعظم
بنے تعمیر تھی جنگ و جدال قائد اعظم
فراست میں متانت میں سیاست میں قیادت میں
زمانہ پا نہیں سکتا مثال قائداعظم

اس عظیم ہستی کا نام پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا ۔ آپ کی ذات میں جلال و جمال کی صفات اپنے عروج پر تھیں ۔ پوری قوم آپ کو دیوتا کی حیثیت میں چاہتی ہے ۔ مسلمانوں کے ایک ایک بچے ، بوڑھے اور جوان کے دل پر ان کا نام نقش ہے ۔ آپ کا کمالِ حسن زمانے پر چڑھتے سورج کی طرح عیاں ہے ۔ صرف یہاں پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں لوگ آپ کی خوبیوں اور ہمت و دلیری کے قائل ہیں ۔

دلوں پر نقش ہے ہر دم خیال قائداعظم
عیاں کس پر نہیں حسن کمال قائداعظم
جسے دیکھو وہ قائل ہو گیا مشرق سے مغرب تک
نگاہوں میں ہے دنیا کی جلال قائد اعظم

علامہ اقبال نے مسلمانوں کیلئے جدا مملکت کا جو خواب دیکھا تھا ، اسے یقین بن کر قائداعظم نے ابھارا ۔ مثل مشہور ہے کہ ہر کمال کو زوال ہے ۔ لیکن اس اصول سے جو چیز مستثنی ہے وہ قائداعظم کا کمال ہے ۔ جو قیامت تک اسی طرح رخشندہ رہے گا ۔

بنا ملت کا پرچم ہر سوال قائداعظم
یقین بن کر ابھر آیا خیال قائد اعظم
مثل ہے " ہر کمالے را ز والے " ہاں مگر زیبا
تنزل پا نہیں سکتا ، کمال قائد اعظم

یہ تجربہ اعتزابیت کا مظہر ہے ۔ اس کی مثالیں اکبر الہ آبادی کے ہاں بھی موجود ہیں لیکن عمومیت اس تجربے کے حصے میں نہیں آئی ۔ قطعے کی ہئیت اختیار کرتے ہوئے ایک سے زیادہ قطعات میں نظم کا تسلسل پیدا کرنا قدرت رکھتا ہے ۔ زیبا کے دو دو شعروں پر مشتمل یہ قطعات اسی ندرت کے مظہر ہیں ۔ بلکہ زیبا نے تو قوافی کے لحاظ سے چاروں قطعوں کو ایک ہی دھاگے میں پرودیا ہے ۔

اس کے علاوہ زیبا نے متفرق موضوعات پر بھی قطعات لکھے ہیں ۔ 1947ء کے بعد سب کچھ لٹا کر پاکستان آنے کے بعد بھی اس زمین کی یاد ان کے دل سے جانے نہیں پائی ۔ چنانچہ جب وہ بہت عرصہ کے بعد ہندوستان میں چمن گنج کانپور کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کیلئے گئے تو انہیں اس کے ذرے ذرے سے اپنائیت کا احساس ہوا ، اور یہ محفل پرانی صحبتوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے ۔ وہ اس شئی سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس کے سینے میں بھی محبت کی چنگاریاں اٹھ رہی ہیں ۔

یک بیک جو بھی ہوئے قہر و ستم بھول گئے
صبح غم بھول گئے ، شام الم بھول گئے

ہم تو پھر آپ کی محفل میں چلے آئے ہیں

آپ بھولے ہیں یا آپ کو ہم بھول گئے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ زیبا کو ان رفقاء کی یاد بھی تڑپا جاتی ہے جو ان محفلوں اور شاعری کی رونق تھے اور اب انہیں ویران چھوڑ کر بہت دور جا چکے ہیں ۔ دل ان کی جدائی میں سلگتا ہے لیکن آنکھیں انہیں دیکھ نہیں سکتیں ۔ صرف ان کی یاد باقی ہے ۔ ان ہستیوں میں احمد سہارنپوری اور مولانا غریب سہارنپوری خصوصی اہمیت کے حامل تھے ۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

شاعران محترم اب وہ کہاں

اب کہاں ایسے ہنر نکتہ داں

یاد احمد ہو کہ ہو یاد غریب

ہم ہیں زیبا اور یاد رفتگاں

زیبا کے ہاں زیادہ تر قطعات نعتیہ اور حضرت امام حسین سے متعلق ہیں ۔ آنحضور کی ذات سے وابستگی ہماری نجات کا باعث ہے ۔ آپ کا دامن تھامنے والے کیلئے جنت کی خوشخبری دی گئی ہے ۔ اس عقیدت کی سچی تصویر اپنے اشعار میں یوں پیش کرتے ہیں ۔

ہم اس دنیا میں اس صورت سے اک اک کام لیتے ہیں

علی کا نام لیتے ہیں ، نبی کا نام لیتے ہیں

محافظ عاز میں ہو گئی ولایت بھی رسالت بھی

وہی ہیں جنتی جو ان کا دامن تھام لیتے ہیں

آپ کا فیضان ہر ایک کیلئے مساوی ہے ۔ آپ کے آنے سے دنیا میں بہاریں آئیں ۔
آپ کی ولادت ایسی مسرت لے کر آئی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کی ہر خوشی ہیچ ہے۔

حضرت امام حسین میں حضرت علی کے جلال کا عکس بھی ہے اور آنحضور کی
رحمت و شفقت کا پرتو بھی ۔ آپ نبی کریم کی نشانی اور ان کے چراغ کی روشنی ہیں ۔
حضرت امام حسین کی شہادت اس امر پر گواہ ہے کہ آپ اللہ کے خاص بندے ہیں اور وہ اپنے
پیارے اور محبوب بندوں کو مشکلات میں ڈال کر ان کا امتحان لیتا ہے ۔ وہ اس امتحان
میں سرخرو ہو کر اپنے رب کے سامنے جاتے ہیں ۔ زیبا نے ان حقائق کا ذکر اس طرح
کیا ہے ۔

جلال مرتضوی ہیں حسین ابن علی
امانت نبوی ہیں حسین ابن علی
ضیائے کوثر و تسنیم ہے لہو میں رواں
چراغ مصطفوی ہیں حسین ابن علی

ایک اور قطعے میں حضرت امام حسین کے مزاج کی صفات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

قدم قدم پہ بڑی دیکھ بھال رکھتے ہیں
حسین ، حسن کرم بے مثال رکھتے ہیں
جری ہیں صابر و شاکر امام ہیں ورنہ
علی کے لال ، علی کا جلال رکھتے ہیں

زیبا ناروی کے هاں ایسے قطعات بھی ملتے هیں جن میں زیادہ تر معاملات حسن و عشق

بیان کیے گئے هیں ۔ انہوں نے عشق و محبت کے جذبات کو بھی خوب بیان کیا هے ۔ محبوب

کی نظر جو مانند تیر عاشق کے دل و جگر میں اتر جاتی هے ، اور اس کی مسکراهٹ دل کو

گرما جاتی هے ۔ نازک محبوب کے عشوہ و غمزہ پہ عشاق اپنا دل نچھاور کر دیتے هیں اور اس

کی اداوں کا جال عشاق کو اپنے گھیرے میں لے لیتا هے ۔ اس کی کیفیت کا بیان دیکھئیے ۔

کسے تیر نظر تڑپا رها هے
تبسم کس کا دل گرما رها هے
کدھر هے دست نازک کا اشارہ
یہ کس پر جال ڈالا جا رها هے

عشق میں وفا کو نبھانا عاشق کی پہلی ذمہ داری هے ۔ محبت میں درپیش ظلم و ستم

سے گھبرانا اور ان پر آہ و فغاں کرنا عاشق کا شیوہ نہیں ۔ وہ هر ستم کو برداشت کرتا چلا جاتا

هے ۔ حتی کہ اسے اپنی جان بھی دینی پڑے تو وہ دریغ نہیں کرتا ، کہ کہیں عشق کی رسوائی

نہ هو ۔

دل و فور غم سے تھراتا هے کیوں
آنسوؤں میں خون دل آتا هے کیوں
اے اسیر عشق و پابند وفا
زندگی سے هاتھ اٹھا جاتا هے کیوں

محبوب کا حسن جو سحر کا سا تاثر رکھتا هے اس کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا

ہے ۔ محبوب کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی حور زمین پر خاکی پیکر میں جلوہ گر ہوئی ہو ۔ ظاہر ہے کہ ایسے نٹ کھٹ محبوب کی اداؤں پر دل بے اختیار ہو جاتا ہے ۔

حسن فسوں طراز کا ارمان کیوں نہ ہو
حیران دیکھ دیکھ کے انسان کیوں نہ ہو
فرش زمیں پہ حور فلک ہے خدا کی شان
دل چلبلی اداؤں پہ قرباں کیوں نہ ہو

عشق کا جذبہ جب عاشق کے دل پر چھا جاتا ہے تو اس کے دل و ذہن پر صرف اور صرف محبوب کا قبضہ ہو جاتا ہے ۔ اس کی تمام سوچیں اور سب خیالات صرف محبوب کی ذات تک محدود ہو جاتے ہیں ۔ اس کی طبیعت ہر چیز سے اچاٹ ہو کر صرف محبوب کی یاد پر مرتکز ہو جاتی ہے ۔ شاعر اپنے عشقیہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس دیوانگی اور پریشان خیالی کی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں ۔

طبیعت کس طرف جا کر اڑی ہے
پریشاں کیوں تخیل کی لڑی ہے
بتا اے محو دنیا ئے تفکر
نظر کس ماہ وش پر جا پڑی ہے

زیبا ناروی کے غیر مطبوعہ کلیات کے دیوان پنجم میں بعض قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ قطعات تاریخ لکھنے کی روایت قدیم ہی سے عربی ، فارسی/اور اردو ، شاعری کا حصہ رہی ہے ۔ عام

طور پر قادر الکلام شعراء نے کتابوں کے سن تصنیف و اشاعت ، اکابر شخصیات کی وفات اور دیگر موقعوں سے متعلق قطعات تاریخ کہتے ہیں ۔ عام طور پر قطعات تاریخ کہتے ہوئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بہت سادہ ہے ۔ اور اس میں قطعہ تاریخ میں شامل متعلقہ مصرعے یا کسی خاص شئے کے حروف کے معینہ اعداد کو جمع کرنے سے مطلوبہ سن نکل آتا ہے ۔ لیکن اس فن میں مہارت کا ثبوت یوں بھی دیا گیا ہے کہ کسی مصرعے کے کل اعداد میں سے کسی خاص لفظ یا ترکیب کے اعداد خارج کرنے سے مطلوبہ سن نکالا گیا ہے ۔ اسی طرح بعض اعداد متعلقہ مصرعے میں جمع کرنے سے بھی مطلوبہ سن نکالنے کی مثالیں ملتی ہیں ۔ اس کے علاوہ بھی تاریخ نکالنے کے متعدد طریقے ہیں ۔

لیکن زیبا ناروی نے قطعات تاریخ میں عام طور سے مستعمل اور نسبتاً سادہ طریقہ کار ہی کو اختیار کیا ہے ۔ ان کے دستیاب قطعات تاریخ الیہ ہیں اور یہ محض تین شخصیات سے متعلق ہیں ۔ ان میں سے نوح ناروی اور حافظ محمد عالم مدیر صحیفہ عالمگیر و خیام کے ساتھ ان کا قریبی ، قلبی تعلق تھا ۔ جبکہ خان لیاقت علی خاں کی حیثیت ان کے نزدیک قومی ہیرو کی تھی ۔ ان تینوں کی وفات پر انہوں نے متعدد قطعات تاریخ کہے ۔ یہ قطعات اردو میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی ۔ ایک آدھ تاریخ انہوں نے ایسی بھی نکالی ہے جو قطعے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ نثر کے جملے کی صورت میں ہے ۔ مثال کے طور پر لیاقت علی خاںؒ کی تاریخ وفات انہوں نے ان جملوں سے بھی نکالی ہے ۔

1- الم افسرا قطعات تاریخ (1951ء)

2- آہ ارسطو فکر شہید ملت[1] (1371ھ)

3- محبوب ملک، اول وزیر اعظم پاکستان (1951ء)

زیبا ناروی نے یہ قطعات پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی شہادت پر کہے ہیں - ان قطعات کے بارے میں زیبا خود لکھتے ہیں :-

" 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں " مسلم لیگ راولپنڈی " کے اہتمام میں جلسہ عام منعقد ہوا - اسی جلسہ میں عزت مآب خان لیاقت علیخان (وزیر اعظم اول) حکومت پاکستان عوام سے خطاب فرمانے کیلئے کراچی سے لاہور تشریف لائے تھے - ابھی آپ نے برادران ملت کا جملہ ادا ہی کیا تھا کہ اچانک آپ پر ریوالور سے حملہ کیا گیا - غدار قاتل کی دو گولیاں پیام آخر بن گئیں - آپ کے آخری جملے یہ تھے کہ " مجھے گولی ماردی گئی ، پاکستان کی حفاظت خدا کرے گا " - ہر جگہ صف ماتم بچھ گئی - جھنڈے سرنگوں کر دیے گئے - بے شمار ضمیمے شائع ہوئے - آئے دن رسائل اور اخبار کے لیاقت نمبر نکلتے رہے - میں نے حسب ذیل تاریخی قطعات لکھے جو اکثر اخبار و رسائل میں شائع ہوئے " -

آن وزیر با لیاقت نیک دل رفت از دنیا سوئی دارالعدم

حیف پاکستان ما بے مایہ شد از در نایاب ، گوہر مغتنم

تفو بر قاتل ! کہ اکبر نام بود کرد قتل باوقار وذی حشم

درجہنم رفت ، مفسد ، برملا داخل خلد بریں شد ، خوش قدم

او، کہ دادش جان بہ تقلید حسین کربلا دید و بدل گفتا " چہ غم "

شد شہید ملک و ملت ، آخراو　　می چکاند خون دل ، از غم قلم

مصرع ہیجم سال غم زیبا زفکر

خون ناحق در محترم شد رقم　　(1951ء)

" دیگر "

لیاقت علی خان سندنشیں　　که از خون خود کرو اول وضو

نماز شہادت ادا کرد ، باز　　بخلد بریں رفت اوشیک خو

" حافظ محمد عالم " کی وفات بھی 1951ء میں ہوئی ۔ ان کی وفات پر زیبا نے

چھ قطعات تاریخ کہے ۔

1۔ جو قصر خاکی سے روح نکلی تو یہ پکاری خدا کی رحمت

بہار ساماں بلندیوں پر بہشت میں ہے رواں حافظ

بخط روشن یہ ایک جملہ بغیر تشویش و غور لکھ دو

برائے لوح مزار زیبا ہے سال رحلت فراق حافظ

13 70ھ

2۔ " دیگر "

دنیا سے گیا وہ بندۂ رب غمگیں ہیں جس کی خاطر سب

کیا اہل طلب ، کیا اہل ادب صف بچھ گئی ہر سو ماتم کی

تاریخ الم برجستہ لکھو یہ سنگ لحد پر اے زیبا

عالم میں عیاں مقصود جہاں تربت ہے محمد عالم کی

19ء　　51

3- " دیگر"

کل شئ ہالک الا اللہ　　دے رہا ہے یہ صدا کوس رحیل

اے مسافر زندگی کے ہوشیار　　زندگی دنیا میں ہے بے حد قلیل

چل دیا وہ حافظ ہر دلعزیز　　مانتے تھے سب جسے بے قال وقیل

ماتمی ہے چک میانہ بھر تمام　　مبتلائے رنج و غم ہے اک قبیل

آہ وہ حامی ادب کا چل بسا　　کہئیے جس کو بے نظیر و بے عدیل

محو خدمت میں رہا پچیس سال　　خادم اردو ادب مرد عقیل

شہرت خیام و عالمگیر ہے　　خدمت اردو کی اک روشن دلیل

با خدا ہستی کی رحلت پر ضرور　　چاہئیے ہجری میں تاریخ جمیل

تربت حافظ برائے زیبا لکھو

یاغنی ، یا احد ، رب جلیل

----
13 70ھ

4- " دیگر"

چل دئیے عالم فانی سے جناب حافظ.چک میانہ میں بپا ہو گیا ہر سو ماتم

سال رحلت کے لیے کہہ و یہ مصرعہ زیبا　　مرکز خلد ہوئی روح محمد عالم

13 70ھ

5- "دیگر در فارسی"

چوں محمد عالم از دنیای آب و گل برفت　　درفضای باغ جنت کرد رخ ، جنت مآب

حافظ

گفت زیبا مصرعہ تاریخ بہر لوح قبر　　بی زبان شد زندگی / ام الکتاب

19 51ء

6- " دیــگــر "

علم بردار اردو کرد رحلت

نمایاں شد بہ ہر جانب صف غم

برای لوح تربت آہ زیــبــا

مزار قالب حافظ ، نو بیسیم

1370 ھ

زیبا ناروی کو اپنے استاد نوح ناروی سے بے حد محبت تھی - وہ انہیں نہ صرف استاد سمجھتے تھے بلکہ گہری عقیدت رکھتے تھے - نوح ناروی کے ساتھ انہیں روحانی تعلق تھا - ان کی موت سے وہ رشتہ ٹوٹ گیا جس سے زیبا کو بے حد صدمہ پہنچا - انہوں نے اپنے دکھ کے اظہار کیلئے نوح ناروی کی یاد میں کئی قطعات لکھے - اس کے ساتھ ساتھ زیبا نے نوح ناروی کا قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا - یہ طویل قطعہ ہے - اس میں زیبا نے نوح کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کا ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری کا رتبہ بلند ٹھہرایا ہے - انہیں اردو زبان و الفاظ پر جو دسترس تھی وہ اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی - وہ نکتہ سنج اور شعر فہم تھے - ان کی طبیعت میں شگفتگی و شفقت جیسی صفات بدرجہ اتم موجود تھیں - ان کے چلے جانے سے بزم سخن ویران ہو کر رہ گئی ہے -

سب ہیں اپنے پرائے محو ملال   مشتاق گزری ہے سب کو رحلت نوح

ناخدائے سخن تھے شاعر خاص   تھی زمانے میں عام شہرت نوح

تھا بلند ان کی شاعری کا مقام   پوچھئیے شاعروں سے رفعت نوح

کہہ گئے یہ امیر و داغ و جلال   ہو گی ضرب المثل فصاحت نوح

جانِ اردو ہے ان کا سادہ کلام | رائیگاں کب ہوئی ہے محنت نوح
دائم اردو زبان ، مثل کنیز | دست بستہ رہی بخدمت نوح
تھے وہی جانشین حضرت داغ | شاعری میں تھی ایسی قسمت نوح
ہائے استاد خوش مزاج و شفیق | یاد آتی ہے مجھ کو شفقت نوح
کون سمجھائے شاعری کے نکات | کس سے حاصل ہو اب ہدایت نوح
تھا عدیم النظیر ان کا مزاج | قابل رشک تھی طبیعت نوح
اب قیامت میں ہو گی دید نصیب | اب میسر کہاں ہے صورت نوح
ناروی کیا جانیے کہ دل ہے اداس | دیکھئیے کس نظر سے تربت نوح

لکھ دو زیبا یہ تم بھی سال وفات

آہ نادر بزرگ حضرت نوح

----

19 62ء

ان قطعات کا جائزہ لے کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ زیبا ناروی کو اس فن میں کمال حاصل نہیں تھا ۔ اسی لیے انھوں نے اس فن کے مختلف طریقوں کو اختیار نہیں کیا ، اور محض سادہ طریقے پر اکتفا کیا ۔ البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ اس فن کی مبادیات سے آگاہ تھے اور بوقت ضرورت قطعہ تاریخ کہہ سکتے تھے ۔ ان قطعات کی حیثیت محض رسمی سی ہے

زیبا ناروی نے اپنے قطعات میں عموماً رباعیوں والا انداز اختیار کیا ہے ۔ ہر قطعہ دو اشعار پر مشتمل ہے ۔ لیکن طویل قطعات بھی ملتے ہیں ۔ ان قطعات میں شاعر نے سادگی کی خصوصیت کو کسی موقع پر نظر انداز نہیں کیا ۔ زبان کی صفائی اور بیان کی دلکشی نمایاں

ہیں ۔ اشعار میں کامل ربط و تسلسل موجود ہے ۔ الفاظ زیادہ تر عام فہم ہیں ۔ کہیں کہیں فارسی و عربی کا کوئی لفظ لاتے ہیں جس سے بیان میں رکاوٹ نہیں آتی بلکہ مفہوم میں وضاحت آ جاتی ہے ۔ زیبا مشکل تراکیب سے قطعات دقیق بنانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ ان کی ترکیبیں آسان اور سادہ ہیں ۔ مثلاً صبح غم ، شام الم ، یاد رفتگاں ، غم فرقت ، غم زدہ ، سرراہ ، تفسیر بوتراب ، خاک شفا ، حسن فیضان محمد ، جلال مرتضوی ، امانت نبوی وغیرہ ۔

زیبا نے ان قطعات میں فنی لوازم یعنی تشبیہہ استعارہ سے بھی کام لیا ہے ۔

ــــہ خاک شفا میں آب جناب حسین ہے

ــــہ فرش زمیں پہ عرش فلک ہے خدا کی شان

شاعر نے صنائع بدائع استعمال کرکے بھی کہیں کہیں عبارت کے حسن و تاثیر میں اضافہ کیا ہے ۔ مثلاً صنعت تضاد کی مثالیں دیکھئیے ۔

ــــہ جلال قائداعظم ، جمال قائداعظم

ــــہ صبح غم بھول گئے ، شام الم بھول گئے

تکرار لفظی سے کام لے کر کلام میں موسیقیت اور ترنم بھی پیدا کیا ہے ۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی نغمگی و موسیقیت ہے اور ان قطعات میں یہ جزو بھی بہت اہمیت رکھتا ہے ۔

ــــہ ہم اس دنیا میں اس صورت سے اک اک کام لیتے ہیں

ــــہ حسن فیضان محمد ہے نمایاں کیا کیا

زیبا کے قطعات میں اندرونی قوافی کو بھی برتا گیا ہے -

ــــہ   علی کے لال ، علی کا جلال رکھتے ہیں

زیبا نے کہیں قافیہ و ردیف دونوں رکھے ہیں اور کہیں صرف قافیے سے کام لیا ہے -
ان کے کلام کی نمایاں خوبی اس کا بے ساختہ پن ہے - ہر مصرعہ دل پر اثر کرتا ہے اور
دلکش محسوس ہوتا ہے - مخصوص طور پر یہ قطعات تاثیر سے بھر پور ہیں -

مرثیہ :

مرثیہ عربی لفظ ھے اور " رثا " سے بنا ھے ۔ جس کے معنی ھیں مرنیوالے کی تعریف و توصیف ۔ گویا مرثیہ ایسی صنف شعر ھے جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اور اس کی تعریف حسرت اور غم کے انداز میں کی جاتی ھے ۔ یہ صنف عربی شاعری میں رائج تھی ۔ عزیزوں اور بزرگ و برگزیدہ ھستیوں کی موت پر رنج و الم کے جذبات سے لبریز جو اشعار کہے جاتے تھے ، انہیں اصطلاحاً " مرثیہ " کہا جاتا تھا ۔

مرثیے کی تین قسمیں بیان کی جاتی ھیں ۔

1۔ رثائے مذھبی

2۔ رثائے قومی و تشریفاتی

3۔ رثائے شخصی و خانوادگی

جہاں تک رثائے مذھبی کا تعلق ھے اس کے ضمن میں اگرچہ بہت سی اکابر مذھبی شخصیات کے مرثیے لکھے گئے ھیں لیکن عام طور سے اردو میں رثائے مذھبی کی ذیل میں ان مرثیوں کو رکھا جاتا ھے جو شہدائے کربلا سے متعلق ھیں ۔[1] قومی اور تشریفاتی مرثیوں میں میں قوم و ملت کے کسی رھنما کی وفات پر اظہار غم کیا جاتا ھے ۔

عام طور پر یہ مرثیے رسمی ھوتے ھیں ۔ شخصی و خانوادگی مرثیوں کا تعلق ان شخصیات سے ھوتا ھے جن سے شاعر کا قریبی تعلق ھو اور ان کی موت نے اسے بری طرح متاثر کیا ھو ۔

1۔ ھم نے چونکہ اس مقالے میں مذھبی شاعری سے متعلق ایک الگ باب قائم کیا ھے ۔ اس لیے رثائے مذھبی کا ارتقائی مطالعہ بھی وھیں کیا گیا ھے ۔ اور یہاں صرف رثائے قومی اور رثائے شخصی پر اکتفا کیا گیا ھے ۔ (مصنفہ)

اردو شاعری میں ایسے مرثیوں کی بھی مثالیں مل جاتی ھیں ۔

رثائے مذھبی میں تاریخی ارتقاء کے بعد ایک ھئیت یعنی مسدس کا التزام دکھائی دیتا ھے لیکن دوسری دونوں قسموں سے متعلق مرثیوں کیلئے کسی مخصوص ھئیت کی پابندی ناگزیر نہیں ٹھہرائی گئی ۔ چنانچہ ایسے مرثیے ھمیں مختلف ھئیتوں میں دکھائی دیتے ھیں ۔ اردو میں شخصی مرثیوں کی پہلی بہترین مثال عارف کا مرثیہ ھے جو مرزا غالب نے لکھا ۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کا لکھا ھوا وہ مرثیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ھے جو انہوں نے مرزا غالب کی وفات پر کہا ۔ اس پر عبدالسلام ندوی کے بقول اردو شاعری جس قدر بھی ناز کرے کم ھے۔ حالی نے چھ اور مرثیے بھی لکھے ۔ اس کے بعد ھمیں کلیات اقبال میں بہت سے شخصی مرثیے ملتے ھیں ۔ جن میں غالب ، داغ اور آرنلڈ سے متعلق رثائی نظمیں شامل ھیں ۔ ان کا شاھکار " والدہ مرحومہ کی یاد میں " ھے ۔ رثائی ادب میں اس کی مستقل حیثیت ھے ۔

بیسویں صدی میں اور بھی بہت سے شاعروں نے اس طرح کے مرثیے لکھے ھیں ، لیکن زیبا ناروی کے مرثیے خاص اھمیت کے حامل ھیں ۔

زیبا ناروی نے بھی اس صنف میں شاعری کی ھے ۔ ان کے ھاں رثائے قومی و مذھبی اور تشریفاتی ورثائے شخصی ملتے ھیں ۔ ان کے مذھبی مرثیوں کی تعداد زیادہ ھے لیکن ھم ذیل میں ان مرثیوں کا جائزہ لیں گے جو قومی یا شخصی مرثیوں میں شمار ھوتے ھیں۔

بعض اوقات مرثیہ کسی ایسی عزیز ھستی کے متعلق ھوتا ھے جس سے انسان کو ذاتی یا خاندانی نسبت ھو ۔ اس کیلئے ضروری ھے کہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ورنہ اس کی حیثیت

رسمی مرثیے کی ہو گی ۔ اردو میں اس نوع کے مرثیوں کی بھی کمی نہیں ۔ کربلائی مرثیوں کیلئے مسدس کی ہئیت پسندیدہ قرار پائی ، لیکن شخصی مرثیوں کیلئے کسی ہئیت کی تخصیص نہیں ۔ غالب نے عارف کا مرثیہ غزل میں ، حالی نے غالب کا مرثیہ ترکیب بند میں اور اقبال نے والدہ کا مرثیہ مثنوی کی ہئیت میں لکھا ۔ چکبست نے شخصی مرثیے مسدس میں لکھے ۔ شخصی مرثیوں میں بھی مرنے والے کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے عقیدت مندانہ خراج پیش کیا جاتا ہے ۔

زیبا ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حساس انسان بھی تھے ۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ غموں ، دکھوں اور محرومیوں میں گزرا ۔ انہیں زندگی میں کئی حادثات سے دوچار ہونا پڑا جن کے اثرات ان کے دل پر مرتسم ہوئے ۔ ان حوادث پر دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے ۔ ایک عام انسان اپنے غموں کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے سے کرتا ہے لیکن وہی آنسو جب شاعر کی آنکھوں میں آتے ہیں تو وہ انہیں الفاظ کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے ۔ بحیثیت مجموعی دل کا درد جب آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ الفاظ میں ڈھلتا ہے تو مرثیے کی تشکیل ہوتی ہے ۔

زیبا ناروی کے مرثیوں میں ایک مرثیہ " نوح ناروی " کا ہے ۔ یہ شخصی مرثیہ ہے اور قطعہ کی ہئیت میں ہے ۔ یہ قطعہ زیبا نے نوح ناروی کی یاد میں لکھا جسے ہم مرثیہ کہہ سکتے ہیں ۔ مرثیے کا اصل موضوع استاد ذی وقار کی وفات پر فطری رنج و غم کا اظہار ہے ۔ شاگرد کو استاد سے جو عقیدت تھی اور استاد کو شاگرد کے ساتھ جتنی الفت تھی اس کے زیر اثر اس مرثیے میں جذبات اور احساسات کی شدت موجود ہے ۔ یہ مرثیہ ایک لحاظ سے نوح

ناروی کی شخصیت کا عکاس بھی ہے ، ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف بھی ہے اور ان کی شفقت و محبت کا قصیدہ بھی ۔ ان کے اخلاق و عادات کی تمام خصوصیات بھی مختصراً اس میں موجود ہیں ۔ نوح ناروی جو لکھنو اور نارہ ہر جگہ یکساں مقبول تھے، ان کی وفات پر ان کے چاہنے والے افسردہ ہو کر رہ گئے ہیں ، ان کے دل تڑپ رہے ہیں ۔ زیبا کے اندر جو غم کا طوفان برپا ہوا ہے اس کے سبب انہیں پوری فضا ماتمی لبادہ اوڑھے نظر آ رہی ہے ۔

چل بسے ناگاہ نوح ناروی
شاعر ذی جاہ نوح ناروی
لکھنو نارہ جہاں آباد سب
کہہ رہے ہیں آہ، نوح ناروی

نوح صاحب سوئے جنت کیا گئے
دل تو دل ہے روح کو تڑپا گئے
کیوں نہ زیبا ہو بپا طوفان غم
ماتمی بادل فضا پر چھا گئے

انسان کتنا ہی صابر و شاکر کیوں نہ ہو، زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ بے اختیار آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ ایسے عالم میں زندگی کے سارے فلسفے ، ساری حکمتیں دکھی دل کے رد عمل کو روکنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں ۔ زندگی سے دل بیزار ہونے لگتا ہے ، اور کچھ خبر نہیں ہوتی کہ یہ عالم کب

تک اسی طرح رہے گا ۔

بن گیا ہر اشک غم دریا کا پاٹ

دیکھئے اب ناؤ کب لگتی ہے گھاٹ

آہ زیبا ہجر نوح ناروی

ہو رہا ہے زندگی سے دل اچاٹ

نوح ناروی کو یاد کرتے ہوئے دور گذشتہ اور اس سے متعلق خیالات و واقعات سلسلہ خیال کا حصہ بن کر یاد آ رہے ہیں ۔ جب وہ انھیں خط لکھ کر ناروی بلاتے تھے ، ان سے وابستہ پرانی باتوں کو یاد کرتے ہوئے زیبا سے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ حسرت آمیز لہجے میں یہ کہہ اٹھتے ہیں ۔

آنسوؤ طوفان وہ بن جاو تم

نوح صاحب کو کہیں سے لاؤ تم

کس کو خط اب دل دھی میری کریں

کون لکھے مجھ کو نارے آؤ تم

نوح ناروی داغ کی زبان و بیان کے جانشین تھے ۔ انھوں نے غزل کے مزاج کے مطابق الفاظ کا وافر ذخیرہ مہیا کر دیا ۔ نوح ناروی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ زبان کو سہل عام فہم اور روزمرہ محاورہ کے مطابق کیا جائے ، اور قلعۂ معلی کی ٹکسالی زبان کی ترویج کی جائے ۔ انھوں نے پاکیزگی زبان کی روایت کو برقرار رکھا ۔ ان کی وفات سے زیبا کو محسوس ہو رہا ہے کہ وہ دولت ختم ہو گئی ہے ۔

داغ کی شان بیاں جاتی رہی

وہ فصاحت بے گماں جاتی رہی

نوح صاحب کیا گئے سوئے عدم

دولت اردو زباں جاتی رہی

جب انسان کسی شدید مصیبت سے دو چار ہو اور مصیبت بھی ناگہاں ہو تو اس کا چین و آرام برباد ہو جاتا ہے ، اس کی آنکھیں خون سے تر ہو جاتی ہیں ۔ نوح کی موت پر زیبا جس کیفیت سے گزر رہے ہیں اس کا بیان دیکھئے۔

نیند کب آتی ہے کب سوتا ہوں میں

آنسوؤں سے اپنا منہ دھوتا ہوں میں

آہ زیبا رحلت استاد نوح

فرط غم میں خون دل روتا ہوں میں

زمانہ قدیم میں اگرچہ طویل مرثیے لکھنے کی روایت تھی ۔ لیکن زیبا نے یہ مرثیہ مختصر لکھا ہے ۔ اس میں کل 24 اشعار ہیں ۔ اس کی بحر کے ارکان یہ ہیں ۔

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

یہ مرثیہ جذبات نگاری اور تاثر کی خوبیوں سے ہمکنار ہے ۔ اپنے موضوع کی مناسبت سے معتدل ، نرم اور دھیما لہجہ رکھتا ہے ۔ جن حصوں میں شاعر نے اپنے ممدوح سے وابستہ یاد رفتہ کو آواز دی ہے وہاں اس کے لہجے میں درد و کرب اور حسرت حرماں کی ایک خاموش لہر محسوس ہوتی ہے ۔ شاعر کے الفاظ نے اس کے جذبات کا پوری طرح ساتھ دیا ہے ۔ الفاظ کے

انتخاب ، تراکیب کی بندش اور مصرعوں کی تراش سے بھی یہ بات آشکارا ہوتی ہے ۔ اس کی زبان سیدھی سادی ہے ۔ حسن بیان کے مختلف ذرائع سے بھی کام لیا گیا ہے۔ تشبیہات ، رعایت لفظی اور محاکات نگاری سے اسلوب کو دلکش بنایا ہے ۔

زیبا ناروی نے دوسرا مرثیہ " ٹیپو سلطان شہید " کی یاد میں لکھا ہے ۔ اس کے بارے میں زیبا خود رقمطراز ہیں ۔

" مئی 1944ء کو " مزدور یونین کانپور " نے کانپور میں ٹیپو سلطان

ڈے منایا جس کیلئے یہ نظم میں نے لکھی اور پڑھی" 1 ۔

یہ مرثیہ قومی مرثیے کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے ۔ اس مرثیے کی ہئیت مسدس ترکیب بند کی ہے ۔ یہ بارہ بندوں پر مشتمل ہے ۔ سلطان فتح علیخاں ٹیپو 4 مئی 1799ء کو میسور میں سرنگا پٹم کے مقام پر اپنے باپ حیدر علی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے میدان جنگ میں شہید ہو گئے تھے ، لیکن ان کا نام ابھی تک زندہ ہے ۔ وہ ان بہادر آدمیوں میں سے ایک تھے جن میں اپنے ملک کے لیے لڑنے کی جرأت تھی ۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور عظیم کمانڈر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے محب وطن اور عظیم جرنیل بھی تھے ۔ 1799ء میں انگریزوں نے میسور پر حملہ کیا اور سرنگا پٹم کے قلعے تک پہنچ گئے ۔ سلطان ٹیپو کے افسروں میں کچھ غدار جن میں میر صادق پیش پیش تھا ، ان سے مل گئے ۔ اس لیے انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا ۔ سلطان کے وفادار

1۔ زیبا کے غیر مطبوعہ کلیات میں " ٹیپو سلطان " کے مرثیے سے پہلے یہ عبارت تحریر ہے ۔

سپاھی بہادری سے لڑے اور یکے بعد دیگرے مارے گئے ۔ سلطان ٹیپو خود لڑتے ھوئے شہید ھوئے ۔ جنگ کے اختتام پر جب ان کی لاش کو ڈھونڈا گیا تو اس کے ھاتھ میں تلوار تھی۔ سلطان ٹیپو پچاس برس تک زندہ رہے ، اور میسور پر سترہ سال حکومت کی ۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں گزرا ۔ ان کے عہد میں میسور ایک رياست ھو گئی ۔ ھندو اور مسلمان دونوں ان سے محبت کرتے تھے ۔ وہ سب کیلئے مہربان ، مشفق اور فیاض تھے۔ عظیم شاعر علامہ محمد اقبال نے انھیں شہید بادشاہ کا نام دیا تھا ۔

زیبا ناروی نے اس مرثیے میں ٹیپو سلطان کی جنگجو صلاحیتوں ، ایک سپاھی کے روپ میں ان کے عزم و حوصلہ اور ایک عظیم قائد اور ایک سچے مسلم اور محب وطن کی حیثیت سے ان کے پر خلوص جذبوں کو بیان کیا ھے ۔ آخر میں اس حقیقت کی نشاندھی کی ھے کہ اگر انسان اپنے مرتبہ و منصب کا شعور حاصل کر لے تو پھر اس میں وہ پختگی اور مضبوطی پیدا ھو جائے گی جو اسے ھر مشکل و مصیبت کا سامنا کرنے اور اسے برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی ھے ، لیکن زیبا کے نزدیک انسان کو اپنے عمل و کردار کے ذریعے خود کو اس منصب کا اھل ثابت کرنا ھو گا ۔

ٹیپو سلطان ساری زندگی دین و ملت کی سر بلندی کیلئے کوشاں رہے ۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک سپاھی کا سرمایہ ھوتی ھیں ۔ انھوں نے جس طرح اپنے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ، اس پر میسور کی سر زمین آج تک نازاں ھے ۔ وہ ایسا مجاھد تھا جس کی شجاعت کا لوھا اس کے دشمن بھی مانتے تھے ۔ زیبا نے اس مرثیے کے آغاز میں سلطان ٹیپو کے انھی اوصاف کی طرف اشارہ کیا ھے ۔

وہ کہ جس کے دست و بازو دین پناہی کیلئے وہ کہ جس کا فرق موزوں تاج شاہی کیلئے

وہ کہ ہمت جس کی لازم اک سپاہی کیلئے وہ کہ جو اٹھا وطن کی خیر خواہی کیلئے

توڑ ڈالی جس نے گردن ایک اک مغرور کی

آج تک نازاں ہے جس پر سرزمین میسور کی

ایسے اہل ہمت اور دلیر رہنما مدتوں بعد جنم لیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ہر نظر اسے ڈھونڈ رہی ہے، ہر آنکھ اس کے غم میں اشکبار ہے - ملک کی تاریخ اس کے لہو سے سرخ ہو گی ہے لیکن وہ جو ہر خاک میں گم ہو گیا ہے - دنیا کے تاج پر وہ حسین و چمکدار موتی تھا جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مدھم ہو چکا ہے -

ایسے غازی کو زمانہ عمر بھر رویا کرے ہر نظر ڈھونڈا کرے ہر چشم تر رویا کرے

کارزار ملک و ملت سر بسر رویا کرے قوم کی تاریخ غم خون جگر رویا کرے

خاک و خوں میں ہو چکا گم جوہر مردانگی

تاج ہستی میں کہاں وہ گوہر مردانگی

وہ اپنے زور بازو سے جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا تھا - اس نے مرہٹوں کا نام و نشان تک مٹا دیا - بڑے بڑے پہاڑ اس کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو گئے اور میسور کی داستانیں اس کے کارناموں نے رقم کی ہیں - اس نے ملک کی خاطر، اس کی آن پر جان قربان کر دی - اس کی رفعت و عظمت اور شان و شوکت کی گواہی آسمان کے ستارے اور بلند پہاڑ دے رہے ہیں - اس کے دشمن بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ اب وہ جری جواں اس دنیا میں موجود نہیں رہا -

زور بازو سے لڑائی جیتنے والا کہاں وہ کہاں جس سے مرہٹوں کا مٹا نام و نشان

پارہ پارہ جس کی ہیبت سے ہوئے کوہ گراں کارنامے جس کے میسور و پشم کی داستاں

مرد میداں بن کے جو کھیلا ہمیشہ جان پر

جان دے دی اپنے استقلال اپنی آن پر

وہ لوگ جنہوں نے دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنوں سے غداری کی ہے وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہیں ۔ ساری قوم ان پر لعنت بھیج رہی ہے ۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انہوں نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے ۔ اس داغ سے ہندوستان کی زمین سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی ۔

آگے چل کر زیبا/ ضیا اس ویرانی اور اجاڑ پن کی عکاسی کی ہے جو ٹیپو سلطان کی موت سے ظاہر ہوا ہے ۔ بتاتے ہیں کہ محفل ویران ہو گئی ہے، سب کچھ اسی طرح ہے مگر وہ ساقی نہیں رہا ۔ اس کے چلے جانے سے عالم تاریکی میں ڈوب گیا ہے ۔

سر اٹھائے کس طرح ہندوستاں کی سرزمیں داغ ناکامی سے آلودہ ہوئی لوح جبیں

بادہ نوشی کی فضا رہنے لگی اندوہ گیں اب بھی ہے محفل مگر محفل میں وہ ساقی نہیں

کر گیا عالم کو تاریک انقلاب زندگی

ظلمت مغرب میں ڈوبا آفتاب زندگی

اس کے شہید ہونے پر ہر طرف سوگواری کی فضا چھائی ہوئی ہے ۔ جگہ جگہ ماتم ہو رہا ہے ۔ ایسا ظلم ہوا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے ۔ سلطان ٹیپو کا مزار اس حسرت کو ظاہر کر رہا ہے ۔

اس شہید ملک کا ماتم رہے گا جابجا   ہر کسی کو یاد ہے اک ایک ستم اک اک جفا

خون ناحق یہ ہے وہ جس کا نہیں کچھ خوں بہا   اب تلافی اس کی کیا جو فتنہ کاری نے کیا

مٹنے والا مٹ گیا ، تو کیا لحد کیسا مزار

کہہ رہا ہے اب بھی یہ سلطان ٹیپو کا مزار

یہاں پہنچ کر زیبا کے جذبات میں تبدیلی آئی ہے اور اس اتار چڑھاو کا سامان پیدا ہوا ہے ۔ اب وہ قوم کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انہیں اپنے اندر زندگی کی قوت بیدار کرنی چاہئیے ۔ انہیں اس انجمن میں شمع بن کر رہنا ہے ۔ مگر خلوص عمل اور پختگی کردار کیلئے چند خصوصیات کی ضرورت ہے ۔ اگر وہ پا لیں تو اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر کر سکیں گے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کا ہر عمل ، ہر قول حق کا پیغامبر ہو ۔ ان کے دل کے ساز سے سچائی کا نغمہ پھوٹے ۔

اے وطن کے نوجوانو زندگی پیدا کرو   انجمن میں شمع بن کر روشنی پیدا کرو

کون کہتا ہے کہ بے جا برہمی پیدا کرو   برہمی کیا ہے، مناسب آشتی پیدا کرو

ہاں مگر جنبش میں لب کی ہو صدائے ساز حق

حق تو یہ ہے دل سے نکلے ہر گھڑی آواز حــــق

مرثیے کے آخر میں یہ کہتے ہیں کہ اگر تم مزدور ہو تو بھی زندگی کی شکستہ تقدیر بن سکتے ہو ۔ کسی بھی منزل کو پانے کیلئے خون جگر سے کام لینا پڑتا ہے ۔ تمہیں اپنے تنہا ہونے کا کوئی غم نہیں کرنا چاہئیے ۔ تمہارا سب سے بڑا ہتھیار اور ساتھی تمہاری زندگی

ہے جس کے ذریعے تم ہر مشکل اور برائی کو اپنے راستے سے ہٹا سکتے ہو ۔ حق کیلئے اگر قربانی بھی دینا پڑے تو کوئی پروا نہیں ۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ضرور ملتی ہے ۔ مرد غازی کیلئے سیم وزر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ۔ وہ تو خدا کا محبوب بندہ ہوتا ہے اور اسی کی محبت اور قرب کیلئے ملک و ملت سے وفا کرتا ہے ۔

حق کی مزدوری میں جو نکلا پسینہ فرق پر خلق میں کہلائے گا وہ خون دل خون جگر
تشنہ کامی کی دوا ہے تلخی کلفت اثــر مرد غازی کو نہیں کچھ احتیاج سیم و زر

ہو عمل پیرا تو اے زیبا یہی دستور ہــے
بادشاہ وقت ، ملک وقوم کا مزدور ہــے

فنی لحاظ سے اس مرثیے میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ فکری لہجہ بھی دکھائی دیتا ہے ۔ زیبا نے ایک خوبصورت پیرایہ بیان میں سلطان ٹیپو کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور آخر میں زندگی گــزارنے کے چند رہنما اصول بھی وضع کیے ہیں ۔ یہ بھی بتایا ہے کہ مخلص بادشاہ ملک و قوم کا خیر خواہ ہوتا ہے اور اُن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہــے ۔

اس مرثیے میں مصرعوں کی مناسب ترتیب سے موسیقیت اور نغمگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے ۔ کہیں کہیں تکرار لفظی سے کام لے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ ان کے علاوہ خوبصورت تشبیہات و استعارات کو اس مرثیے میں نمایاں جگہ دی گئی ہے ۔ تراکیب بھی عمدہ استعمال کی گئی ہیں ۔ بحیثیت مجموعی جذبات نگاری بھی ہے ، فلسفہ بھی ۔ عمل اور نصیحت کا رنگ بھی ۔ الفاظ بڑے خوبصورت اور فصیح استعمال کیے گئے ہیں ۔

ان مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زیبا نے اردو مرثیے کا بھرپور مطالعہ کیا تھا ۔ اور وہ اس کا گہرا علم رکھتے تھے ۔ زیبا ناروی نے روایتی انداز میں شاعری کی ہے ۔ یہاں بھی ان کا انفرادی غم روایت کے پر تاثیر رنگ میں ڈھل گیا ہے ۔ انہوں نے اپنی مہارت کا جادو مذہبی مرثیوں میں جگایا ہے ۔ شخصی مرثیوں میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی ۔

مثنوی :

مثنوی عربی کا لفظ ہے اور " اثنی " اور " مثنی " سے مشتق ہے ۔ اس کا مفہوم دو دو یا زوج وغیرہ ہے جو اس کی ہئیت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اصطلاحاً اس سے مراد وہ مسلسل نظم ہے جس کے ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوں ۔ مثنوی میں ہر طرح کے خیالات ، واقعات اور مطالب ادا ہوتے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ بہت وسیع ، بڑی مفید اور بقول حالی بڑی بکارآمد بڑی مفید صنف شعر ہے ۔ خصوصاً واقعہ نگاری کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہے ۔ اخلاقی ، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر مثنویاں لکھی گئی ہیں ۔ مثنویوں میں قدرتی منظر، معاشرتی رسوم و رواج ، انسانی جذبات و احساسات وغیرہ کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں ۔

مثنوی میں قصیدے یا غزل کی طرح شروع سے آخر تک قافیے یا ردیف کی پابندی نہیں ہوتی۔ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہوتی۔ فارسی میں سینکڑوں اور ہزاروں اشعار کی مثنویاں ملتی ہیں ۔ مثنوی عموماً چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہے ۔ نظامی گنجوی نے پانچ مثنویاں پانچ مختلف اوزان میں کہی ہیں ۔ امیر خسرو نے تین اوزان کا اضافہ کیا ۔ پرانی مثنویوں میں ان مقررہ اوزان کی پابندی کی گئی ہے مگر مروجہ اور مقررہ اوزان کے علاوہ دوسرے وزن میں بھی مثنوی نگاری کی مثالیں مل جاتی ہیں ۔ مثلاً حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام ۔ روایتی قصوں پر مبنی مثنویوں میں مضامین کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے ۔ پہلے حمد و نعت و منقبت ، پھر بادشاہ کی تعریف ، اس کے بعد وجہ تالیف اور

اس کے بعد اصل قصہ یا داستان شروع ہوتی ہے ۔

اردو شاعری میں مثنوی کی دوہری حیثیت ہے ۔ ایک طرف تو یہ ایک مکمل اور مقبول عام صنف ہے اور اپنے مخصوص موضوعات ، مزاج اور مخصوص ہئیت کی بنا پر شناخت کی جاتی ہے ۔ دوسری طرف یہ ایک ایسی ہئیت بھی ہے جسے دوسری کسی صنف مثلاً نظم کیلئے اختیار کیا جاسکتا ہے ۔

اردو مثنوی کا مزاج کسی حد تک داستان عشق کا بیان ہے ۔ اس صنف میں داستان اور عشق کی آمیزش سے واقعہ اور جذبہ ہم آمیز ہو جاتے ہیں ۔ اور داخلیت اور خارجیت کی دوئی مٹ جاتی ہے ۔ اس بنا پر اس کی مختصر ترین تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ مثنوی ایک طرح کی منظوم عشقیہ داستان ہوتی ہے ۔ اپنی اس قوت کی وجہ سے یہ صنف بیانیہ شاعری کی معراج تصور کی جاتی ہے ۔ مثنوی کو داستان عشق کے علاوہ دیگر موضوعات کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا موضوع ہمہ گیر اور لا محدود ہے ۔

عربی میں مثنوی کا وجود نہ تھا ۔ یہ فارسی شعراء کی جدت طبع کا کرشمہ ہے ۔ نظامی ، فردوسی مولانا روم ، سعدی ، خسرو وغیرہ معروف فارسی مثنوی نگار ہیں ۔ مثنوی اردو اصناف شعر میں قدیم ترین ہے ۔ دکنی دور میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں ، جن میں رستمی کی خاور نامہ ، نصرتی کی گلشن عشق ، سراج کی بوستان خیال ، ملاوجہی کی قطب مشتری اور محمود بحری کی من لگن مشہور ہیں ۔ محمد قلی قطب شاہ ، غواصی اور شاطی کی مثنویات بھی اہم ہیں ۔ بعد کے دور میں قابل ذکر مثنوی نگاروں میں میر اثر ، میر تقی میر ، میر حسن جرات اور مومن ، دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق شامل ہیں ۔

میر حسن کی " سحرالبیان " ایک بلند پایہ اور معیاری مثنوی ہے ۔ اس کی بحر رواں اور شگفتہ ہے ۔ داخلی احساسات کے ساتھ خارجی زندگی کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے ۔ مصوری اور منظر نگاری کے فطری اور لاجواب نمونے ملتے ہیں ۔ میر حسن نے مثنوی کے ذریعے ایک خاص دور اور اس کی تہذیب و ثقافت کو زندہ جاوید بنا دیا ۔ زبان سادہ اور سلیس ہے ۔

سحرالبیان کے بعد مقبولیت اور معیار کے لحاظ سے دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" کا نام آتا ہے ۔ اختصار و ایجاز اس کا سب سے بڑا وصف ہے ۔ اس پر دبستان لکھنؤ کا رنگ غالب ہے ۔ نسیم نے آرائش لفظی کا بڑا اہتمام کیا ہے ۔ اس میں مصوری ، نازک خیالی اور بندش الفاظ کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ۔ مومن کی مثنوی " جہاد " بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ نواب مرزا شوق نے " فریب عشق " ، " بہار عشق " اور " زہر عشق " کے نام سے مثنویاں لکھیں ۔ " زہر عشق " زبان کی سادگی ، طرز ادا کی بے ساختگی ، محاورات کی برجستگی ، سوز و گداز اور تاثیر کے اعتبار سے ایک عمدہ مثنوی ہے ۔

محسن کاکوروی کی نعتیہ مثنویوں میں " صبح تجلّی " ، " چراغ کعبہ " اور " شفاعت نجات " دلچسپ اور پر تاثیر ہیں ۔ تسلیم ، امیر مینائی ، داغ اور شوق قدوائی نے بھی متعدد مثنویاں لکھیں ۔

حالی نے شاعری میں اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تو اس سے مثنوی میں تنوع اور نکھار پیدا ہوا ۔ انہوں نے اور ان کے معاصرین میں آزاد اور اکبر نے موضوعاتی نظموں کیلئے خاص طور سے مثنوی کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ دور جدید میں حفیظ جالندھری کا " شاہ نامہ اسلام " ایک

اچھی مثنوی ھے ۔ علامہ اقبال کی مثنوی " ساقی نامہ " حقائق و معارف کا ایک بحر زخار ھے، انھوں نے ایک وسیع و عریض سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ھے ۔ جوش ، روانی اور بے ساختگی میں " ساقی نامہ " اپنی مثال آپ ھے ۔ بعد کے دور میں بھی مثنویوں کی مثالیں مل جاتی ھیں لیکن عصر حاضر میں اس صنف کی طرف توجہ نہیں دی جا رھی ۔

قدیم زمانے میں بالعموم منظوم قصوں کیلئے طویل مثنویاں لکھی جاتی تھیں ۔ لیکن ھندوستان میں انگریزوں کے ظہور کے ساتھ ھی شعر و ادب میں انقلاب آ گیا جس نے مثنوی نگاری کو بھی متاثر کیا ۔ اس دور میں مثنوی نگاری کی صورت بدل گئی ۔ پہلے مثنوی کو صرف داستان عشق و محبت کے بیان تک محدود سمجھا جاتا تھا ، بعد کے ادوار میں اس صنف کو دیگر موضوعات کیلئے بھی استعمال کیا گیا ۔ آزاد اور حالی نے مثنوی کے اسلوب میں بعض موضوعاتی نظمیں لکھیں ۔ علامہ اقبال نے مثنوی میں فلسفیانہ، اخلاقی اور سیاسی و تعمیری مضامین کو داخل کیا ۔ جدید دور میں خاص کر " انجمن پنجاب " کے تحت مثنوی نگاری کا انداز تبدیل ھوا اور مثنوی نے طویل اور مختصر نظموں کی صورت اختیار کر لی ۔ زیبا کے ھاں اوسط درجے کی ضخامت کی مثنویاں ملتی ھیں جن میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ھے ۔

زیبا ناروی کی دستیاب مثنویاں تعداد میں دس ھیں ۔ جن کے نام یہ ھیں ۔ " مسلم خوابیدہ سے خطاب " ، سیاست کے نشیب و فراز، عید قرباں ، مہاجر ھوں ، شکوہ بعد شکوہ ، بیکاری ، رخصتی ، ھم ، خطاب ۔ جبکہ ایک مثنوی بغیر عنوان کے ھے ۔ ذیل میں ھم ان مثنویوں کا الگ الگ جائزہ لیں گے ۔

" مسلم خوابیدہ سے خطاب " 7 دسمبر 1947ء کو لکھی گئی اور روزنامہ " مسلم لاھور"

میں شائع ہوئی ۔ اس مثنوی میں زیبا نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا موازنہ قرون اولی کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے ۔ مختلف مثالیں دیتے ہوئے ماضی کا آئینہ ان کے سامنے رکھا ہے اور آخر میں قوم کے جذبات کو بیدار کرنے کیلئے ان مظالم کا ذکر کرتے ہیں ، جو اس دور میں مسلمانوں پر روا رکھے جا رہے تھے ، اور مذہب و دین کی حفاظت کا فریضہ ادا کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔

زیبا کی نظر میں انسانیت کا مستقبل مسلمان سے وابستہ ہے ۔ ان کے نزدیک مسلمان کی پہچان عمل و کردار سے ہوتی ہے ۔ مسلمان ان چیزوں کو نظر انداز کر چکے ہیں ۔ جس نے زیبا کو دکھ ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اے قوم تیری بیداری کیا ہو گئی ۔ وہ حمیت خواب غفلت میں کیوں سوئی ہوئی ہے ۔ جوش ، همت مردانگی جو تیرے نمایاں جوہر تھے ، مفقود ہو چکے ، تیری شمشیر جوہر دار کو زنگ لگ گیا ہے اور یہ سب اس وجہ سے ہوا ہے کہ تو نے اپنے اجداد کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت کے مقابلے میں تجھ میں تضاد آ گیا ہے ۔ تو یہ بھول گیا ہے کہ تو ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے اور تیرے بزرگوں میں بڑی خوبیاں تھیں ۔ افسوس کہ تجھ میں وہ نظر نہیں آتیں ۔ پہلے مسلمانوں نے اپنے قدموں سے کفر کو روند ڈالا تھا جبکہ آج تو خود کفر کے ہاتھوں پامال ہو رہا ہے ۔ ان کی ہیبت سے بڑے بڑے شہنشاہ کانپتے تھے ۔ انہوں نے ایران جیسی عظیم سلطنت کو بھی مسخر کر لیا تھا ۔ وہ لوگ جو پہلے مغلوب تھے اب تجھ پر حکمراں ہو رہے ہیں ۔ وہ جن کے جلووں سے پوری دنیا میں چراغاں تھا آج ان کی اپنی انجمن ہی تاریکیوں میں ڈوب چکی ہے ۔ شاعر نے دور حاضر کے مسلمانوں کو آئینہ دکھانے کے بعد یہ سوال کیا ہے

کہ تو اپنی منزل سے بھٹک کر کدھر جا رہا ہے ۔ تجھے اس خواب سے نکل آنا چاہئیے۔

کل ترے قدموں نے روندا تھا جہان کفر کو   آج تیری زندگی بھی کفر سے پامال ہو

کل تری ہیبت سے دنیا لرزہ براندام تھی   آج مغلوبوں نے تجھ سے ٹھان لی ہے دشمنی

کل ترے جلووں کی آرائش سے روشن تھا جہاں   آج تیری انجمن ہے اور ہیں تاریکیاں

کس طرف رخ ہے ترا منزل کا رستہ چھوڑ کر   ہوش میں آ یہ طلسم خواب غفلت توڑ کر

قرون اولی کے مسلمانوں کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ آج تیرا قافلہ برباد ہو گیا ہے ۔ ہندوستان میں تجھ پر مسلسل ظلم وستم کیے جا رہے ہیں، اور ہر منزل پر لوٹا جا رہا ہے ۔ اس صورتحال میں تجھے بھی چپ چاپ نہیں بیٹھ رہنا چاہئیے ۔ اپنی حالت پر غور کر کہ تو کیوں خوار کیا جا رہا ہے ۔ اگر تو اسپین کی تاریخ سے واقف ہے تو جان لے کہ اب کیا ترمیم ہو چکی ہے ۔

آخر میں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ہندوستان میں مذہبی آزادی نہیں ، ہر طرف سے بربادیاں تیرا گھیراو کر رہی ہیں ۔ پاکستان بننے پر کس قدر نقصانات پہنچائے گئے ، تیرے پیارے تجھ سے بچھڑ گئے ۔ صرف ایک حرم جواب تجھے ملا ہے ، اس کا تحفظ تیرا فرض ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس پر بھی دشمن نگاہیں جمائے کھڑا ہے ۔ لیکن تجھے اپنے ایمان کی مضبوطی ظاہر کرنے کیلئے اس کی بقاکے لیے جان کی بازی لگا دینا ہو گی ۔ کیا تو اپنے ایمان کی دولت کو یوں ضائع ہونے دے گا ۔ اگر نہیں تو پھر احساس و جذبے سے عاری کیوں ہو گیا ہے ۔ نمود و نمائش کو چھوڑ کر اپنے اولین فرائض کی طرف توجہ دے اور اسلام کی حفاظت اور عظمت کیلئے مصروف کار ہو جا ۔

وہ حرم جس کا تحفظ تیرا دینی راز ہے　　آہ اس پر بھی نگاہ غیر، دست انداز ہے

کیا مٹے گی اس طرح دولت تری ایمان کی　　کیا تجھے منظور ہے بے حرمتی قرآن کی

کھوئے بیٹھا ہے کہاں تو اپنے احساسات کو　　ٹھیس کیوں لگتی نہیں اب بھی ترے جذبات کو

ختم کر ہنگامہ آرائی نمود و نام کی

تیرا اول فرض یہ ہے لاج رکھ اسلام کی

سترہ اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں زیبا نے براہ راست تخاطب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ نظم ان حالات میں لکھی گئی جب مسلم قوم غفلت کا شکار ہو رہی تھی ۔ اس لیے وہ ان میں ولولہ اور گرم جوشی پیدا کرنے کیلئے امت مسلمہ کے اسلاف کا ذکر کرتے ہیں اور یہاں ان کا انداز بیان تجزیاتی ہو جاتا ہے ۔ اس نظم میں قومی و ملّی شاعری کا وہی انداز پایا جاتا ہے جو مولانا حالی کی مشہور مسدس " مد و جزر اسلام " کی پہچان ہے ۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے زیبا کے اشعار سے سوز و گداز اور درد مندی ٹپکتی ہے ۔ کبھی ان کا لہجہ بہت پر جوش ہو جاتا ہے اور کبھی اس میں نرمی بھی آ جاتی ہے ۔

" خطاب " بھی اسی قسم کی مثنوی ہے ۔ اس میں 26 اشعار ہیں ۔ زیبا مسلمان نوجوان سے بیدار ہونے کیلئے کہہ رہے ہیں ۔ ان کی خواہش ہے کہ نوجوان اسلام کی سربلندی کے لیے مصروف کار ہو جائیں ۔ وہ غفلت میں بہت کچھ کھونے کے بعد اب نصیحت پکڑے اور زندگی کے کارواں میں شریک ہو جائے ۔ تاکہ وہ اپنے بزرگوں کی تاریخ دھرا سکے ۔ وہی جنہوں نے سرکشوں کو تباہ کیا اور قیصر و کسری کو اپنا غلام بنایا ۔

فتوحات زمانہ روند کر تجھ کو گزرتا ہے　　تجھے پھر نقش ثانی بن کے عالم میں ابھرنا ہے

تجھے تاریخ دہرانی ہے پھر اگلے زمانے کی　　ملا دے اس فسانے سے کڑی اپنے فسانے کی

وہی ہے تو کہ تو نے سرکشوں کے بڑھ کے سر توڑے　　وہی ہے تو کہ تو نے قیصر و کسری کے منہ موڑے

شاعر چاہتا ہے کہ ہمیں حضرت علی کے رہنما اصولوں کو مد نظر رکھ کے اس نظام کو بدل دینا چاہئیے ۔ تاکہ دنیا سے ظلم و بربریت کا نام و نشاں تک مٹ جائے ۔ یہاں زیبا مختلف بادشاہوں، قدیم سپہ سالاروں اور مسلم جرنیلوں کی مثالیں دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئیے ۔ وہ زمانہ پھر پلٹ آئے اور مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں ۔ بابر جیسے طوفاں خیز جذبات ابھر آئیں اور ہمایوں کے مقدر جیسے کرشمے نظر آئیں ۔ جہانگیر اور اکبر کا سا عدل و انصاف پھر نمایاں ہو ۔ شاہ جہاں کی طرح حکومت کریں اور ایک نہ مٹنے والا نشاں ہو کر تقدیر کا ستارا بن جائیں ۔

کچھ اس صورت سے پھر زیر نظر تنظیم عالم ہو　　کہ ہر مرد مجاہد اک صلاح الدین اعظم ہو

نظر آنے لگے اک اک میں استقلال محمودی　　چمک اٹھے دوبارہ نیر اقبال محمودی

شہاب الدین غوری کا زمانہ پھر پلٹ آئے　　مسلمانوں کی دنیا اپنے مرکز پر سمٹ آئے

ذرا آئین اکبر کی تجلی پھر ہویدا ہو　　پھر ایسا تجھ میں کوئی تاجور اک بار پیدا ہو

اسی صورت سے پھر درکار ہے شکل جہانگیری　　نگاہیں ڈھونڈتی ہیں آج پھر عدل جہانگیری

قدم اپنے جما لیتے ہیں پھر شاہ جہاں ہو کر　　خط تقدیر بن جاتا ہے اک ان مٹ نشاں ہو کر

آخر میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں کہ ان تمام باتوں سے مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس خواب کی تعبیر بن جائیں اور اس کے نتیجے میں ان کا اشارہ دنیا بھر کی شان ہو جائے ۔

غرض یہ ھے کہ تو وہ خواب کی تعبیر ھو جائے

ترا اک اک اشارہ شان عالمگیر ھو جائے

زیبا ناروی کی ایک اور مثنوی " بیکاری " ھے جو روز نامہ " پنچ " دھلی میں شائع ھوئی ۔ اس نظم میں شاعر نے جدید دور میں بڑھتی ھوئی بیکاری کے مسئلے پر تشویش کا اظہار کیا ھے ۔ دور حاضر میں روز گار کا مسئلہ بہت اھمیت اختیار کر گیا ھے ۔ اس زمانے میں ھر فرد اس غم سے دو چار ھے ۔ نظم کے آغاز میں بتاتے ھیں کہ آج کل کسی کو دوسرے کی خبر نہیں ، لوگ ایک دوسرے کے غم میں شریک نہیں ھوتے ۔ اھل دولت کی امارت اور حکمران کے اختیارات فضول ھیں ۔ پورے ملک میں یہ وبا اس قدر پھیلی ھوئی ھے کہ لاکھوں نوجوان بیکار پھرتے نظر آتے ھیں ۔ وہ بے کسی اور بیچارگی کا لبادہ اوڑھے اپنی تعلیمی اسناد لیے نوکریوں کی تلاش میں مصروف ھیں ۔ بوڑھے والدین جو اپنے بیٹوں کو ساری زندگی محنت کرکے پڑھاتے رھے، اب ان کی بیکاری پر پریشاں حال ھیں ۔ ان کے فاقے دیکھ کر ایک حساس انسان کے دل سے آھیں نکلتی ھیں ۔ کوئی روز گار کے نہ ھونے پر خون کے آنسو روتا ھے ۔ اسکا ذکر اس طرح کرتے ھیں ۔

ھاں مگر کوئی نہیں ھے آج بے فکر معاش ۔۔۔ دیکھ کر فاقے سبھوں کے دل ھوا ھے پاش پاش

کوئی کہتا ھے کہ پوچھو کچھ مرا حال زبوں ۔۔۔ اپنی بیکاری پہ روتا رھتا ھوں میں اشک خوں

الغرض چرچے یہی آٹھوں پہر ھیں جابجا ۔۔۔ ھر طرف سے آتی ھے بے روز گاری کی صدا

نظم کے اختتام پر ذمہ دار افراد اور ارباب اختیار کی توجہ اس مسئلے کی طرف دلاتے ھوئے کہتے ھیں کہ کچھ خبر ان آشفتہ حال نوجوانوں کی بھی رکھ لو ۔ ورنہ اس کا نتیجہ

بھی ہو گا کہ یہ فارغ لوگ کچھ نہ کچھ کر گزریں گے ۔ آخری شعر میں یہ سبق دیتے ہیں کہ اس طرح زندگی گزارنا بہت دشوار ہے ۔ آدمی بیکار ہو تو اس کی زندگی کے بھی کوئی معنی نہیں ۔

جینا اس صورت سے اے زیبا بہت دشوار ہے

آدمی بیکار ہے تو زندگی بے کار ہے

زیبا نے ایک نظم بغیر عنوان کے اپنے بھتیجوں شکیل اور شگفتہ کی روزہ کشائی کے موقعہ پر لکھی تھی ۔ یہ مثنوی کی ہئیت میں ہے اور اس کے اشعار کی تعداد تیرہ ہے۔ اس میں انہوں نے 2 جنوری 1966ء کے دن کو بڑا مبارک قرار دیا ہے جب دو ننھے بچوں نے روزہ رکھا ۔ زیبا نے اس موقعہ پر منعقد ہونے والی تقریب کی پوری تصویر لفظوں کے ذریعے کھینچ دی ہے ۔ پہلے بتاتے ہیں کہ یہ خوشی آنحضور کے صدقے میں نصیب ہوئی ہے ۔ تمام احباب بے چینی سے اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں ۔ ہر ایک کی نگاہ میں چمک اور دل میں امنگ ہے ۔ روزہ کشائی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔ نانی اور دادی کے لبوں سے دعائیں نکل رہی ہیں ۔ ماں کی مسرت دیدنی ہے ۔ خالہ نے گود میں اٹھایا ہوا ہے ۔ اور بشر نے پھولوں کا گجرا پہنایا ہے ۔ زیبا کہتے ہیں کہ میری دعا ہے کہ خدا ان بچوں کو سدا خوشحال رکھے اور آنحضورؐ کے فیض کا سایہ ان کو اپنی پناہ میں لے لے ۔ قرآن پاک ان کی رہنمائی کرے اور ان کے دل ایمان کے جلووں سے منور رہیں ۔ آخر میں یہ دعا کرتے ہیں۔

مری دعا بھی یہی ہے خدائے برتر سے　　حیات خضر وہ بخشے انہیں مقدر سے

عطا ہو فیض رسالت مآب کا سایہ　　سروں پہ ان کے ہو ام الکتاب کا سایہ

قدم قدم پہ کرے ان کی رہبری قرآن　　دلوں میں ان کے فراواں ہو جلوہ ایماں

انہیں نصیب دو عالم میں لطف مولا ہو

قبول بار گہہ رب ، دعائے زیبا ہو

" رخصتی " یہ مثنوی زیبا نے شمس الدین صاحب کی صاحبزادی الماس پروین کی شادی کے موقع پر لکھی ۔ اپنے جذبات کو الفاظ کے پرکیف سانچے میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ ان کیفیات و احساسات کا بیان بھی کیا ہے جو کسی بیٹی کی شادی پر اس کے والدین اور دیگر احباب پر گزرتے ہیں ۔ ان کے علاوہ آخری اشعار میں لڑکی کی خالہ کی زبان سے بے شمار نصیحتیں کی ہیں ۔ کہتے ہیں کہ خوشی کی یہ ساعت آپہنچی ، ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آ رہے ہیں ۔ اللہ کی رحمت کے باعث یہ محفل مرتب ہوئی ہے ۔ تمام عزیز واقارب اپنے نذرانہ محبت و عقیدت لے کر آ پہنچے ہیں ۔ رخصتی کے موقعہ پر خالہ کس طرح بھتیجی کو دعائیں دیتی ہوئی نصیحت کرتی ہے ۔ اس کی تصویر دیکھئیے ۔

اے مری " الماس پروین" خوش نہاد　　بزم عالم میں رہے تو شاد شاد

اے مری نور نظر ، لخت جگر　　خوش رہے تو ، رات دن ، شام و سحر

بسکہ رخصت کر رہی ہوں میں تجھے　　یہ نصیحت کر رہی ہوں میں تجھے

ہیں یہی باتیں ، ترا دلکش جہیز　　جیتے جی ، ہرگز نہ ہو ان سے گریز

اس جہاں میں زندگی جب تک رہے　　سنت و قرآں ، ترا مسلک رہے

حکم شوہر کا ہمیشہ ماننا　　حق خدمت ہر طرح پہچاننا

سب سے رہنا اس طرح شیریں زباں　　　شاد تجھ سے سب رہیں خورد و کلاں

بہتر و برتر سمجھنا عمر بھر　　　اپنے گھر کو، گھر سمجھنا عمر بھر

" عید قرباں" گیارہ اشعار کی مثنوی ہے ۔ اس مثنوی کا آغاز منفرد انداز سے ہوتا ہے ۔ براہ راست موضوع پر آنے سے پہلے قربانی کے مختلف انداز بیان کیے گئے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ کوئی کسی نازک ادا کے ناز پر قربان ہو جاتا ہے تو کسی کیلئے حسن کی رنگینیاں اور عشق کی سرمستیاں جان قربان کر دینے کا باعث بنتی ہیں ۔ اسی طرح سے کوئی اپنے حال ، ملک و مال پر قربان ہو جاتا ہے ۔ دنیا میں خوشی و غم کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہوش قائم نہیں رہتے ۔ یہاں سے اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ اگرچہ دنیا میں جان نثار کرنے کے یہ مختلف ذرائع ہیں اور یہ تماشا خوشی و غم سے ترتیب پاتا ہے ۔ لیکن ایک قربانی ایسی ہے جو ان سب سے بڑی اور اس کی تاریخ دیگر لوگوں کیلئے باعث حیرت ہے۔ مسلمانوں کے دل میں اس دن کا خاص احترام و وقار پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو ۔ اس میں ہر مسلمان کیلئے واضح اور روشن پیغام موجود ہے ۔ حج اور قربانی اہم فرائض ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ۔ باپ یعنی حضرت ابراہیم نے خدا کا گھر بنایا اور بیٹے حضرت اسماعیل نے باپ کے حکم کے آگے گردن جھکا دی ۔ حج کرنے میں ہر امیر و غریب کی عافیت ہے اور قربانی حضرت اسماعیل کی سنت ہے ۔ ان دو اہم ہستیوں کی وجہ سے "عید قرباں" مسلمانوں کی زندگی کا بہت اہم اور ممتاز دن ہے ۔

عید قرباں کی خوشی زیبا بہت ممتاز ہے

یہ زمانہ حج و قربانی کا رنگیں راز ہے

"مہاجر ہیں" یہ مثنوی 1947ء میں پاکستان بننے کے موقع پر لکھی گئی ۔ اس میں اداسی کا رویہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے ۔ یہ شاعر کی اپنی شخصیت کا عکس بھی ہو سکتا ہے ۔ اور دوسری سطح پر اس کا تعلق اجتماعی تجربے سے بھی ہو سکتا ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمان وسیع تر قربانیوں کے بعد یہاں پہنچے لیکن انہیں احساس ہوا کہ جن گروہ حقدار تھے یا جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا یہ وہ حالات اور ماحول نہیں ۔ اس پر کچھ شاعروں نے ان حالات کا مقابلہ کرنے، ان پر تنقید کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی فکر کی ۔ کچھ شروع میں ہی اس غم میں مبتلا ہو کر رہ گئے ۔ آزادی ان کو دھوکا نظر آنے لگی اور وہ افسردہ ہو کر کہنے لگے ۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ناصر کاظمی اس دور میں ایسے شاعر تھے جنھوں نے خود کو اجنبی مسافر اور اداس شاعر قرار دیا ۔ زیبا ناروی خود بھی ہجرت کرنے کے بعد تباہ حال پاکستان پہنچے اور تقسیم کے بعد دیگر مہاجرین کی بد حالی نے بھی ان پر گہرا اثر کیا ۔ یوں ان کے اندر اداسی اور غم کی فضا پیدا ہو گئی ۔ وہ اپنے آپ کو مسافر سمجھتے تھے۔ اس نظم میں زیبا نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے ۔ کہ اگرچہ ہم مہاجر ہیں لیکن ہم میں خود داری کی شان باقی ہے ۔ دل آزاری ہمارے ضمیر میں شامل نہیں ، جو لوگ ہمیں بھکاری سمجھتے ہیں یہ ان کا حسن نظر ہے اس لیے ہم دعا کرتا ہیں کہ ایسے لوگ ہمارے قریب تک سے نہ گزریں ۔ ظاہر ہے کہ جو

لوگ عیش و عشرت میں مگن ہیں ، انہیں ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل ہو، وہ غریب لوگوں کے حالات اور مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے ۔ پھر بتاتے ہیں کہ میں صرف اپنا ذاتی درد بیان نہیں کر رہا یہ پوری ملت کی آہ و زاری ہے ۔ ہم ایسے لوگ ہیں جو کسی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ بے بسی میں دوسروں کی حسرتوں کا لہو پینا ہماری شان کے خلاف ہے ۔ زمانے میں ہمیں بے شمار مصائب کا سامنا ہے لیکن زیبا اس صورت حال سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ غموں سے گھبراتے ہیں نہ مشکلات سے ڈرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے جو ستم دیکھے ہیں ان پر میرا دل لہو روتا ہے ۔ ہم مہاجر ہیں ۔ مسافر ہیں ۔

حیات غم کا صدمہ ہے نہ خطرہ سخت مشکل سے
لہو پیتا ہوں ، لیکن صرف اپنے سافر دل سے

بہاتی ہے جو آنسو بھی مری چشم ستم دیدہ
سیاست ہے شریعت کی سراپا اس میں پوشیدہ

سوال عرض ملت پر فقط میں بار خاطر ہوں
بجا ہے جو کہا جائے ، مسافر ہوں ، مہاجر ہوں

اس نظم میں سیاسی و تہذیبی رنگ ہے ۔ 1947ء کے بعد کے واقعات کی منظر نگاری کی گئی ہے ۔

" سیاست کے نشیب و فراز " خالص سیاسی نظم ہے ۔ یہ روزنامہ " احسان " لاہور میں شائع ہوئی ۔ اس مثنوی میں اکاون اشعار ہیں ۔ اس مثنوی میں سیاست کے رموز ، ووٹ

لینے کے طریقے، عوام کو اپنا ہمدرد بنا لینے کے گُر بیان کیے گئے ہیں ۔ آغاز میں یہ بتایا ہے ہے کہ سیاستدان جب کبھی اپنی وزارت کھو بیٹھتے ہیں تو انہیں دن رات یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وزارت چھن گئی ہے تو کیا ہوا ۔ دولت تو ہمارے پاس ہے اور یہ ختم نہ ہونے پائے ۔ انصاف کے شکنجے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں سمیٹا ہوا زر چھن نہ جائے ۔ ہمارے اعمال عوام کے سامنے آشکارا نہ ہو جائیں ۔ چنانچہ انہیں عوام کے سامنے نت نئے روپ بدل کر جانا پڑتا ہے ۔ تاکہ عوام کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں ۔ اس کام کیلئے کسی اور علاقے سے الیکشن لڑیں گے ۔ وہاں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے ۔ اس کی عکاسی دیکھئے ۔

پرانا اثر کام کچھ آئے گا   زمانے کو اپنی طرف لائے گا
شریعت کا لیں گے بہانہ کہیں   سنائیں گے قومی فسانہ کہیں
ڈرامہ نیا ہو گا تیار پھر   وہی ووٹ کی ہو گی بھر مار پھر

جب انہیں کامیابی حاصل ہو جائے تو دوبارہ رنگ رلیوں میں مگن ہو جاتے ہیں ۔ وہ سیاست کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک عدالت کے قانون کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ۔ عوام کے حقوق کے تحفظ کی قسمیں کھانے والے ان سے نظریں نہیں ملاتے ۔

میسر جو ہو کامیابی ہمیں   تو راس آئے ساغر گلابی ہمیں
وہی رنگ رلیاں ہیں پیش نظر   حسینوں کے جمگھٹ میں پھر ہو بسر
سیاست ہماری ہی محکوم ہو   عدالت کا قانون معصوم ہو
جو دیکھے کوئی پردۂ لیگ پر   ہماری ہی تصویر آئے نظر

مہاجر نوازی پھر اک جرم ہو
حقوق العبادی پھر اک جرم ہو

اقتدار میں آنے کے بعد یہ لوگ رشوت کا بازار گرم کر دیتے ہیں ۔ زندگی کے مزے لوٹتے ہیں اور غریبوں کی پونجی سے اپنی دولت بڑھاتے ہیں ۔ جب ان کے پاس زیادہ دولت جمع ہو جاتی ہے تو پھر انہیں کسی کی پروا نہیں رہتی ۔

غریبوں کو چٹکی میں مسل دیتے ہیں ۔ ان کے ہاں انصاف و کرم کا نام تک نہیں پایا جاتا ۔ غرور و تکبر ان کا شیوہ ہے اور دوسروں کو تنگدستی میں دیکھ کر خوش ہونا ان کی عادت ۔ ان کے خصائص کچھ ایسے ہو جاتے ہیں دیکھئیے ۔

غرور و تکبـر ہماری ہو رو   جو ہم کھائیں گیہوں تو سب کھائیں جو

ہمارے لیے مرغ ، تیتر، بٹیر   غریبوں کو چولھے کی مٹی کا ڈھـیــــر

امانت پہ حاوی خیانت رہے   سخاوت کا اپنوں میں دریا بـہـــــــے

ہنر مند کی قـدر کچھ بھی نـہ ہـو

کہیں کا کوئی صـدر کچھ بھی نہ ہو

وہ سیاستدان حکومت سنبھالتے ہی وڈیرن کہنہ کا قلع قمع کر دیتے ہیں ۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں اضافے کرتے ہیں ۔ مزدور اور غریب کی محنت کا پھل خود کھاتے ہیں ۔ کسی کی فریاد کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ اپنے خلاف بولنے والی ہر زبان بند کر دیتے ہیں ۔ کسی کا کام نہیں کرتے ۔

اگر رشتہ داروں کا کچھ کام ہو   تو پروا نہیں نام بدنام ہـو

صریحاً جتائیں انہیں دوستــی   کریں حق و انصاف سے دشمنی

بتائیں کہ آساں محالات ہیــں   دکھائیں کہ یہ اختیارات ہیں

جسے چاہیں اس کو بنائیں امیر　　　جسے چاہیں دم بھر میں کر دیں فقیر

نہ خوف قیامت نہ پاس رســـــول

خـــدائی میں اپنے کو بھی جائیں بھول

یہ سب کرنے کے بعد جب انقلاب آتا ہے تو انہیں نکال دیا جاتا ہے ۔ اس پر یہ دغا باز فریاد کرتے ہیں کہ ہمیں کیوں نکالا گیا ہے ۔ خدا تعالی سے رحم کی دعائیں مانگتے ہیں۔

ذرا ناظم ملک و ملت سنے　　　ہمیں انتخابات میں پھر چنے

پس پشت کیوں ہم کو ڈالا گیا　　　بھلا کس لیے یوں نکالا گـــیا

الہی تیرے در پہ فریـــاد ہے　　　کہ انصاف کر ہم پہ بے داد ہے

تجھی سے ہے جو کچھ ہے اب التجـــا

کریا ، یہ بخشـــائے بر حـــال مـــا

اس مثنوی میں سیاستدانوں کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ وہ اپنے عہدوں اور دولت کیلئے سب کچھ کر گزرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں ۔ یہ حرص و ہوس کے غلام ہیں جن میں انسانیت کی کوئی خوبی موجود نہیں ہوتی ۔ اور اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ یہ زمانی قید سے آزاد ہے ۔ آج بھی سیاست کی وہی ڈگر ہے جو برسوں پہلے زیبا ناروی نے اس مثنوی میں عیاں کی ہے ۔

" ہـــم " انسانی عظمت سے متعلق ہے ، جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں زیبا انسان کے بلند رتبے اور وسعت کا بیان کرتے ہیں ۔ انسان کے دم سے کائنات کی ساری رنگینی اور دلکشی قائم ہے ۔ زمانے میں زندگی کا نظام اور پیغام انسان کے وجود میں آنے

کے بعد شروع ہوا ۔ حق و باطل میں امتیاز کرنے والا اس سے پہلے کوئی موجود نہ تھا ۔ دن رات کی حقیقت انسان نے ہی معلوم کی ۔ غرض یہ کہ ہر چھپے ہوئے راز کو زمانے پر آشکارا کیا ۔

ہم سے چاہی زیر گردوں آگ پانی نے پناہ ، ہم سے مانگی ہے سمندر کی روانی نے پناہ

ہم کہیں شمشیر زن ہیں ہم کہیں ہیں تیر زن ، ہم سے ٹکراتا رہا اپنی جگہ چرخ کہن

ہم ہی خود حاکم کہیں ہیں ہم ہی خود محکوم بھی، ہم ہی خود مسرور بھی ہیں ہم ہی خود مغموم/ بھی

یعنی زندگی کی دورنگی کا بھی ذکر کیا ہے کہ انسان ان تمام صلاحیتوں کے باوجود حاکم بھی ہے اور محکوم بھی۔ کچھ لوگ خوشحال ہیں اور بعض افسردہ و بے دل بھی ۔ آگے چل کر بتاتے ہیں کہ ہم نے اس کائنات میں خدا کی عظمت کی پہچان کرائی، ۔ دنیا کو خواب سے جگایا اور کوہ طور پر معبود سے باتیں کی ہیں ۔ زمانے نے ہمارے علم و ہنر کو تسلیم کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام خلق میں ہمیں اشرف المخلوقات کا منصب عطا کیا/ گیا ہے ۔

ہم نے پہچانی جہاں میں عظمت رب جلیل ہم ہی ٹھہرے عزم و استقلال کی روشن دلیل

ہم نے دنیا کو جگایا خواب لامحدود سے ہم نے باتیں کی ہیں کوہ طور پر معبود سے

ہم کو مانا کل جہاں نے ابجد علم و ہنر ختم ہو کر رہ گئی ہم پر حد علم و ہنر

ہم ہی ہر تہذیب کا عنوان کہلائے گئے

ہم ہی زیبا خلق میں انساں کہلائے گئے

" شکوہ بعد شکوہ" زیبا کی ایک منفرد فکری نظم ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی نظم " شکوہ " اور " جواب شکوہ " کے اثرات انہوں نے قبول کیے ہیں اور کچھ اس انداز

میں یہ مثنوی کہنے کی کوشش کی ہے ۔ موضوع کے اعتبار سے "شکوہ بعد شکوہ" قوم کی موجودہ زبوں حالی پر ایک درد مند مسلمان کی فریاد ہے ۔ ایک حساس دل سے نکلتی ہوئی آواز ہے ۔ اس کے آغاز میں شاعر نے بتایا ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب اقبال نے مسلمانوں کی حالت زار پر اللہ سے شکوہ کیا تھا ، مگر اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ قوم کو اپنے ہی افعال کا شکوہ ہے ۔

بے پناہ مصائب برداشت کرنے اور قربانیاں دینے کے بعد مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت نصیب ہوئی ہے ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس نعمت کو دل و جاں سے عزیز رکھتے اور اسے صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بناتے ، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں کسی کو دوسرے کا احساس نہیں ہے ۔ سرمایہ دار اپنی دولت کے نشے میں مست ہیں ۔ مہاجروں کا کوئی پرسان حال نہیں ۔ دولت کے بل بوتے پر رہائش کا انتظام بھی بآسانی ہو جاتا ہے اور خورد و نوش کا بھی ، لیکن جو بدحال اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد پاکستان پہنچے ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں ۔ ان کی ہمت ختم ہو چکی ہے ، اگر کوئی اپنی داستان کہتا ہے تو توجہ سے سننے والا نہیں ملتا ۔ حتی کہ اپنے بھی نگاہیں بدل چکے ہیں ۔ یہ صورتحال نہایت مایوس کن ہے اور پریشانی کا باعث بھی ۔

جو کل کہ لکھ پتی تھے آج وہ محتاج بیٹھے ہیں   لٹا کر اپنی دولت اور اپنا راج بیٹھے ہیں

اگر کوئی کسی کو حال غم اپنا سناتا ہے   تو ان الفاظ میں فوراً جواب تلخ پاتا ہے

یہاں کیوں بھاگ کر آئے تمہیں یہ کام کرنا تھا   وطن میں گولیاں سینے پہ کھانا اور مرنا تھا

غضب دیکھو کہ اپنے اور اپنوں سے نظر پھیریں

قیامت ہے کہ یوں طعنوں کے خنجر حلق پر پھیریں

یہاں ان کا لہجہ تھوڑا سا شکایتی ہو جاتا ہے ۔ مسلمانوں کے اعمال و کردار کے بدلتے ہوئے رجحان کو دیکھتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہی انسانیت ہے، یہی شان اسلامی ہے ۔ اگر قوم نے اپنے طور طریقے نہ بدلے تو قیاس یہی ہے کہ یہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی ۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کے سلسلہ بیان میں ان کی انفرادی اور اجتماعی خامیوں کو ظاہر کرنے کیلئے ان کے اسلاف کا ذکر کر رہے ہیں کہ اب ان میں اسلام کی عظمت کا احساس باقی نہیں رہا ۔ ملّت کی خیر خواہی کی دولت وہ کھو چکے ہیں ۔ بے عمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ تقدیر پرستی نے انہیں گہری بدحالی کا شکار کر دیا ہے ۔ لیکن ان باتوں کے ساتھ ساتھ شاعر مسلمانوں کے روشن مستقبل کی امید بھی رکھتا ہے ۔ چنانچہ اب شاعر مسلمانوں کو دعوت عمل دیتا ہے کہ اگر قوم کا ہر فرد با عمل ہو جائے تو کفر کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ ان کے اسلاف میں ایثار و گداز کا جو جذبہ موجود تھا، وہی ان میں پیدا ہو جائے تو مسلمان پھر سے وہی مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

عمل پیرا جو تیری قوم میں ہر فرد ہو جائے　　خدا شاهد کہ چہرہ کفر کا پھر زرد ہو جائے

اگر اگلا سا وہ ایثار کا جذبہ نمایاں ہو　　زمانے کی نگاہوں میں مسلماں، پھر مسلماں ہو

یہاں سے آگے چل کر شاعر پھر ان واقعات و مظالم کی تصویر کھینچ رہا ہے جو ہند میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہے ہیں ۔ اس طرف متوجہ کرتے ہوئے اکسا رہا ہے کہ اے بے خبر تو اب تک سویا ہوا /کیوں ہے ۔ نغمہ و لے میں مگن ہے ۔ وہ لاکھوں بے گناہ جنہوں نے اس وطن کی بنیادوں میں اپنا لہو شامل کیا ہے، ان کی روحیں بے چین ہیں ۔ وہ اس الم و درد پر تڑپتی ہوئی تجھے بیدار کرنے آئی ہیں ۔ یہ وہ معصوم اور بے گناہ لوگ ہیں جنہیں مکاروں نے اپنی تلواروں سے گھائل کر دیا ہے ۔

یہ وہ ہیں جن کو تلواروں سے مکاروں نے مارا ہے　　یہ وہ ہیں جن کو بے دردی سے خونخواروں نے مارا / ہے

یہ وہ مرحوم ہیں جن کا نہ کوئی دخل تھا شر میں　　یہ وہ معصوم ہیں جو تھے ابھی آغوش مادر میں

یہ وہ گل ہیں جو کھلتے ہی ہوئے نذر خزاں کیا کیا　　یہ وہ بوٹے ہیں جن کے مٹ گئے دل کش /فشاں کیا کیا

نظم کے اختتام پر دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے تو ان خوابوں کی تعبیر ہو جائے ۔ کیونکہ بہت سے لوگ تجھ سے شکوہ کر رہے ہیں ۔

بہت سی ایسی روحیں برملا فریاد کرتی ہیں　　تڑپتی ہیں تڑپ کر شکوہ بے داد کرتی ہیں

مگر تو ہے کہ تجھ پر بے حسی کی نیند طاری ہے　　عمل جتنے ہیں تیرے ان سے ظاہر خام کاری ہے

فنی لحاظ سے اس نظم میں براہ راست خطاب کا انداز ہے ۔ 1947ء کے واقعات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے ۔ نظم کا لہجہ اول سے آخر تک یکساں نہیں ۔ بعض حصوں میں گداز ہے ، اور بعض میں جوش کا انداز ہے ۔ جہاں مسلمانوں کی فکری اور عملی گمراہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ وہاں تنقیدی لہجہ ہے ۔ کہیں کہیں طنزیہ رنگ بھی ملتا ہے ۔ بعض حصوں میں تاسف کا لہجہ پایا جاتا ہے ۔

زیبا ناروی کی تمام مثنویوں کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ غزل کے شاعر سمجھتے جاتے ہیں اس کے باوجود انہوں نے جب بھی اخلاقی ، ملکی یا قومی موضوعات پر کچھ لکھا ہے تو زبان کی سلاست اور بیان کی لطافت کے ساتھ بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں ۔ بعض نظموں میں انہوں نے شکایتی اور طنزیہ انداز بیان اختیار کیا ہے ۔ بیشتر نظموں کا موضوع مسلمانوں کی بے راہ روی اور دین سے بیگانگی ہے ۔

زیبا نے اپنے ماحول اور اپنی ملت کے طور طریق پر بڑی گہری نظر ڈالی تھی ۔غزلوں میں تو اپنے خیالات پر انہوں نے تغزل کا پردہ ڈال رکھا تھا لیکن نظموں میں جب یہ پردہ نہ رہا تو ان کے جذبات اور احساسات کا لب و لہجہ بڑا تلخ ہو گیا ۔ ان کی نظموں میں کئی معلوماتی اور درسی پہلو بھی موجود ہیں ۔ ان نظموں کی زبان عموماً سادہ اور اسلوب دلکش ہے ۔ محاکات نگاری کا کمال دکھایا گیا ہے ۔ فکری اور علمی پہلو نمایاں ہیں ۔

زیبا ناروی نے زیادہ تر نظمیں ملک و قوم سے متعلق لکھی ہیں اور ان کے حوالے سے انہیں وطنی شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ ان میں مسلم نوجوان سے محبت اور اس کے حالت پر احساس ہمدردی کار فرما ہے ۔ ان نظموں کے اندر وطن سے محبت کا احساس رواں دواں ہے ۔ زیبا نے مسلمانوں کی خوبیوں کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے ان کے جذبہ ملی کا ثبوت ملتا ہے ۔ انہوں نے کئی دوسرے موضوعات پر بھی قلم آزمایا ہے ۔ ہر قسم کے موضوع کو شعر کا روپ دینے میں زیبا ناروی کو کمال حاصل تھا ۔

زیبا کی مثنویاں گونا گوں فنی محاسن سے لبریز ہیں ۔ زیبا نے موسیقیت پیدا کرنے کیلئے مترنم بحریں اور مترنم قافیے استعمال کیے ہیں ۔ بعض اوقات تکرار لفظی سے بھی آہنگ و موسیقیت

پیدا کرتے ہیں ۔ موسیقیت اور ترنم کی مثال دیکھئیے ۔

مسل دیں اسے جس کی چنگی بھریں　　　نہ کانوں پہ دنیا کی باتیں دھریں

کہاں کا کرم ذکر الطاف کیا　　　حکومت کی دنیا میں انصاف کیا

وہی گرم رشوت کا بازار ہو　　　وہی ہم وہی جنت سیار ہو

وہی زندگی کے مزے ہوں نصیب　　　وہی ہم پہ قرباں ہوں لاکھوں غریب

زیبا صوتی آہنگ ، تکرار الفاظ اور پر شکوہ الفاظ سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں ۔ وہ اندرونی قوافی کے استعمال سے بھی ترنم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں ۔

ان کی مثنویوں میں بلاغت کی شان پائی جاتی ہے ۔ زیبا نے تکرار لفظی سے بات میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔

ــ۔ دیکھئے کیا کیا دکھائے انقلاب روز گار

ــ۔ اب شریک رنج انسان ہستی انساں نہیں

ــ۔ دیکھ کر فاقے سبھوں کے دل ہوا ہے پاش پاش

ــ۔ آدمی بیکار ہے تو زندگی بیکار ہے

زیبا نے تشبیہات و استعارات کے علاوہ صنائع بدائع سے مکمل فائدہ اٹھایا ہے ۔ ان کی مثنویوں میں صنعت تلمیح ، صنعت تضاد اور صنعت ترصیع کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ۔

صنعت تلمیح کا استعمال دیکھئیے ۔

ــ۔ کیوں بھلا دی آج سے نو سو برس پہلے کی یاد

اس قدر اس وقت سے اس وقت تجھ میں ہے تضاد

ـــہ تیری نظروں میں اگر آستین کی تاریخ ہے

سوچ لے خود ہی یہ کیا ترمیم ہے تنسیخ ہے

ـــہ حج کعبہ عاقبت ہے ہر گدا و شاہ کی

اور قربانی ہوئی سنت خلیل اللہ کی

ـــہ کچھ اس صورت سے پھر زیر نظر تنظیم عالم ہو

کہ ہر مرد مجاہد اک صلاح الدین اعظم ہو

ـــہ نظر آنے لگے اک اک میں استقلال محمودی

چمک اٹھے دوبارہ نیر اقبال محمودی

صنعت تضاد کی مثالیں یہ ہیں ۔

ـــہ ہے یہی بندوں کو حکم اللہ کا

ہے یہی مسلک گدا و شاہ کا

ـــہ اے مری نور نظر، لخت جگر

خوش رہے تو رات دن شام و سحر

ـــہ مرے کو مار کر آرام سے جینا نہیں آتا

کسی بے کس کی حسرت کا لہو پینا نہیں آتا

ـــہ الغرض دنیا میں ہیں ایسی بہت قربانیاں

شادی و غم سے مرتب ہے تماشائے جہاں

اسی طرح سے صنعت ترصیع کا استعمال ملتا ہے ۔

ــہ   کوئی اپنے حال پر قربان ہو کر رہ گیا

کوئی ملک و مال پر قربان ہو کر رہ گیا

ــہ   راحت و غم دیکھ کر قربان کسی کے ہوش ہیں

رنگ عالم دیکھ کر قربان کسی کے ہوش ہیں

ــہ   اہل سرمایہ کی ہے سرمایہ داری بھی فضول

حاکم بالا کی ہے ذی اختیاری بھی فضول

زیبا نے بحروں کے استعمال میں بھی کمال دکھایا ہے ۔ کہیں موقع و محل کے مطابق طویل بحر آزمائی ہے اور کہیں جذبات و احساسات کے ماتحت چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں۔

چھوٹی بحر کا استعمال بھی قابل دید ہے ۔

ــہ   عید کا ساماں ہے ماہ عید میں

گل کھلے ہیں گلشن امید میں

ــہ   کارفرما رحمت رب ہو گئی

محفل شادی مرتب ہو گئی

ــہ   یہی ہے تمنا یہی آرزو

یہی جستجو ہے یہی گفتگو

ــہ   گورنر ، کمشنر ، کلکٹر کہاں

فقط تجھ سے ہے عرض اللہ میاں

هندی الفاظ کی مثال دیکھئیے ۔

دل سے ہو کر شاد بولا کوئی قربانت شوم

دیکھ کر اولاد بنا کوئی قربانت شـــــوم

زیبا ماہر تراکیب ہیں ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں دلفریب تراکیب آزمائی ہیں ۔ جو ان کی جدت طرازی کا ثبوت ہے ۔ مثلاً اذان درد ملت ، نیر اقبال محمودی ، حسن نظر ، فروغات زمانہ ، طلسم عیش ، جوش جہالت ، کار عالم ، وغیرہ زیبا کی قدرت زبان کی دلیل ہیں ۔

زیبا کی مثنویوں میں ایک اہم خوبی محاکات نگاری ہے ۔ واقعات کی ہو بہو عکاسی کی گئی ہے ۔ نظم " رخصتی " میں ہماری تہذیب و معاشرت کا رنگ جھلکتا ہے ۔ اس میں نصیحت کا انداز موجود ہے ۔ شادی کی تقریب کی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دی ہے ۔

آئے ہیں سارے عزیز و اقربا　　　کہہ رہے ہیں " مرحبا صد مرحبا "

اللہ اللہ ساعت عقد سعید　　　مل گئی سب کو مسرت کی نـــوید

پھر رخصت کے وقت بیٹی کو جس طرح سے دعائیں دی جاتی ہیں ان کا بیان دیکھئیے ۔

تو پھلے پھولے جہاں میں روز و شب　　　ہر گھڑی ہو عین راحت کا سبب

رخصت اے بیٹی ، بصد عزو وقار　　　تیرے گلشن میں رہے دائم بہـــار

بحیثیت مجموعی زیبا کی مثنویاں فنی لحاظ سے عمدہ محاسن کی حامل ہیں ۔ ان میں تشبیہات و استعارات کا حسن بھی ہے اور صنائع بدائع کا استعمال بھی ۔ زبان آسان و

سلیس استعمال کی گئی ہے ۔ لیکن کہیں کہیں حسب ضرورت پر شکوہ زبان سے کلام کو مزین کیا گیا ہے ۔ تراکیب بکثرت موجود ہیں ۔ ان کا اسلوب دلکش ہے اور تاثر کی شدت اور گہرائی کا آئینہ دار ہے ۔ غرض یہ کہ زیبا ناروی کی مثنویاں ان کی بے پایاں صلاحیتں ، وسیع مطالعہ ، بلندی ، تخیل ، مہارت زبان ، قدرت بیان اور شعری کمال کی عکاس ہیں۔

مخمس :

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جس نظم کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو اسے مخمس کہتے ہیں ۔ اس میں قافیوں کی ترتیب کی نو بہ نو اور حیران کن مثالیں پائی جاتی ہیں ۔ اس کی خاص ہئیت تو یہ ہے کہ پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور بعد والے تمام بندوں کے اولین چار مصرعے کسی علیحدہ قافیے میں ہم قافیہ ہوں اور ان کا پانچواں مصرعہ پہلے بند کے قافیے کی پیروی کرتا ہو ۔

اسی قافیائی نظام میں ہر بند کا پانچواں مصرعہ بطور " مصرعہ ترجیع " بھی لایا جاتا ہے ۔ عام طور پر مخمس (یا خمسہ) کی یہی صورتیں مستعمل رہی ہیں اور قدیم اردو شعراء کے ہاں بیشتر نمونے انہی شکلوں میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا قوافی کے نظام کی نو بہ نو ترتیب سے اس ہئیت میں رنگا رنگی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ۔ خاص طور سے جب اردو شعراء نے انگریزی کی مقبول ہئیت " اسٹینزا " کی مختلف شکلوں کو قبول کیا اور ان کے تجربے کیے تو اس کی ایک شکل یعنی پانچ مصرعوں کے اسٹینزے کی مختلف ضمنی صورتیں بھی سامنے آئیں ۔[1]

ہمیں جس شاعر کا مطالعہ کرنا ہے وہ کلاسیکی مزاج کا شاعر تھا ۔ اور اس کے ہاں اسٹینزا کے اثرات مفقود ہیں ۔ لہٰذا ہم محض انہی صورتوں کے بارے میں لکھنے پر اکتفا کر رہے ہیں جو بالعموم کلاسیکی شعراء کے ہاں نظر آتی ہیں ۔

---

1 ۔ تفصیل کیلئے دیکھئیے، شمیم احمد " اصناف سخن اور شعری ہئیتیں " تخلیق مرکز 33 ۔ اے شاہ عالم گیٹ ۔ لاہور

مخمس کی صنف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی سے اردو میں آئی ، کیونکہ مقامی زبانوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ اردو میں اس کا آغاز دکنی دور سے ہوتا ہے ۔ مخمس کی مثالیں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے بیشتر شعراء کے ہاں مل جاتی ہیں ۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی ، شاہی ، بحری ، نصرتی اور ولی دکنی نے اس صنف کو برتا ہے ۔ شاہ حاتم نے اس میں خوبصورت اضافے کیے ۔ لیکن مخمس نے اصل عروج میر و سودا اور نظیر اکبر آبادی کے زمانے میں حاصل کیا ۔ سودا کے ہاں اس کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں ۔ اس ہئیت میں گرانقدر نظمیں جو تعداد کے اعتبار سے بھی نسبتاً زیادہ ہیں نظیر اکبر آبادی کے ہاں ملتی ہیں ۔ جتنا کمال اس صنف کو اس دور میں ملا اس سے پہلے اور بعد کے آنے والے کسی زمانے میں اسے حاصل نہ ہو سکا ۔ مخمس جدید دور میں بھی لکھی جاتی رہی ہے اور بہت سے شاعروں نے اس ہئیت میں اظہار خیال کیا ۔ لیکن نئی شعری ہئیتوں نے بہت سی پرانی ہئیتوں کی طرح مخمس کی مقبولیت پر بھی منفی اثر ڈالا ۔

زیبا ناروی نے " مخمس " کی ہئیت میں نظم نگاری کی ہے ۔ ان کے تین مخمس دستیاب ہو سکے ہیں ۔ یہ تینوں زیبا نے اپنی بعض غزلوں پر تضمین کیے ہیں ۔ تضمین کیلئے عموماً مخمس کی ہئیت برتنے کا رواج رہا ہے ۔ غزل میں مربوط موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی اس لیے ان میں کوئی مسلسل خیال بیان نہیں کیا گیا ۔

زیبا ناروی نے 16 جون 1946ء کو نارہ میں ایک خمسہ لکھا جو نو بندوں پر مشتمل ہے ۔ اس میں منزل عشق میں پیش آنے والے روایتی مراحل اور خصوصاً آخری مرحلے کا ذکر

کیا ہے ۔ ساتھ ہی عاشق کی مستقل حالت زار اور محبوب کی بے رخی جیسی شعری روایت کو بیان کیا ہے ۔ ہر بند میں کیفیت بدل جاتی ہے ۔ پہلے بند میں عاشق پر محبوب کی فرقت میں آخری لمحوں پر رونما ہونے والی کیفیت کا بیان ہے جب عاشق ہر قسم کی تکلیف سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ اس کا عشق اس انتہا تک پہنچ جاتا ہے جہاں ہر تکلیف بھی باعث راحت ہوتی ہے ۔ اس حالت میں بھی صرف اور صرف محبوب کی یاد اور انتظار عاشق کے پیش نظر ہوتا ہے ۔ اس کیفیت کو شاعر نے بڑے ہی مختصر انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

آنکھ سوئے آسماں لب پر تمہارا نام ہے ۔۔۔

آگے چل کر بتاتے ہیں کہ عاشق بستر مرگ پر ہے ۔ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اور عشق کے اس جان لیوا مرض میں کوئی کچھ نہ کر سکا ۔ کسی کی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ یہ مرض عشق حقیقی معلوم ہوتا ہے ۔ مرنے کے بعد چونکہ عاشق کو محبوب کے وصال کا یقین ہے اس لیے وہ اس آخری مرحلے میں بھی بہت پر سکون ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی جیسی انمول نعمت چھنتے وقت عاشق پر کس قدر اداسی و یاسیت کا غلبہ طاری ہوتا ہے ، کہ تمام زندگی گزر گئی لیکن محبوب نے بے رخی ہی برتی ۔ اس لیے عاشق کے ساتھ ساتھ ساری فضا بھی اداس ہے ۔ ان دونوں کیفیات کا بیک وقت ادراک کیا ہے ۔

مضمحل بیمار غم نا معتبر ہوش و حواس ‏ ‏ خواب ہستی کے تماشے کس طرح آئیں گے راس

دم بخود تارے فلک پر ہر فضا محکوم یاس ‏ ‏ شمع کی آنکھوں میں آنسو چاند کا چہرہ اداس

صبح صادق ہو رہی ہے زندگی کی شام ہے

عشق ایک ایسا روگ ھے جس کے لگ جانے کے بعد عاشق کا کام فقط غم سے ھی جی بہلانا رہ جاتا ھے ۔ محبوب کا رعب عاشق پر اس قدر زیادہ ھوتا ھوتا ھے کہ موقع ملنے کے باوجود عاشق تشنہ فریاد رہ جاتا ھے ۔ پھر محبوب بھی تو بہت سنگدل ھے ۔ بولنے پر بھی اس کی طرف سے کرم فرمائی کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس کا بیان دیکھئیے ۔

اب مجال گفتگو شے شوق برجستہ کہاں　　احترام جلوہ لازم لب کشاں ھوناگراں

سربہ سر دشوار مجھ کو حسرت دل کا بیاں　مدعا کیا کہہ سکوں لکنت زباں کی الاماں

تم مقابل ھو تکلم لرزہ بر اندام ھے

آخر میں بتایا ھے کہ عشق کے روگ نے اس کا کیا حال کر دیا ھے ۔ اس کیفیت کو شاعر نے نہایت خوبصورت انداز میں مجسم شکل دے دی ھے کہ عاشق کو نہ تو آلۂ قتل سے قتل کرنے اور نہ ھی ھاتھوں سے مار دینے کی ضرورت پڑتی ھے بلکہ مرض عشق ھی ایسا تباہ کن ھے کہ عاشق آخر کار اسی میں تمام ھو جاتا ھے ۔

اس مخمس میں جہاں عشق کی مختلف کیفیات کو دل پذیر رنگ دیا ھے وھاں فنی اعتبار سے بھی بہت خوبصورت انداز اپنایا ھے ۔ پوری مخمس میں ایک صوتی آھنگ، جوش اور ولولہ ھے ۔ جو قاری پر نہایت گہرا تاثر قائم کرتا ھے ۔ اس پر طرہ یہ کہ نہایت سادہ الفاظ و تراکیب سے کام لیا گیا ھے سوائے چند مصرعوں کے ۔ اس سادگی میں بھی مخمس میں حسن پیدا کرنا شاعر کا کمال ھے ۔

زیبا ناروی نے ایک اور خمسے میں غزل پر تضمین کی ھے ۔ اس مخمس میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ھے ۔ یوں اس مخمس میں بحیثیت موضوع بہت وسعت پیدا

ہو گئی ہے ۔ کہیں عشق کی کیفیات کا ذکر ہے اور کہیں دنیا کے ہاتھوں حاصل ہونے والے انسانی تجربات کا عصری شعور کے حوالے سے تذکرہ ہے ۔ مثلاً پہلے بند میں عاشق صادق کی عظمت کو بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ محبوب کی عظمت کو بھی ۔ یہ محبوب آنحضور کی ذات مبارکہ ہے ۔ اس محبوب کی عظمت کے پیش نظر ان کا عاشق بھی بڑی قدر و اہمیت کا حامل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے دیکھنے کیلئے جوق در جوق آتے ہیں اور خدا کی خدائی بھی اس پر قربان ہوتی جاتی ہے ۔

بعد کے اشعار میں عاشق کی حالت زار کو بیان کیا ہے کہ عشق کی سچی لگن کے بعد عاشق کو دنیا کے کسی شغل سے دلچسپی نہیں رہتی ۔ اس کے پیش نظر ہمہ وقت محبوب کا خیال اور محبت رہتی ہے ۔ یہ لگن اس قدر شدت کی حامل ہوتی ہے کہ عاشق کی جان اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے ۔ کیونکہ ایک طرف محبوب کا رعب حسن قیامت ڈھاتا ہے تو دوسری طرف زمانہ سنگدل عاشق کے عشق پر قدغن لگاتا ہے ۔ علاوہ ازیں عشق خود ایک بہت بڑی اذیت ہے ۔ چنانچہ ان سب کی وجہ سے عاشق پر عشق میں ہر لمحہ قیامت بن کر گزرتا ہے ۔

کھلا یہ راز فلک، برسر شرارت تھا — دم نشاط جو وقفہ تھا، وہ مصیبت تھا

بلا تھا، قہر تھا، فتنہ تھا، ایک آفت تھا ۔ ذرا سی دیر کا ہنسنا بھی کیا قیامت تھا

نواز نے مجھے غم ہائے روزگار آئے

یہاں پھر عشق حقیقی اور عام انسانی تجربے کے حوالے سے شاعر اپنے احساسات بیان کرتا ہے ۔ اسے کچھ تو دنیا کی عیاریوں کے باعث اور کچھ فانی ہونے کی وجہ سے یہ عالم فریب کا عالم نظر آتا ہے ۔ جہاں ہر طرف کوئی نیا فریب انسان کا انتظار کر رہا ہے ۔

اس بے اعتباری کے عالم میں شاعر کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک خواب کی دنیا میں محو ہے اور اپنی اصل زندگی اور اصلی روپ کہیں اور چھوڑ آیا ہے ۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ۔

قدم جما کے نہیں یاد اب ہمیں یہ بھی سکون پاکے نہیں یاد اب ہمیں یہ بھی

مکاں بنا کے نہیں یاد اب ہمیں یہ بھی عدم میں آکے نہیں یاد اب ہمیں یہ بھی

ہم اپنا جامۂ ہستی کہاں اتار آئے

عاشق جب مقام انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور محبوب کا وصال یکسر نصیب نہیں ہوتا تو پھر اسے اپنا ہی غم زندگی نبھانے کیلئے کافی ہوتا ہے ۔ اس کا گھر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے ۔ اسے اب کسی ظاہری اجالے کی ضرورت نہیں خود اس کے اندر غموں کا الاؤ جل رہا ہوتا ہے ۔ جو کسی طرح بجھائی نہیں جا سکتی ۔ بلکہ خود عاشق اس آگ میں جلنا پسند کرتا ہے ۔ انتظار کی انتہا موت پر ہی ختم ہوتی ہے ۔ کیونکہ موت کے بعد وصال محبوب نصیب ہوتا ہے ۔ موت کے بعد محبوب کا انتظار ختم ہو جائے گا اور ایک بڑی اذیت سے نجات مل جائے گی اس لیے موت شاعر کیلئے باعث راحت ہے ۔

آخر میں شاعر نے بقول غالب ۔ہ

نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

جیسے خیالات کو ایک عاشق کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ عاشق کو زندگی میں تقریباً مر کر بھی اپنے محبوب کی رسوائی منظور نہیں ہوتی ۔ اس لیے وہ مرنے کے بعد بھی محبوب کا احساس

ندامت سے دو چار ہو کر اپنی قبر پر آنا سخت برا محسوس کرتا ہے -

پہن کے آئے کوئی کیوں لباس ماتم کا خلاف وضع ہے نوحہ گر ہونا

سمجھ سکی نہ ابھی تک یہ راز بھی دنیا خوشی کی موت ہے، الفت کی موت اے زیبا

ہماری قبر پہ کیوں شمع اشک بار آئے

یوں شاعر نے اپنے مختلف دنیاوی و عاشقانہ جذبات و احساسات کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے دھیما اور شوخ رنگ ملتا ہے۔ پھر اس پر ایک صوتی آہنگ اور اشعار کی روانی و ترنم بھی عجیب سماں باندھتی ہے جو نہایت اثر پیدا کرتی ہے -

زیبا کے ہاں ایک اور خمسہ ترکیب بند ملتا ہے - اس مخمس بر غزل خود میں عاشق کے ساتھ ساتھ محبوب کو بھی نشانہ مشق بنایا گیا ہے - اس میں عاشقانہ رنگ نمایاں ہے - ایسے عاشق پر چوٹ کی ہے جو دل میں محبت کی آگ کو جذب نہیں کر سکتا اور محبت کو نمایاں کرکے اپنے محبوب کو رسوا کر دیتا ہے - شاعر کے نزدیک یہ عشق کی توہین ہے کہ عاشق بے صبری کا مظاہرہ کرے اور اتنی ہمت کا حامل نہ ہو کہ عشق کی آگ برداشت کر سکے - ایسے عاشق کو عشق کے میدان میں قدم ہی نہ رکھنا چاہئیے - اسی لیے وہ موسی کے تقاضائے جلوہ اور منصور کے دعوی محبوبیت کو تماشا سمجھتا ہے -

بن کے موسی کبھی جلوے کا تقاضا کرنا کبھی منصور کی آواز میں دعوی کرنا

حسن کو عشق کے انداز میں رسوا کرنا پردہ در خود کبھی بننا کبھی پردا کرنا

ہر قدم پر انہیں آتا ہے تماشا کرنا

شاعر عاشقوں کو خبردار کرتا ہے کہ واقعی عشق کی راہ بہت دشوار گزار ہے لیکن اس کے باوجود سخت صبر و برداشت سے کام لینا ہو گا ۔ لہذا زیبا نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں عشق کو رسوا نہ ہونے دینا ۔ محبوب کے دیدار شوق کو عاشق کے حوالے سے بیان کیا ہے اور ان کے ہمیشہ جاری و ساری رہنے کا محبوب سے تقاضا کیا ہے ۔

عالم شوق کے احساس پہ چھائے جاو　　　شعلہ حسن سے اک آگ لگائے جاو
برق تھم تھم کے نگاہوں پہ گرائے جاو　　　ابھی کچھ دیر جھلک اپنی دکھائے جاو

حسرت دید نکل جائے تو پردا کرنا

وقت وصال محبوب کے پردے میں رہنے پر اعتراض کیا ہے ۔

شوخیاں کہتی ہیں ہرگز نہیں یہ وقت حجاب　　　ناز کہتا ہے کہ چھپتا ہے جوانی میں عذاب
چمن سے بیٹھنے دیتا نہیں غمزوں کا عتاب　　　گد گداتا ہے یہ کہہ کہہ کے انہیں شوخ شباب

جلوہ حسن کی توہین ہے پردا کرنا

پھر حالت دید میں عاشق کی بیقراری یوں بیان کرتے ہیں ۔

کچھ سے کچھ دید کا شیدائی ہوا جاتا ہے　　　ہوش سے دور تمنائی ہوا جاتا ہے
کوئی آمادہ رسوائی ہوا جاتا ہے　　　خود فراموش تماشائی ہوا جاتا ہے

بھول جاو کہیں تم بھی نہ تماشا کرنا

آخر میں بتایا ہے کہ وقت وصال بہت عارضی ہوتا ہے ۔ محبوب چند لمحی کیلئے آتا ہے اور عاشق کو دائمی غم سے دو چار کر جاتا ہے ۔ پھر بتایا ہے کہ عاشق جمال محبوب میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے آداب محبت بھی یاد نہیں رہتے ۔

دیکھ توکس پہ عیاں ہو سکے اسرار جمال — سب کو بیگانہ بنا دیتے ہیں اظہار جمال

گم رہے آپ میں ہر وقت طلبگار جمال — ہوش اڑ جاتے ہیں زیبا دم دیدار جمال

یاد رہتا ہے کسے ایسے میں سجدا کرنا

فنی اعتبار سے اس مخمس میں متضاد خیالات کو بیان کیا گیا ہے ۔ کہیں ایک خیال کی تائید کی ہے ، اور کہیں اسی کی مخالفت ۔ پھر بعض جگہ تسلسل موضوع بھی برقرار نہیں رکھا ۔ لیکن جوش و ولولہ اور صوتی آہنگ اس میں موجود ہے ۔

بحیثیت مجموعی زیبا کے خمسے عشقیہ رنگ کے حامل ہیں ۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا بیان تشبیہہ کا برجستہ استعمال ہے ۔ اس کے علاوہ مختلف صنعتوں مثلاً صنعت ترصیع ، صنعت جمع ، صنعت تلمیح وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے ۔ تشبیہہ کے استعمال میں ندرت دیکھئے ۔۔

ــہ اجل کو عشق کا رنگین خمار کہتے ہیں

اجل کو اہل محبت بہار کہتے ہیں

صنعت تلمیح کی مثال یہ ہے ۔

بن کے موسی کہیں جلوے کا تقاضا کرنا

کہیں منصور کی آواز میں دعوی کرنا

صنعت جمع کی مثالیں بکثرت موجود ہیں ، مثلاً

گفتگو ،عرض ،ادب ،جلسہ ،چراغاں ،تقلید — آرزو ،شوق ،حیا ،غور ،تکلف، تجدید

عزم ،احساس ،کرم ،صبر ،خوشامد ،تاکید — زندگی ، موت، خوشی ،رنج ،تمنا امید

پیکر صد رنج نقش نامرادی غم بدوش　　　زرد چہرہ درد ساماں رو بصحرا زہر نوش

تختۂ عشق ستم، محو جنوں محروم ہوش　　　خوں چکاں آنکھیں، پریشاں مو، لب گویا خموش

صنعت ترصیع کا استعمال بھی کثرت سے ہے ۔

جوش ارماں دیکھو میرا دیدۂ گریاں نہ دیکھ　　　جذب پنہاں دیکھ میرا دیدۂ گریاں نہ دیکھ

ابر باراں دیکھ میرا دیدۂ گریاں نہ دیکھ　　　رنگ طوفاں دیکھ میرا دیدۂ گریاں نہ دیکھ

دے کے غم ہو گئی بہار سے پہلے رخصت　　　ہے ستم ، ہو گئی بہار سے پہلے رخصت

یک قلم ہو گئی بہار سے پہلے رخصت　　　صبح دم ہو گئی بہار سے پہلے رخصت

مجموعی طور پر ان خمسوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے ۔ ان میں بنیادی طور پر عشق کی کیفیات کا بیان ہے ۔ لیکن اپنے انداز بیان اور آہنگ کے اعتبار سے یہ خمسے تاثر کے حامل ہیں ۔ ابہام یا ناقابل فہم رمزیت نہیں ہے ۔ بلکہ سیدھے سادے طریقے سے اپنا مقصود بیان کر دیا گیا ہے ۔ موضوع کے اعتبار سے جذبات میں اتار چڑھاو کی کیفیت دکھائی دیتی ہے ۔

باب پنجم :

متفرقات

زیبا ناروی کے سرمایہ شعر میں غزل کو نمایاں مقام حاصل ہے اور مقدار اور معیار کے لحاظ سے ان کی غزل ہی ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے ۔ چنانچہ ہم زیبا کی غزل گوئی کا مبسوط جائزہ گذشتہ صفحات میں لے چکے ہیں ۔ اسی طرح ان کے کلیات میں ایسی شاعری بھی ملتی ہے جو ان کی مذہبی حس کی آئینہ دار ہے ۔ جیسے حمد ، نعت ، سلام ، مرثیہ اور منقبت وغیرہ ۔ اس کیلئے بھی ہم نے ایک باب مخصوص کیا ہے ۔ پھر یہ کہ زیبا نے مختلف موضوعات سے متعلق نظمیں مختلف شعری ہئیتوں اور صنفوں میں لکھ کر بھی داد سخن دی ہے ۔ ان کا جائزہ بھی ہم گذشتہ صفحات میں لے چکے ہیں ۔ لیکن ان کے کلیات میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو فرمائشی نوعیت کی ہیں ۔ ان کا دکا تخلیقات شعر کو ہم خالصتاً رسمی شاعری کی ذیل میں رکھ سکتے ہیں ۔ ایسی متفرق منظوم تحریروں کی تعداد بہت کم ہے ۔ لیکن زیبا کی شاعری کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک ہم ان متفرق منظومات پر بھی ایک نظر نہ ڈال لیں ۔

شاعری :

(1) سہرے کو ایک اعلی صنف سخن کی حیثیت تو مرزا غالب اور استاد ذوق کے زمانے ہی سے حاصل ہو چکی تھی کہ دونوں کے مابین ایک سہرا وجہ نزاع بن گیا تھا ۔ لیکن اس تنازع نے ادبی دنیا پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا اور اہل سخن نے سہرا گوئی کی جانب خصوصی توجہ صرف کی ۔ زیبا ناروی نے بھی " سہرے " لکھے ہیں ۔ جن میں سے راقمہ کو صرف دو دستیاب ہو سکے ہیں ۔ ذیل میں ہم ان سہروں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں ۔

ایک سہرا رومال پر چھپا ہوا ہے جیسا کہ قدیم زمانے میں رواج تھا کہ شاعر حضرات کسی کی شادی پر تحفے کے طور پر انہیں رومال پر رقم کیا ہوا سہرا بھیجتے تھے۔ زیبا نے بھی اسی روایت کے تحت یہ سہرا اپنے ایک دوست جگدیش پرشاد کی شادی کے موقع کی مناسبت سے لکھا جو سبزی منڈی دھلی میں 26 فروری 1944ء کو منعقد ہوئی ۔ اس کا آغاز یوں کرتے ہیں ۔

مسرت بن کر، محفل میں ضیا چھائی ہے سہرے کی

جدھر اٹھتی ہیں نظریں جلوہ آرائی ہے سہرے کی

اس کے بعد ماں باپ اور مختلف عزیز و اقارب کی دلی کیفیات کا بیان ہے جو اس تقریب میں خوشی و مسرت کا اظہار کر رہے ہیں ۔ سہرے کا منظر نہایت دلکش ہے ۔ سہرے کی خوشنما لڑیاں مبارک باد پیش کر رہی ہیں اور پیام زندگی کی ترجمان ہیں ۔

جگہ پائے نہ کیوں دولہا کے سر پر گندھ کے سہرے میں

وہ سربستہ کلی ، تقدیر جو لائی ہے سہرے کے ۔۔۔۔۔س

شاعر نے اپنے جذبات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس پورے ماحول کی عکاسی کر دی ہے ۔ آخری حصہ میں دعائیہ لہجہ ہے ۔ دولہا دلہن کو خوش رہنے کی دعا دی گئی ہے۔ سہرے کی لڑی سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور دل سے یہ صدا ہونٹوں تک آ رہی ہے۔

رہے سایہ مہا بیری ہمیشہ فرق نوشہ پر

دعا ہونٹوں پہ یہ اک اک کلی لائی ہے سہرے کی

یہ ایک فرمائشی سہرا ہے ۔ خود اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

خوشی ہے شاد صاحب کی تو زیبا حسب فرمائش

مناسب ہے لکھو سہرا گھڑی آئی ہے سہرے کی

یہ سہرا قطعہ کی ہئیت میں ہے ۔

(2) دوسرا سہرا زیبا نے 7 نومبر 1947ء کو منعقد ہونے والی اپنے عزیز گرامی پیر سید علی محمود گیلانی کی تقریب شادی کے لیے لکھا ۔ یہ تاریخی سہرا ہے اور مسدس ترکیب بند کی ہئیت میں لکھا گیا ہے ۔ سہرے کے ابتدا میں چار اشعار کا ایک قطعہ درج ہے جس میں دولہا دلہن کی خوشحالی کی دعا دی گئی ہے ۔

مائے قدرت کے اشارے مل گئے　　جگمگا کر ماہ پارے مل گئے

خوش رہیں دنیا میں یہ دولہا دلہن　　ملنے والے دو ستارے مل گئے

اس کے بعد پورا سہرا مسدس کی ہئیت میں ہے ۔ پہلے چاروں طرف چھائی ہوئی رنگ و نور کی برسات کا ذکر کرتے ہیں کہ گلستان تمنا میں بہار آگئی ہے ۔ پھول کھلے ہیں ۔ رحمت کی فراوانی ہے ۔ محفل کی جلوہ سامانیاں قابل دید ہیں ۔ یہ سماں اس لیے پیدا ہوا ہے کہ سہرے کا دن آیا ہے ، اور آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سایہ رحمت تلے سید محمود علی گیلانی دولہا بنے ہیں ۔ بزرگوں کی دعاؤں اور شفقتوں کا بیان ہے ۔ اس موقع کی ایک تصویر دیکھئیے ۔

خوشی کے راگ چھیڑے ہر طرف موجوں نے دریا میں　　مسرت کی ہوائیں جابجا رقصاں ہیں صحرا میں

بھرا رنگ طرب خود ساقی فطرت نے صہبا میں　　بہار معتبر آئی گلستان تمنا میں

نمایاں ہو گئے اسباب سب معقول سہرے کے

بصد انداز و رعنائی، کھلے ہیں پھول سہرے کے

ماں کی مسرت اور بھائی بہنوں کی خوشی دیدنی ہے ۔ سہرے کی لڑیوں سے ان سب کی محبت پھوٹ رہی ہے ۔

ادھر ماں کی نگاہوں میں تلی بیٹے کی رعنائی   ادھر وہ مسکراتی، روح پیر ذوالفقار آئی

حسن بھی حامد و اطہر بھی سو دل سے تماشائی   بہت مسرور ہیں دولہا کے یہ چھوٹے بڑے بھائی

بہار خلد منظر، آ بسی سہرے کی لڑیوں میں

محبت ہی محبت جھوم اٹھی سہرے کی لڑیوں میں

عزیز اقارب مبارکباد دینے اور اس محفل میں شرکت کرنے کتنے دور دور سے آئے ہیں ۔ یہ سماں ایسا پر کیف اور دلکش ہے کہ سبھی بے خود ہوئے جا رہے ہیں ۔ مبارکباد کا انداز اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے ۔

پکارے سب سر محفل یہ آزادی مبارک ہو   حیات نو کی یہ ارماں بھری وادی مبارک ہو

مبارک ہو مبارک خانہ آبادی مبارک ہو   بہم دولہا دولہن کو جلوہ شادی مبارک ہو

آخری شعر کے آخری مصرعے میں زیبا نے شادی کی تاریخ نکالی ہے ۔ یہ شعر یوں ہے ۔

کہا زیبا نے خوش ہو کر بتاریخ حسیں سہرا

رہے جان بیاں شادی خوشا مہرمبیں سہرا

1974 ء

ان سہروں کا جائزہ لینے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ زیبا ناروی سہرا کہنے کے فن سے بخوبی واقف تھے اور بوقت ضرورت اس صنف میں اپنے کمالات دکھا سکتے تھے ۔ ان سہروں میں تقریب عروسی کی بھر پور منظر نگاری کی گئی ہے ، اور فنی لوازمات سے کام لیا گیا ہے ۔ عمدہ تراکیب ، تشبیہہ و استعارہ اور صنائع بدائع کے استعمال سے ان کے حسن میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ تشبیہہ واستعارہ کی مثال دیکھئیے ۔

بزرگوں کی دعائیں پھول بن بن کر نمایاں ہیں
بمشکل ہر لڑی تیار ہو پائی ہے سہرے کی

بالکے قدرت کے اشارے مل گئے
جگمگا کر ماہ پارے مل گئے

تکرار لفظی سے کام لے کر سہروں میں ترنم کی کیفیت پیدا کی گئی ہے اور اس طرح ان سہروں کی خصوصیت یہ ہو گئی ہے کہ انہیں گایا بھی جا سکتا ہے ۔

ع نشاط زندگی ایک ایک انگڑائی ہے سہرے کی
ع بزرگوں کی دعائیں پھول بن بن کر نمایاں ہیں
ع ادھر اک اک نظر محفل میں شدائی ہے سہرے کی
ع مبارک ہو مبارک ہو گھڑی آئی ہے سہرے کی

صنعت جمع کا استعمال دیکھئیے ۔

چراغاں ، انجمن ، شادی ، تکلف ، دل کشی ، زینت
یہ ہر شان تماشا جذب انگڑائی ہے سہرے کی

رعایت لفظی کی مثال یہ ہے ۔

ـ۔ہ   وہ سہرا باندھ کر جگدیش پر شاد آئے محفل میں

تماشا بن کے اک دنیا تماشائی ہے سہرے کی

بحیثیت مجموعی ان سہروں میں اچھے سہروں کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔ جذبات نگاری سے ان میں تاثیر پیدا کی گئی ہے ۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسمی شاعری ، ہونے کے باوجود ان میں خلوص کی چاشنی اور جذبات کی شدت موجود ہے ۔

(3) زیبا ناروی نے ایک نظم بعنوان " لوٹا " بھی لکھی ہے ۔ یہ نظم بھی فرمائشی ہے ۔ اس کی ہئیت مربع کی ہے اور یہ نو بندوں پر مشتمل ہے ۔ اس میں لوٹے کی شکل و صورت ضرورت و اہمیت اور حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ آغاز میں بتایا ہے کہ کمہار کی مہارت کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے ۔ ایک صراحی بنا کر اور دوسرا لوٹے کی شکل میں ۔ اگرچہ دونوں مختلف چیزیں ہیں لیکن لوٹا اپنی فطرت میں کسی طرح بھی صراحی سے کم نہیں ہے ۔ صراحی کی جگہ میکدے میں ہے تو لوٹے کا مناسب مقام مسجد ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ہر طرف خدمت سر انجام دیتا نظر آتا ہے ۔ اس کے فیض کا دائرہ بے حد و حساب ہے ۔ یہ سب کا ساتھی ہے ۔ ہر ضرورت مند کا مدد گار ہے ۔ اسی لیے شاعر نے اسے ابوالفیض قرار دیا ہے ۔

جدھر دیکھو ادھر ہی بہر خدمت سر بخم لوٹا   ابوالفیض اس کو کہتے ہیں نہیں وسعت میں کم لوٹا

اسے غوطے کھلا دینا ، پلا دینا اسے پانی   غرض یہ ہے کہ رکھتا ہے زمانے میں بھرم لوٹا

اس کا تعلق کسی مخصوص خطے یا علاقے کے ساتھ نہیں ۔ اس کی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نہ دولت رام کا گڑوا نہ اگر وال کا لوٹا   نہ مفلس خان کی لٹیا نہ ہیرا لال کا لوٹا

وہ پرکھیں تو مرے دل کو وہ جانچیں تو مرے دل کو   نہ یہ پنجاب کا لوٹا نہ یہ بنگال کا لوٹا

لوٹے کے اثر و رسوخ کا ذکر کرتے ہوئے کئی مثالیں دیتے ہیں جس سے اس کی خدمات اور رسائی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ سفر و حضر میں کام آنے والا ہے ۔ اس نظم میں بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ بعض اصطلاحات جو اس زمانے میں رائج تھیں ، ان کی اہمیت کو لوٹے کی علامت کے ذریعے بیان کرتے ہیں ۔

نہ یہ لدھیانوی لوٹا نہ یہ امرتسری لوٹا   عبارت ہو گیا "لاہور کی جادو گری" لوٹا

قمر اجنالوی ، آواز دے دے کر یہ کہتے ہیں   صحافت آشنا ہو کر بنا ہے " نمبری " لوٹا

اسی طرح زیبا نے " لوٹے" کو خوشامد پسند لوگوں کی علامت بنایا ہے ۔ ایسے لوگ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق بدل جانے والے ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی خاص وضع یا نظریات نہیں ہوتے ۔ ان کا حال ویسا ہوتا ہے جیسا کہ حالی نے کہا ہے ۔

؎   چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

زیبا نے اسی قسم کی صورتحال کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے ۔

بڑا عیار ہے لوٹا بڑا مکار ہے لوٹا   مگر سچ پوچھئے تو ہر طرح ہشیار ہے لوٹا

میسر کیوں نہ ہو لوٹے کو ابن الوقت کی ڈگری   نہ بے پیندی کا بدھنا ہے نہ پیندی دار ہے لوٹا

آخر میں کہتے ہیں کہ " لوٹا " ایک اچھی بھلی ردیف بن گیا ہے اور شاعری کا درجہ اختیار کر گیا ہے ۔

نہ ٹوٹا قافیے کا ہے نہ بحر کج روی لوٹا   نظر آیا نگاہوں کو ردیف اچھی بھلی ، لوٹا

زیادہ اور اب لوٹے کی لٹیا کیا ڈبوئیں ہم   سخندانوں میں اے زیبا بنی ہے شاعری لوٹا

اس فکاہیہ نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موسیقیت اور روانی ہے ۔ عام فہم اور سادہ الفاظ ہیں جو ترنم میں رکاوٹ نہیں بنتے ۔ اندرونی قوافی سے بھی یہ وصف پیدا کیا گیا ہے ۔ تکرار الفاظ اور قوافی کا استعمال دیکھئے ۔

-- بڑا عیار ہے لوٹا ، بڑا مکار ہے لوٹا

-- وہ پہلے ڈھل گئی تھی بعد اس کے پھر ڈھلا لوٹا

-- ڈھیلے نے عجب حکمت سے ڈھالا برملا لوٹا

-- نہ یہ کم اپنی فطرت میں نہ وہ کم اپنی فطرت میں

اسی کا دور دورہ ہے سفر میں بھی حضر میں بھی

یہاں لوٹا وہاں لوٹا ادھر لوٹا ادھر لوٹا

الغرض یہ نظم اگرچہ کسی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے ، لیکن اپنے اسلوب اور انداز بیان کی بدولت پر تاثیر اور فنی خصوصیات سے مملو دلچسپ مزاحیہ فن پارہ بن گئی ہے ۔

نــثــر :
======

اگرچہ زیبا ناروی کی پہلی محبت ان کی شاعری ہے ۔ لیکن ایسا شاعر ہمیں تاریخ ادب میں مشکل ہی سے ملے گا جس نے شعر کے ساتھ نثر کو وسیلہ اظہار نہ بنایا ہو ۔ اور کچھ نہیں تو کم سے کم ادبی پیرائے میں لکھے گئے ایسے نجی خطوط تو ضرور مل جاتے ہیں جو اپنی ادبی شان کی وجہ سے ذاتی سے زیادہ اجتماعی دلچسپی کی چیز بن جاتے ہیں ، اور انہیں نجی ملکیت سے زیادہ اجتماعی ورثے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ خطوط کے علاوہ بھی اکثر شعراء کے ہاں تنقید و تبصرہ سے متعلق نثری تحریریں مل جاتی ہیں ۔ زیبا ناروی کا زیادہ تر کام اگرچہ نظم میں ہے لیکن ان کی بعض نثری تحریریں بھی ہمیں دستیاب ہوئی ہیں ۔ ہم یہ دعوی تو نہیں کر سکتے کہ زیبا نے محض اتنی ہی نثر لکھی جتنی ہمیں دستیاب ہوئی ہے، لیکن ہماری بہترین کوشش کے باوجود ان کی زیادہ نثری تحریریں نہیں مل سکیں ۔ ورنہ اس زیر تصنیف مقالے کی وساطت سے ہم انہیں منصۂ شہود پر لاسکتے تھے ۔ بہرحال متفرقات کی ذیل میں اب ہم ان کی دستیاب نثری کاوشوں کا سرسری سا جائزہ لیں گے ۔

نــثــر میں زیبا کے صرف دو نمونے مل سکے ہیں جن سے ان کی نثری صلاحیتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں ۔ وہ ایک عمدہ نثر نگار کی طرح نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ ان نمونوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر زیبا باقاعدہ طور پر نثر نگاری کو اپناتے تو ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ نثر نگار بھی کہلاتے ۔ لیکن ان کی نثری تحریریں

بہت کم ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں شاعری سے زیادہ دلچسپی تھی اور وہ تمام عمر اپنے اسی محبوب کے زلف و گیسو سنوارنے اور نکھارنے میں لگے رہے ۔ البتہ جب کبھی بھی انہوں نے نثر کی طرف توجہ کی تو اس میدان میں بھی کامیاب رہے ۔

زیبا کی پہلی تحریر جو ہمیں ملی ہے وہ " پیغام " کے عنوان سے رسالہ " عکس نو" کے شمارہ جنوری 1978ء کے نوح ناروی نمبر میں شائع ہوئی ۔ اس میں انہوں نے نوح ناروی کی یاد میں نکلنے والے خاص نمبر کے آغاز میں ایک پیغام کی صورت میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ نوح ناروی جو کہ داغ دہلوی کے اسکول کے آخری شاعر تھے ۔ انہوں نے داغ کی روایت کو غزل کے پیرائے میں آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا ۔ ان کی قدر و منزلت اپنے زمانے میں بھی بہت ہوئی اور آج تک ان کا نام اس حوالے سے زندہ ہے ۔ داغ کے مشن کو جس انداز سے انہوں نے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اس کی مثال اردو شاعری کے کسی دوسرے استاد کو نصیب نہیں ہوئی ۔ ان کی وفات سے بزم سخن ویران ہو کر رہ گی ہے۔ نوح ناروی کی یاد میں " سفینہ اردو پاکستان " کا قیام عمل میں آیا جس کے سرپرست زیبا ناروی تھے ۔

اکرم زیبائی ماہنامہ " عکس نو" کے مدیر تھے ۔ انہوں نے " عکس نو " کا " نوح نمبر " شائع کرنے کا ارادہ کیا جس میں تمام معروف اہل قلم نے بڑی وضاحت سے نوح ناروی کی حیات و فن پر مضامین لکھے ۔ اس کی مدیرہ اعلی بیگم حسن زمانی نے رسالے کے آغاز میں توضیحات بیان کیں ۔ مدیر اکرم زیبائی نے " ذرا آہستہ ساز دہنا " کے عنوان سے ، سید محمد نعمان فاضل جامعہ ازہر نے " ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کا مشن " کے عنوان سے

ابتدائی صفحات میں اپنے خیالات رقم کیے - جبکہ پروفیسر علامہ نیر واسطی اور زیبا ناروی

نے اپنے اپنے پیغامات تحریر کیے ہیں -

اس پیغام میں زیبا نے نوح ناروی کی عظمت ، شعری محاسن ، فضائل اور ان کی شاعرانہ خدمات کا بیان اختصار سے کیا ہے - اگرچہ یہ تحریر بہت مختصر ہے جو ان کے شاعرانہ افکار کی وسعت و ہمہ گیری کا احاطہ نہیں کر سکتی - تاہم زیبا نے بڑی جامعیت

سے ان کی ادب دوستی اور احباب سے ان کی شفقت و محبت کا تذکرہ ضرور کر دیا ہے -

جس سے نوح ناروی کے حیات و فن کی کئی پرتیں ہمارے سامنے آ گئی ہیں -

آغاز میں زیبا نے نوح ناروی کی وفات کو اردو شاعری کا ایک عظیم نقصان قرار دیا ہے

جسے شاعری کی تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی - ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا -

ان کے اشعار ہر دل کی دھڑکن بنے رہیں گے ، اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے -

اس پیغام میں زیبا نے نوح ناروی کی اردو زبان پر دسترس اور محاورات و روز مرہ

کے درست اور بہترین استعمال کی صلاحیت کی داد دی ہے - انہوں نے اردو زبان کی جو

بے تحاشا خدمات سر انجام دی ہیں ، اس کا اعتراف یوں کیا ہے -

" حضرت نوح ناروی مرحوم نے تقریباً ساٹھ ستر سال اردو زبان کی بے

نظیر خدمات انجام ہیں - مرحوم برصغیر میں جانشین داغ اور معاصرین

میں استاد وقت تسلیم کیے گئے ہیں - اردو زبان انہیں کبھی فراموش نہ

کر سکے گی - اردو سخن گوئی کی حدود میں اردو زبان کے رکھ رکھاو کا

سلسلہ انہیں کے دم تک مخصوص اور محدود نہیں رہا بلکہ حضرت موصوف

جیسے سر چشمہ فیض و کرم نے ریاض اردو میں ہزاروں نو نہال پروان چڑھائے

جو برصغیر پاک و ہند میں جگہ جگہ موجود نظر آتے ہیں اوراکثر تلامذہ

صاحب دیوان ہیں اور بعض کے کئی کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں ۔ بیشتر

کا شمار مشاہیر شعرائے اردو میں ہے" ۔

نوح ناروی سے دلی لگاؤ اور محبت کے زیر اثر ان کی رحلت پر جو دکھ زیبا کو پہنچا ہے اس کا اظہار لفظوں میں اس انداز سے کیا ہے کہ دل کا درد قلم سے ٹپکنے لگا ہے ۔ وفات کی خبر سنتے ہی ان کی جو حالت ہوئی اس کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

" میں ان دنوں کوئٹہ میں مقیم تھا کہ جب آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ اچانک

استاذی حضرت قبلہ کے سانحہ ارتحال کی روح فرسا خبر کانوں میں پڑی ۔

دل مضروب ہوا ، حواس مختل ہو گئے " ۔

آئندہ سطور میں اس بزم کا ذکر کرتے ہیں جس کا قیام نوح ناروی کی یاد میں عمل میں آیا ۔ اس انجمن کے تحت سال بہ سال نوح ناروی کی برسی پر سالانہ طرحی مشاعرہ منعقد کرکے تمام رات جاری رکھا جاتا تھا اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو مدعو کرکے ان کی یاد تازہ کی جاتی تھی ۔ زیبا اپنے پیغام میں اکرم زیبائی کو داد دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی لی اور اس شمارے کو یادگار بنایا ۔ ان کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں ۔

" مجھے مسرت ہے کہ اکرم صاحب نے "سفینۂ اردو پاکستان" کے بنیادی مقاصد

کو اس حد تک سراہا اور نوح نمبر ترتیب دے کر عملی طور پر نمایاں حصہ

لیا ہے ۔ رسمی طور پر نہیں بلکہ " نوح نمبر " کی اشاعت کے سلسلے

میں ان کی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے یہ میری دل کی آواز ہے کہ اللہ تعالی

ان کے ادبی ذوق میں آئے دن فراوانی عطا کرے اور اردو ادب کی دنیا

میں انہیں روز بہ روز نمایاں وقار بخشے" ۔

مدیر اعلی حسن زمانی کی ادب نوازی کی اہمیت یوں تسلیم کرتے ہیں ۔

" قابل قدر شخصیت محترمہ بیگم حسن زمانی عالمگیر کی یہ خصوصی توجہات

لائق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے بخلوص دل ماھنامہ ھذا کا نوح نمبر نکالنے

کی صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ ہر طرح کے تعاون سے نواز کر بہتر سے

سے بہتر اور معیاری نمبر شائع ہونے کی سعی فرما کر اپنی ادب دوستی کا

بلند پایہ ثبوت دیا ہے ۔ ان کی اردو نوازی اور ادب پروری دیکھ کر میں

یہ کہوں گا کہ اللھم زد فزدہ " ۔

آخر میں زیبا نے بیتے دنوں کی یادوں سے ذہن کے گوشوں کو منور کیا ہے ۔ وہ دن

جو انہوں نے نوح ناروی کے ساتھ گزارے اور جو حسین رفاقتیں انہیں میسر آئیں ۔ انہیں یاد

کرتے ہوئے ان کا دل بھر آتا ہے ۔ وہ ان کی شان میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں لیکن اس

خواہش کے باوجود انہیں اپنی عاجزی کا احساس ہوتا ہے ۔ اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ

ان کے شایان شان کچھ نہیں لکھ سکتے ۔

" قبلہ استاذی حضرت نوح ناروی مرحوم و مغفور کی وہ علم آموز توجہات اور

ان کی بزرگانہ نوازشات و شفقت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے سلسلے میں

ان کے وہ بے پناہ فیوض جن کے سائے میں میرا بچپن کھیلا ہے اور دیر تا دیر میرے ادبی ذوق کی زندگی کے لمحات گزرے ہیں، کبھی نہ بھلا سکوں گا ۔ بحیثیت ایک شفیق اور محترم بزرگ کے، ان کی کرم گستری اور میری کفش بردارانہ حیثیت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں بھی " نوح نمبر " کے لیے بصد عقیدت کوئی مقالہ سپرد قلم کروں لیکن جہاں تک میرے علم میں آ چکا ہے وہ یہی ہے کہ اہل قلم حضرات نے بڑی وضاحت سے حضرت مرحوم کی حیات کے ہر پہلو پر سیر حاصل مضامین لکھ دیے ہیں ۔ اگر میں بھی جرأت کروں تو یقیناً ان مضامین کی روشنی سے آگے نہ گزر سکوں گا " ۔

زیبا کی خواہش ہے کہ نوح ناروی کی تمام تر تخلیقات منظر عام پر آئیں اور قارئین کو محظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے داد سخن بھی حاصل کریں ۔ اس لیے وہ اپنے پیغام کے آخر میں اس بات کی تحریک دلاتے ہیں کہ نوح صاحب کے اہـل خانہ کو چاہئیے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ان کے کلام کو چھپوانے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں وہ خود اور ان کی انجمن بہ دل و جان اپنی بے لوث خدمات کے ساتھ حاضر ہیں ۔

" کاش کہ نوح ناروی کے موجودہ وارثین جلد از جلد حضرت مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام اور ان کی دیگر ادبی تخلیقات کو شائع کرنے کی سبیل اختیار فرمائیں تاکہ دلدادگان اردو ادب کو کلام نوح سے لطف اندوز ہونے اور استفادہ کرنے کا مزید موقع حاصل ہو سکے " ۔

اس " پیغام " کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زیبا کو اپنے استاد سے بہت زیادہ عقیدت و الفت تھی ۔ وہ ان کے غم میں دل فگار اور ان کی یاد میں پریشان حال تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار اس ناقابل تلافی نقصان پر آنسو بہاتے اور آہیں بھرتے تھے ۔ چنانچہ اپنی تحریر میں بار بار استاد ذی وقار، قبلہ استاذی کے الفاظ لاتے ہیں جن سے ان کا احترام عیاں ہوتا ہے ۔ انہیں یقین ہے کہ ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں ۔

" نا خدائے سخن ، تاج الشعراء ، فصیح العصر حضرت نوح ناروی کو اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ خون کے آنسوں بہا بہا کر یاد کرتی رہے گی ۔ خاص و خواص اور عام و عوام میں رہتی دنیا تک اسی پر خلوص احترام سے حضرت نوح ناروی کا تذکرہ زندہ و تابندہ رہے گا جس طرح کہ آج ہے " ۔[1]

زیبا ناروی کا دوسرا مضمون ایک تعارف ہے جو مولانا اعجاز الدین احمد عرفان رشدی کی کتاب " معرکہ " حق و باطل (6 ستمبر 1965ء) و غزوۃ الھند " کیلئے لکھا گیا ، اور اس میں شامل ہے ۔ کتاب کے مصنف نے 1965ء کی جنگ سے متعلق واقعات کو اس میں یکجا کیا ہے ۔ زیبا نے اس کا تعارف لکھتے ہوئے مصنف کے کمال اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، اور ان کی اس کوشش پر مصنف کی تعریف کی ہے ۔ سب سے پہلے تو زیبا نے مصنف سے اپنے گہرے مراسم کا ذکر کیا ہے ۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ زیبا ایک روحانی سلسلے سے منسلک تھے اور عرفان رشدی صاحب ان کے استاد نوح ناروی کے پیر بھائی تھے ۔

اور اس حوالے سے بھی زیبا کا ان سے قریبی تعلق تھا ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" معرکہ حق و باطل کے مصنف الشیخ مولانا اعجاز الدین احمد عرفان رشدی (داعی مجلس علمائے پاکستان لاہور) میرے دیرینہ کرم فرما ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر استاد ذی قبلہ حضرت نوح ناروی رحمتہ اللہ علیہ کے پیر بھائی بھی ہیں اور میرے لیے واجب الاحترام " ۔

اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ زیبا نے نہایت مہارت کے ساتھ کتاب کا مکمل مضمون چند سطور میں بیان کر دیا ہے ، اور مجموعی خصوصیات کو چند لفظوں میں ادا کر دیا ہے ۔ ہم پوری کتاب پڑھے بغیر بھی محض اسی تعارف سے یہ جان لیتے ہیں کہ کتاب کا موضوع اور مقصد کیا ہے ۔ اس سے زیبا کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر یہ عبارت دیکھئے ۔

" نظم ، معرکہ ، حق و باطل ، مولانائے مکرم کی تازہ تخلیق ہے جس میں کشمیر کے حالیہ جدال و قتال ، مجاہدین کے جذبہ جہاد اور 6 ستمبر 1965ء سے 23 ستمبر 1965ء تک سترہ یوم کی پاک بھارت جنگ کے ہر محاذ کا واقعاتی نقشہ کھینچ دیا گیا ہے ۔ اردو زبان کے سادہ سادہ لفظوں میں یہ برجستہ نظم موصوف کے قلبی جذبات اور صحیح صحیح حالیہ جنگ کے واقعات کی مکمل آئینہ دار ہے ۔ پاکستان کی بری ، بحری ، فضائی افواج کے بہادرانہ اور فاتحانہ کارناموں ، شہیدان وطن ، مجاہدین کشمیر اور ملک و قوم کے دلیر

و مستند پاسبانی کا مختصر سا جیتا جاگتا تاریخی مرقع ہے" ۔

انہوں نے صرف کتاب کے بارے میں ہی اپنی آراء نہیں دیں بلکہ مصنف کے اخلاق و عادات اور مصروفیات کا تذکرہ بھی کیا ہے ۔ شعر و سخن سے ان کی دلچسپی اور شعری محافل سے بچنے کے انداز کا ذکر کیا ہے ۔ اس طرح ہم ان کی شخصیت کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیتے ہیں ۔

" موصوف کو زمانہ دراز سے شعر گوئی پر بھی قابل ذکر دسترس ہے۔ قیام دھلی کے زمانے میں آپ نے شعر و سخن کے سلسلے میں جناب محترم نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دھلوی مرحوم سے استفادہ کیا ہے ۔ اشعار ہر رنگ میں کہتے ہیں اور گروہ بند شعراء کے جمگھٹوں سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں ۔ فرداً فرداً ملاقاتیں (جس میں جگر مرحوم بھی شامل تھے) برسبیل اخلاص جاری رہتی ہیں ۔ مگر آپ اپنی حد تک خلوت گزیں ، اور عجز و انکسار کے عامل و حامل ہیں " ۔

زیبا ناروی کے دونوں مضامین ان کی تنقیدی صلاحیتوں اور شاعرانہ اسلوب کے عکاس ہیں۔ زیبا بے پناہ شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان کے جوہر ان کی شاعری میں کھل کر سامنے آتے ہیں ۔ لیکن ان کی نثر بھی گونا گوں خوبیوں کی حامل ہے ۔ وہ نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بننے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے ۔ ان کے مضامین سے ان کا اسلوب عیاں ہے کہ وہ سادگی اور سلاست کو مد نظر رکھتے تھے ۔ مشکل الفاظ و تراکیب سے احتراز کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ۔ البتہ کہیں کہیں شاعرانہ ذوق سے کام لیتے ہوئے ۔ مشکل

عبارت بھی لکھ جاتے ھیں ۔ لیکن اس کو بھی زیادہ دقیق نہیں بناتے ۔ " پیغام " میں ایک جگہ لکھتے ھیں ۔

" اردو زبان میں شعر و شاعری کے اعتبار سے آج کا ماحول کچھ بھی سہی ، مگر وہ وقت بھی کچھ دور نہیں کہ جب حال کی حاضر بھول بھلیاں انہدام پذیر ھوں گی ، اور ارباب نقد و نظر اردو زبان کے محاورات اور صحیح اصطلاحات کے بر محل استعمال کی تصدیق و تحقیق کیلئے متاخرین میں سے داغ و میر ، جلال وسنیر ، انیس و دبیر جیسے نابغہ روزگار مرحومین کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ حضرت نوح ناروی کے سفینۂ طوفان اور اعجاز نوح جیسے نادر نسخے بھی سرفہرست لائیں گے " ۔

تعارف میں لکھتے ھیں :۔

" رئیس ابن رئیس ھونے کے باوجود مولانائے موصوف زہد و اتقاء کی قابل تقلید حیات و کردار کے حامل ھیں ۔ موصوف کے تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب ، ریاضت و مجاھدہ اور درویشانہ زندگی پر کوئی بحث اس وقت بے محل ھو گی ۔ البتہ یہ بات مختصراً ضرور کہوں گا کہ علوم دینیہ کی ترویج ترقی کیلئے عرصۂ دراز سے ھمہ تن مصروف عمل ھیں ۔ بحمداللہ کہ اپنی اس دینی الی اللہ کوشش کے نتیجے میں اپنے اور صرف اپنے بل بوتے پر بفضلہ تعالے دارالعلوم دینیہ جامعہ عرفانیہ ، 1087 نئی بلڈنگ انار کلی لاھور کے قائم اور جاری رکھنے میں نمایاں طور پر کامیاب ھیں ، جہاں سے طالبان علم دین و حق شب وروز کامل طور

پر فیض یاب ہو رہے ہیں" ۔

زیبا کی نثر ان کی شاعری سے ہم آہنگ ہے ۔ ان کا انداز و اسلوب رنگین و دلکش ہے ۔ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے ۔ اس لیے نثر لکھتے لکھتے کہیں شاعرانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں ۔ زیبا نے کہیں کہیں ہم قافیہ الفاظ ، عمدہ تراکیب ، خوبصورت تشبیہات کے ذریعے اپنی نثر میں دل آویزی اور شعریت کی شان پیدا کی ہے ۔ ان کی نثر میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں ۔ مثلاً

" خانوادہ گل کا وہ روشن چراغ گل ہو گیا ہے جو دنیائے اردو ادب میں مقبول ترین اسلوب بیان اور اردو شعر گوئی میں حضرت داغ دہلوی مرحوم کے تمام اوصاف سخن طرازی کا حقیقی آئینہ دار تھا" ۔

اس کے علاوہ زیبا کہیں کہیں عربی الفاظ سے بھی اپنی تحریروں کو سجاتے ہیں ۔

غرض یہ کہ زیبا کی نثر سادہ الفاظ اور شاعرانہ وسائل کی آمیزش کی آئینہ دار ہے ۔ وہ قارئین کو الجھانے کی غرض سے مشکل تراکیب و بھاری بھرکم الفاظ استعمال میں نہیں لاتے بلکہ عام اور سیدھے سادے لفظوں میں اپنا مدعا بیان کر دیتے ہیں ۔ اس کے باوجود ان کی نثر دلفریب ہے ۔ عہد حاضر میں بھی تنقید و تحقیق اور معلوماتی مضامین کیلئے علمی اور سادہ پیرایہ بیان کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ۔ اس لحاظ سے بھی زیبا ناروی کی نثر ان کے مزاج کی عکاس اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہے ۔

باب ششم :

زیبا کا ادبی مقام و مرتبہ

ادب جذبات و کیفیات، احساسات و تاثرات اور افکار و خیالات کے اس دل پذیر پیرائے کو کہتے ھیں جو قاری کو حصار میں لے کر اپنے سحر میں مبتلا کر دے ۔ یہ خصوصیت ادب کی ھر شکل میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ھے۔ لیکن یہ بات تسلیم شدہ ھے کہ بہترین ادبی پیرایہ شاعری ھے ۔ شعر میں لفظوں کی دروبست، تشبیہہ و استعارہ کی ندرت، علامتوں کی تازگی، آھنگ کی دلفریبی اور ایمائی لب و لہجہ ایسی لطافت پیدا کر دیتا ھے کہ اس کے پائے تک نثر کا پہنچنا دشوار ھے، لیکن ھر شاعر شعر کو اس عظمت سے ھمکنار کرنے سے قاصر رھتا ھے۔ یہ مقام کسی کسی کو حاصل ھوتا ھے، لیکن ایسے بھی شاعر ھر دور میں پیدا ھوتے ھیں جو عظمت سے ھمکنار نہ ھونے کے باوصف درخور اعتنا ھوتے ھیں اور انہیں کسی نہ کسی حوالے سے اھمیت دینی پڑتی ھے، اور یہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ھوتے ۔

شاعری ایک ایسا فن ھے جو اکثر لوگوں کو احساس عظمت(SUPERIORITY COMPLEX) میں مبتلا کر دیتا ھے ۔ ھر عہد میں اکثر شاعر تعلّی کرتے ھوئے بلند بانگ دعوے کرتے ھیں، لیکن ان میں سے بہت سے شاعر ایسے ھوتے ھیں جو تاریخ ادب میں اپنا نام بھی محفوظ کرانے کی اھلیت نہیں رکھتے ۔ جبکہ بعض شاعر ایسے بھی نکل آتے ھیں جنہیں تاریخ ادب میں چند سطریں مل جاتی ھیں ۔ جہاں تک عظیم شعراء کا تعلق ھے یا ایسے شعراء کہ جو تاریخ ساز اھمیت رکھتے ھوں بہت کم بلکہ نادر الوجود ھوتے ھیں ۔

جہاں تک عظمت کا تعلق ہے یہ کسی فارمولے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا کوئی اساسی معیار قائم کرنا دشوار ہے ۔ بعض لوگ روایت کی پابندی اور پاسداری یا دوسرے لفظوں میں کلاسیکیت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں جبکہ بعض لوگ روایت شکنی اور انفرادیت یا دوسرے لفظوں میں رومانیت کو ضروری خیال کرتے ہیں اور بعض دونوں کے امتزاج کو عظمت کا معیار گردانتے ہیں ، لیکن سچی بات یہ ہے کہ عظمت کو کسی ایک حوالے سے جانچا نہیں جا سکتا ۔ یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو وقت کے سیل بے اماں میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے والوں اور پھر اس سے نئی راہیں دکھانے والوں کے حصے میں آتی ہے ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو زیبا ناروی کا شمار ایسے شعراء میں کرنا ممکن نہیں جو عظمت کی سند کے حقدار اور سزا وار ٹھہرتے ہیں ۔ البتہ وہ ایسے شاعر بھی نہیں ہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے اور تاریخ ادب ان کے ذکر سے خالی رہے ۔ وہ ایک اچھے اور عمدہ روایتی شاعر ہیں۔ اردو کے سربر آوردہ شاعروں کی صف اول میں نہیں تو دوسری صف میں ضرور انہیں شامل سمجھا جا سکتا ہے ، اور اگر کسی خاص اسکول کے حوالے سے انہیں جانچا جائے تو دبستان داغ کے شعراء میں ان کا شمار پہلی قطار ہی میں ہو گا ، بلکہ یہی وہ شاعر ہیں جو دبستان داغ کا آخری روشن چراغ تھے ۔

اردو کی قدیم شعری روایتوں میں ایک روایت اصلاح شاعری کی بھی ہے ۔غالباً اسی روایت کی وجہ سے اردو شاعری میں خاص دبستان پیدا ہوئے ۔ اکثر شاگرد اپنے اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے مخصوص شعری روایت کی پاسداری کرتے تھے اور یوں کسی خاص

دبستان کی زنجیر سی بنتی چلی جاتی تھی ۔ زیبا ناروی نوح ناروی کے حوالے سے داغ دہلوی کی قائم کردہ شعری روایت کے امین تھے ۔ ان کی شاعری میں ان کی انفرادیت کا بھر پور اظہار نہیں ملتا بلکہ ان کی شاعری مخصوص دبستان اور مخصوص روایت کی آئینہ دار ہے ۔ ان معنوں میں ہم زیبا ناروی کو ایک روایتی شاعر کے طور پر ہی تسلیم کر سکتے ہیں ۔ لیکن محض روایتی نہیں بلکہ ایک مخصوص روایت میں کسی حد تک اپنا انفرادی رنگ بھر کے اس میں تازگی پیدا کرنے والا شاعر۔

وقت کا دھارا ہر شے میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے ۔ بقول اقبال ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

شاعری بھی اس جبر سے آزاد نہیں ۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے ۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ ماضی میں تغیرات کی رفتار اتنی تیز نہ تھی ، جتنی موجودہ صدی میں ہے۔ اردو کی شعری روایت کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے ۔ اس دوران میں اردو شاعری نے بہت سی کروٹیں بدلیں ، اور فکری ، فنی اور لسانی سطح پر بہت سی انقلابی تبدیلیوں سے دو چار ہوئی ۔ اور مختلف زبانوں اور ان کے ادب سے اکتساب کیا لیکن اردو شاعری صحیح معنوں میں 1857ء کے بعد زیادہ تبدیلیوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہوئی ۔ یہ تبدیلیاں مخصوص سیاسی و سماجی حالات کی مرہون منت ہیں ۔ ان تبدیلیوں میں بیسویں صدی کے آغاز ہی سے بہت سرعت پیدا ہو گئی اور اس کی وجہ معاشی ، مذہبی سیاسی اور سائنسی انقلابات ہیں ۔ اس صدی میں اردو شاعری کو مشرق وسطی اور

ایشیا کے ملکوں کے ساتھ ساتھ دوسرے براعظموں خصوصاً یورپ اور امریکہ کے ادب نے بھی متاثر کیا ، اور یوں ہمارے ہاں بعض دوسری اصناف بھی آئیں جس میں فرانس کے زیر اثر نثری نظم اور جاپان کے زیر اثر ہائیکو شامل ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری دور بہ دور کئی رجحانات سے متاثر ہوئی اور اس میں فکر و خیال اور ہئیت و اسلوب کے اعتبار سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ عصر حاضر میں انہیں تبدیلیوں کی وجہ سے بالعموم کلاسیکی روایت سے انحراف برتا گیا اور انفرادیت پر زور دیا گیا ۔ یوں شاعری میں نئے نئے موڑ اور نئے نئے رجحان آئے ۔ لیکن اسی دور میں خاص طور سے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش بھی ہوئیں اور یوں روایت کو رد کرنے کے بجائے محفوظ کرنے کا سامان کیا گیا ۔جگر مراد آبادی یا اصغر گونڈوی ، حسرت موہانی یا عزیز لکھنوی یہ وہ شعراء ہیں جنہوں نے متعدد انفرادی آوازوں میں روایت کی آواز کو برقرار رکھا ، اور اس کے زندہ عناصر کو قبول کرتے ہوئے انفرادی تجربات سے رنگ آمیزی کی ۔ ان شعراء کو ہم رجحان ساز قرار نہیں دے سکتے ۔ لیکن یہ خدمت بھی کم نہیں کہ انہوں نے روایت کو قصۂ پارینہ بنانے کے بجائے اسے محفوظ اور زندہ رکھا ۔ عظمت ان کے حصے میں آئی یا نہیں ، اتنا ضرور ہوا کہ عظیم شعری ورثہ ضائع ہونے سے محفوظ رہا ، اور انہوں نے یہ سلیقہ دیا کہ عصر حاضر میں بھی روایتی موضوعات کو روایتی سانچوں میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان میں رجعت و قدامت کے بجائے ندرت اور تازگی محسوس ہو ۔ زیبا ناروی بھی ایسے

ہی شاعر ہیں ۔ انہوں نے روایت کی پابندی کرتے ہوئے داغ اور دبستان داغ کے
شعراء کی روایت کو ملحوظ رکھا اور اس میں گرانقدر اضافے کیے ، اور یہ دکھایا کہ
زبان و بیان کا معیار کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے ۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نئی شعری ہئیتیں نئے شعری تجربات کیلئے
ناگزیر ہوتی ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ نئی شراب پرانے جام میں بھی پیش کی
جا سکتی ہے ۔ یعنی عظیم اور کلاسیکی شعری ہئیتوں میں نئے مضامین بیان کیے جا
سکتے ہیں ۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں ،
لیکن جو لوگ خاص طور سے روایت کے ساتھ وابستہ ہوئے ان لوگوں نے نہ جام نئے استعمال
کیے اور نہ شراب ۔ ان کے ہاں روایتی سانچوں میں روایتی موضوعات ہیں ۔ ظاہر ہے
کہ اس اعتبار سے وہ شاعر وقت سے پیچھے ہیں ، لیکن ان کا موقف یہ ہے کہ موضوعات
اور خیالات نئے نہیں ہوتے بلکہ انہیں پیش کرنے کا اسلوب یا طریقہ نیا ہوتا ہے ۔ یہ
بات اپنے طور پر اختلافی ہے لیکن بہرحال موضوع اور ہئیت کے لحاظ سے کلاسیکی روایت
کی پابندی کرنے والے شاعر بھی اسلوب میں تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔
جب ہم بہ اعتبار صنف و ہئیت زیبا ناروی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے
ہیں کہ انہوں نے صرف کلاسیکی ، روایتی شعری ہئیتوں اور صنفوں کو اپنایا ۔ ان کے
ہاں رباعی ، قطعہ ، مخمس ، مسدس ، قصیدہ ، مرثیہ ، سلام ، مثنوی اور سب سے
بڑھ کر غزل کی شاعری ملتی ہے ۔ لیکن ان کے وسیع شعری سرمائے میں معری نظم ، آزاد
نظم ، سانیٹ یا اسٹینزا کی ایک بھی مثال موجود نہیں ہے ۔ گویا انہوں نے کسی جدید

شعری ہئیت میں شاعری نہیں کی ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں ایک اچھا شعری معیار ملتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زیبا علم عروض سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے علم صنائع بدائع کو پوری طرح نبھایا ہے ۔ مگر ان کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان تمام شعری محاسن کو اس طرح نبھایا ہے کہ کہیں بھی بناوٹ یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ بے ساختہ اظہار بیان ملتا ہے ۔ جس سے ان کے اشعار میں فطری پن نظر آتا ہے، اور شعری محاسن اشعار کے اندر اس طرح پوشیدہ ملتے ہیں کہ بغیر اپنے وجود کا احساس دلائے ۔ آہنگ و ترنم کی لے پیدا کرکے قاری کے دل کو براہ راست متاثر کرتے ہیں ۔ مطلوب احمد مطلوب لکھتے ہیں :۔

" جہاں تک حضرت زیبا ناروی کی شاعری کا تعلق ہے ان کے کلام میں نکتہ دانی ، معنی شناسی ، ربط اور مناسبت فطری اس پایہ کی ہے کہ نثر اور انشاء کے معنی طراز، سخن سنج اور نکتہ پرداز لوگ ان کی تعلیم و ارشاد کے فیض سے مستفید ہوتے ہیں ۔ آپ کے شعروں میں ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی ، مصرعوں کی ہمواری، مطالب کا اختصار اور دلنشین ترکیبیں ، سلاست و بلاغت نہایت حیرت انگیز ہیں ۔ آپ شعر سہل ممتنع میں کہتے تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نادر الکلام اور قادر البیان شاعر تھے"۔[1]

1۔ مطلوب احمد نے اپنے غیر مطبوعہ مقالے میں جو زیبا ناروی کی پہلی برسی کے موقع پر پڑھا گیا ، ان خیالات کا اظہار کیا ۔

زیبا ناروی کا شمار بیسویں صدی کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو شاعری میں روایت کو ساتھ لے کر چلے اور اسے پروان چڑھایا ۔ زیبا ہمہ گیر شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ۔ وہ کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں رہے مرثیہ ہو یا مثنوی ، سلام ہو یا منقبت، حمد ہو یا نعت ہر ایک صنف میں اپنا منفرد رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ خصوصاً غزل اور نعت میں ان کا فن عروج پر ملتا ہے ۔ ان کی نعتیں ان کے عشق رسولؐ کی شدت کو ظاہر کرتی ہیں ۔ تاہم ان کی نمایاں حیثیت غزل گو کی ہے ۔ غزل میں انہوں نے دوسری اصناف کی نسبت بہت زیادہ سرمایہ چھوڑا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے ان کا پورا کلام مطبوعہ نہیں ہے بلکہ بہت ہی کم طبع ہوا ہے ، جس کی وجہ سے نئی نسل زیادہ تر ان سے ناواقف ہے، اور اردو ادب بھی زیادہ استفادہ نہیں کر سکا ۔ ورنہ کلاسیکی شاعری میں داغ کی روایت کو اپنانے والے شعراء میں وہ نوح ناروی کے بعد سب سے اہم شاعر ہیں ۔

کلاسیکی شاعری کی جان غزل کو سمجھا جاتا ہے اور غزل ہی میں زیبا کی زیادہ تر شاعری پائی جاتی ہے ۔ یہ غزل کلاسیکی لب و لہجہ کی حامل ہے، اور اس میں دبستان داغ کی پیروی کی گئی ہے ۔ لیکن دبستان داغ میں معاملہ بندی کے اشعار کے ضمن میں جس جنسی تشنگی کا اظہار ملتا ہے وہ زیبا کے ہاں مفقود ہے، اور یہ ان کی پاکیزہ شخصیت کا اثر ہے ۔ موضوعات حسن و عشق ، تصوف اور رندی و سرمستی کے حوالے سے اور زبان و بیان کے اعتبار سے زیبا کی غزل اور دوسری شاعری بھی دبستان

داغ کی روایت کی پاسداری کرتی ھے لیکن ان کی شخصیت کا عکس اس میں بھی نظر آتا ھے کہ ان کی غزل کی فضا نسبتاً بہت پاکیزہ اور منزّہ ھے اور ان کے ھاں کھل کھیلنے کا انداز بالکل نہیں ھے ۔ گویا زیبا کی غزل کلاسیکی روایت کا ایک عمدہ نمونہ ھے ۔ زیبا کی شاعری کے متعلق رائے دیتے ھوئے قمر اجنالوی کہتے ھیں :-

" زیبا ناروی ھندوستان کے چند بڑے اور اعلی پائے کے شاعروں میں سے ایک تھے ۔ پرانی طرز کے غزل گو شاعر تھے ۔ ان کا انداز روایتی تھا لیکن وہ فنی طور پر بہت منجھے ھوئے شاعر تھے" 1۔

موضوعات کے اعتبار سے زیبا کی شاعری کا غالب رجحان اگرچہ روایتی ھے لیکن اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا ھونا درست نہیں ھو گا کہ زیبا اپنے عہد کے آشوب سے آنکھیں بند کیے ھوئے تھے ۔ ان کے کلیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھلتی ھے کہ انہوں نے اپنے عہد کے فرد اور اجتماع کے آشوب کو بھی محسوس کیا اور کہیں کہیں اس کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ۔

زیبا کی انفرادیت یہ ھے کہ انہوں نے نہ صرف روایتی موضوعات کو اپنایا بلکہ روایت میں تازگی بھی پیدا کی اور روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ شاعری میں ایک حد تک عصری شعور کو بھی سمویا ۔ چنانچہ ایک طرف تو ھم ان کی شاعری میں روایتی مضامین عشق و عاشقی ، گل و بلبل کا افسانہ، عشق حقیقی کا بیان اور معاملہ بندی

1۔ قمر اجنالوی سے راقمہ کی ملاقات اور ان کا بیان ۔

وغیرہ کا ذکر دیکھتے ھیں تو دوسری طرف ھجرت کا دکھ، جدید دور میں پیدا ھونے والے انسانی مسائل، مثلاً طبقاتی ناھمواری، خلوص کی کمی وغیرہ کا بیان بھی ملتا ھے - یوں ان کی شاعری سے روایت میں دلچسپی لینے والے اور جدید دور کے مسائل میں دلچسپی لینے والے دونوں ھی قسم کے قارئین لطف اندوز ھو سکتے ھیں - اگرچہ انہوں نے داغ کی روایت کو اپنایا اس کے باوجود ابتذال اور عامیانہ پن کی سطح پر نہیں اترے بلکہ ان کی معاملہ بندی میں بھی پاکیزگی اور وقار ھے - جس کی وجہ سے ان کی شاعری انسان کو مثبت ذھنی و روحانی تسکین پہنچاتی ھے -

موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری کا غالب حصہ عاشقانہ اور تصوفانہ ھے - پھر کچھ ایسے موضوعات بھی ھیں جو ان کی مذھبی اور اخلاقی حس کے آئینہ دار ھیں، اور ھم یہ محسوس کرتے ھیں کہ انہوں نے جدید عہد کے معاشی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کے بارے میں بہت کم سوچا اور لکھا ھے اور اس لحاظ سے ان کی شاعری میں عصری شعور کی کمی نے ان کی شعری اھمیت کم کی ھے - لیکن یہ کہنا از روئے انصاف درست نہ ھوگا کہ ان کا دامن ان مسائل سے یکسر لہتی ھے - عصری مسائل ان کے ھاں کم ضرور ھیں مفقود نہیں - انہوں نے غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق سے لے کر فلسفۂ زندگی، بے ثباتی، دنیا اور دیگر موضوعات کو بڑی خوبی سے اپنی غزل میں سمویا ھے - اتنے رنگا رنگ موضوعات کے ھونے سے ان کی غزل ایک ایسا نگار خانہ بن گئی ھے جس میں شوخی ھے، تنوع ھے اور دلپذیری ھے - زیبا روایت

کے زندہ عناصر کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وحید خیال کا کہنا ہے :۔

"اپنے استاد حضرت نوح ناروی کی طرح زیبا مرحوم کا کلام بھی ماضی کے مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہی عاشقانہ مضامین، وہی جذباتی باتیں وہی رنگا رنگ شوخ الفاظ، غرضیکہ وہ اپنے رنگ کے استاد تھے"[1]۔

زیبا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کسی صنف کو ان چھوا نہیں چھوڑا۔ جس صنف کو بھی اپنایا، اس میں حسن و رعنائی کے عناصر پیدا کر دیے ہیں۔ یقیناً یہ زیبا کے وسعت مطالعہ اور افکار و مشاہدہ اور بلندی خیال کی شاہد ہیں، اور یہی چیزیں انہیں تادیر زندہ رکھنے کی ضامن ہیں۔

زیبا نے دیگر موضوعات پر نظم نگاری کرنے کے ساتھ ساتھ وطن سے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ زیبا فوج سے وابستہ تھے اور خاص کر پاکستان سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وطن اور وطن کے سپاہیوں کیلئے بے شمار اشعار لکھے ہیں۔ ان کی شاعری کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں تھی۔ انہوں نے کسی تحریک یا نظریے کے تحت شاعری نہیں کی بلکہ ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر شاعری کی خدمت سرانجام دی۔ ان کی وابستگی صرف دین اسلام سے تھی۔ انہوں نے کسی ایک موضوع کے گرد خیالات کا حصار قائم نہیں کیا بلکہ زندگی کا بھرپور مشاہدہ کرنے کے بعد اپنی شاعری میں ان تجربات و کیفیات کو پیش کر دیا ہے۔

1۔ یہ باتیں وحید خیال نے ایک غیر مطبوعہ مقالے کی صورت میں لکھ کر راقمہ کو بھیجیں۔

شاعری میں زبان و بیان کی بہت اہمیت ہے بلکہ بعض لوگ تو زیادہ اہمیت دیتے ہی زبان و بیان کو ہیں ۔ شعر میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں ۔ ایک خیال اور دوسرے الفاظ ۔ خیال تو کسی بھی شخص کو سوجھ سکتا ہے لیکن اسے مناسب الفاظ میں ادا کرنا اصل کمال رکھتا ہے ۔ ابن خلدون نے اسی لیے کہا ہے کہ الفاظ کی حیثیت پیالے اور معانی کی حیثیت پانی کی سی ہے ۔ پانی کو خواہ سونے کے پیالے میں ڈال دیں یا مٹی کے، اس کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا ۔ لیکن سونے کے پیالے میں اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح سے مناسب اور موزوں الفاظ کے استعمال سے شعر کی تاثیر بڑھ جاتی ہے اور نا مناسب اظہار اسے بے وقعت بنا دیتا ہے ۔ گویا شاعر کو جب تک الفاظ کے انتخاب اور ادائیگی پر کامل دسترس نہیں ہوتی ، وہ اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے ۔ اسی لیے بہتر انداز بیان کو شاعری کیلئے بہت ضروری خیال کیا گیا ہے ۔ دراصل جذبات و احساسات سے کوئی شخص بھی عاری نہیں ہوتا ، لیکن ان کا موثر اظہار کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ۔ گویا شاعری میں موثر زبان کی بہت اہمیت ہے ۔ الفاظ کا فنکارانہ استعمال مختلف معنوی پرتیں پیدا کرنے اور رمزیت و ایمائیت کی خصوصیت لانے کا باعث بنتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے شاعری لغت سازی کا بھی بہترین وسیلہ بنتی ہے ۔ آج کل زبان کے معیار پر ٹھیک طرح سے توجہ نہیں دی جا رہی اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ نئے نئے موضوعات اور مضامین زبان میں وسعت کے متقاضی ہوتے ہیں ۔ اس لیے روایتی لسانی ڈھانچے توڑنے کی ضرورت ہے ۔ قدیم

روایت میں زبان و بیان کے حوالے سے روز مرہ، محاورہ، فصاحت، بلاغت وغیرہ کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا ۔ لیکن عصر حاضر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ روایتی لسانی سانچے جدید افکار و خیالات کے لحاظ سے ناکافی ہیں ۔ پھر اس دور میں لفظی اور صوتی حسن کی بجائے خیال پر زور دیا جاتا ہے ۔ یوں زبان کے جمالیاتی تقاضوں کو کم اہمیت دی جاتی ہے ۔ لیکن کلاسیکی روایت میں جمالیاتی حوالے سے شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے زبان و بیان کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی ۔ خاص طور سے بعض شاعر اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں ۔ ناسخ، ذوق اور داغ نے روز مرہ اور محاورہ کا التزام کرنا ضروری سمجھا ۔ اور زبان و بیان کا ایک خاص معیار قائم کیا جسے استادان فن نے تسلیم کیا ہے ۔ داغ کو اپنی زبان دانی پر بہت ناز تھا ۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے ۔۔۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

زبان کی یہی چاشنی داغ کے بعض شاگردوں خصوصاً نوح ناروی کے کلام میں پائی جاتی ہے ، اور زیبا ناروی جو نوح ناروی کے صحیح جانشین تھے ۔ وہ بھی زبان و بیان کی اس روایت کو قائم رکھتے ہیں ۔ نصرت قریشی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :۔

" ان کے رنگ سخن کے سلسلے میں اگر صرف اتنا تحریر کر دیا جائے کہ وہ نوح ناروی کے انداز بیان سے بہت حد تک مشابہ ہے تو قطعی درست ہو گا ۔ ان کے یہاں وہی سلیس و بامحاورہ زبان ہے اور وہی

تراکیب و دروبست الفاظ ہے جو نوح صاحب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ وہ زبان کی درستگی کو خیال کے تنوع پر ترجیح دیتے ہیں، اگر خیال عرش پیما بھی ہے، لیکن اس کے جسم پر الفاظ کا جامہ اچھی طرح سجایا نہیں گیا تو ان کی دانست میں وہ شعر شعر ہی نہیں ہو سکتا ۔ اگر ہم اس خیال پر غیر جانب دارانہ غور کریں تو ہمیں بھی یہ خیال وقیع معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خیال کوئی بھی نیا نہیں ہوتا ۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر طرز ادا اور اسلوب بیان ہی حقیقی شاعری رہ جاتے ہیں ۔ اس صورت میں زبان کو رطب و یابس سے محفوظ رکھنا ہر ادیب و شاعر کا اولین فریضہ ہے اس لیے زبان و بیان پر سخت گیر گرفت بڑی ضروری ہے اور زیبا اس فرض کو کماحقہ، ادا کر رہے ہیں" ¹ ۔

انھوں نے روایت کا خیال رکھا ہے

چنانچہ ان کی شاعری میں روز مرہ اور محاورہ خاص طور سے اپنا رنگ جماتے ہیں اور محاکات نگاری میں چاشنی سے لبریز زبان نے ان کی بہت معاونت کی ہے ۔ اگرچہ انہوں نے زبان اور ذخیرہ الفاظ میں اضافے تو نہیں کیے اور نہ ان کے ہاں اسالیب کا تنوع ملتا ہے لیکن ان کی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو اپنے کلیات میں محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی اور زبان کے حوالے سے روایت تو برقرار رکھ کے یہ بتایا کہ شاعری میں زبان ایسا لطف پیدا کرتی ہے ۔

1۔ " تقریب جانشینی " زیبا ناروی ۔ ارباب اردو پاکستان 1962ء ۔ ص 10

اردو زبان سے زیبا کو دلی وابستگی تھی ۔ چونکہ وہ زبان پر پورا عبور رکھتے تھے، اس لیے لفظوں کا بہت بڑا ذخیرہ اُن کے پاس موجود تھا ۔ وہ کسی بھی موقع اور مرحلے پر اپنے خیالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا سکتے تھے ۔ موضوعات کے اعتبار سے مناسب الفاظ لاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بھی زیبا ایک اچھے شاعر کہلانے کے حقدار ہیں ۔

زیبا کا انداز بیان نہایت پر اثر اور سادہ ہے ، جس میں لطافت اور شعری حسن پایا جاتا ہے ۔ تصنع سے بالکل دور اور روز مرہ کے بہت قریب ہے ۔ اس سلسلے میں ان کا انداز نوح ناروی جیسا ہے ۔

شفق الہ آبادی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

" نوح صاحب اپنے وقت کے ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات شستہ الفاظ، معاملہ بندی اور تکرار الفاظ ہیں۔ آپ ان کا کوئی بھی شعر یا مصرعہ پڑھیں ۔ آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے جوئے شیر رواں ہے، کیا مجال کہ کوئی لفظ بار سماعت ہو۔ نہایت ہی صاف اور شستہ الفاظ میں معاملہ بندی اور شوخ مطالب کو نظم کر دینا کوئی آسان کام نہیں ، مگر نوح صاحب کا یہ خاص انداز ہے۔ مثال کے طور پر میں مرحوم کا صرف ایک شعر پیش کروں گا ۔ ملاحظہ فرمائیں :-

وہ کہتے ہیں آو مری انجمن میں ، مگر میں وہاں اب نہیں جانے والے
کہ اکثر بلایا ، بلا کر بٹھایا ، بٹھا کر اٹھایا ، اٹھا کـــر نـــکالا

غور کیجئیے کہ ایک ایک لفظ ، دو دو اور تین تین مرتبہ نظم کیا گیا ہے، مگر بار سماعت نہیں بلکہ اس سے ان مدارج کا پتہ چلتا ہے جو تخیل کی جان ہیں ۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ زیبا صاحب نے بڑی کامیابی سے استاد مکرم کا یہ اسلوب اپنایا ہے اور وہ اس کے اہل ہیں کہ انہیں نوح صاحب کا جانشین کہا جا سکے"(1)

اگرچہ زیبا کی غزل گوئی پرانے انداز کی حامل ہے ، لیکن اسلوب کی توانائی کے اعتبار سے ان کے اشعار ایک تازہ اور خوشگوار جھونکے کی طرح محسوس ہوتے ہیں ۔ وہ اپنی شاعری کو اپنی ذات کے گہرے ساگر سے ملا کے ایک دلفریب انداز کو جنم دینے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ اپنے اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے ان کا مقام اردو کے کسی اچھے شاعر سے کم نہیں ۔ ان کی زبان و فور جذبات کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے۔ الفاظ سیلاب کی طرح امڈے چلے آتے ہیں ۔ ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے ۔

احسان دانش بھی زیبا کی زبان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" نئے رجحانات سے وہ بھی دور ہیں۔ وہاں زبان کا چٹخارہ اور لہجے کا تیکھا پن ان کا حصہ ہے" ۔2۔

زیبا کے ہاں الفاظ کی کمی نہیں ہے ۔ مختلف کیفیات و احساسات کیلئے الفاظ لاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں میر اور درد کا سوز و گداز اور دھیما اور

1۔ " تقریب جانشینی " 1962ء ۔ ص 13

2۔ " جہان دانش" دانش آباد انار کلی لاهور 1973ء ۔ ص 531

پر اثر لہجہ بھی ملتا ہے اور بعض جگہ اقبال اور غالب کا سا جوش و خروش اور شکوہ بھی دکھائی دیتا ہے ۔

الغرض ہر زمانے میں بہت سے شاعر یا ادیب ایسے ہوتے ہیں جو دنیائے ادب میں گرانقدر خدمات سر انجام دیتے ہیں ، لیکن گرد گمنامی کی تہہ میں دبے رہتے ہیں ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، وہ صفحہ ادب پر ابھرنے لگتے ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے اور یوں ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد زمانہ ان کی قدر کرتا ہے ۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ۔۔۔

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد

زیبا ناروی کا شمار بھی ہم ایسے ہی شاعروں میں کر سکتے ہیں ۔ وہ اپنی ساری زندگی شعر و ادب کی آبیاری میں لگے رہے، اور آخری دم تک شاعری سے وفا نبھاتے رہے۔ لیکن زیبا مرے نہیں وہ اپنا تخلیقی اثاثہ چھوڑ گئے ہیں جو انہیں زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے، اور اگر ان کا کلام چھپ جاتا تو یقیناً اردو شاعری کو بہت فائدہ پہنچتا اور ان کا شمار بیسویں صدی کے نمایاں غزل گو شعراء میں ہوتا ۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیبا ناروی روایت کے حوالے سے ایک اہم شاعر ہیں ۔ زبان و بیان کے خاص معیار کے باعث تاریخ ادب میں ان کا نام خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے اور ان کی شاعری نظر انداز کرنے کے لائق ہرگز نہیں ۔

ضمیمه (انتخاب غزلیات)

انتخاب غزلیات

(1)

آئینہ دیکھ کے پہلے تو وہ خاموش رہا
پھر نہ اپنا بھی سر بزم اسے ہوش رہا

ان کے جلووں سے بہاروں میں بہت جوش رہا
گوشہ گوشہ چمن دہر کا گل پوش رہا

نہ سنا اس نے مرا غم نہ کہا میں نے کبھی
یہ وہ قصہ ہے جو محروم لب و گوش رہا

عرض حسرت پہ کہا اس نے کہ خاموش رہو
اور میں حکم سے اس شوخ کے خاموش رہا

لاکھ ساقی نے پلائی سر میخانہ، مگر
پینے والوں میں وہی ذوق وہی جوش رہا

ان کے مجبور محبت کی یہی شکل رہی
آہ کی، اور بڑی دیر وہ خاموش رہا

کر گیا کام عجب سحر خلیل داور
ماتم دوست میں کعبہ بھی سیہ پوش رہا

دکھ ملے، درد ملے، رنج ملے، لب نہ ہلے
عمر بھر میں تو غم عشق میں خاموش رہا

ایک وہ تھا کہ دوبارہ نہ صدا دی اس نے
ایک میں تھا کہ ہمیشہ ہمہ تن گوش رہا

بار غم وہ ہے کہ بے مانگے ملا ہے سب کو
کوئی انساں نہ زمانے میں سبک دوش رہا

ان سے اظہار تمنا کی نہ صورت نکلی
دل میں پوشیدہ بس اک جذبہ خاموش رہا

احترام در جاناں تھا ضروری لیکن
بے خودی میں مجھے سجدے کا نہ کچھ ہوش رہا

میری روداد وفا سن کے یہ ان کا عالم
کچھ تبسم بھی شریک لب خاموش رہا

آج زیبا مرے ساقی نے کھلائے وہ گل
رشک پر بزم میں شغل مئے سرجوش رہا

(٢)

سحر نقاب تھا جلوہ نہ عتاب نہ تھا — مری نظر کی خطا تھی ادھر حجاب نہ تھا

نگاہ ناز کی جنبش سے زلزلے آئے — جہان شوق میں ہنگام اضطراب نہ تھا

صدا یہ آتی مرے کان میں شباب کے بعد — اک انقلاب کی تمہید تھی شباب نہ تھا

برس رہے تھے وہ جلوے بحد شوق طلب — بقدر ذوق نظر حسن کو حجاب نہ تھا

بچھی ہوئی تھی تمناؤں میں مقامات — جنازہ نکلا تھا دل کا مرے شباب نہ تھا

مری وفائیں پرکھنی تھیں حسن برہم کو — عتاب حد پہ باندازہ عتاب نہ تھا

جبین صبح ازل حسن سے ہو گئی روشن — طلوع داغ تمنا تھا آفتاب نہ تھا

ادائے حسن کس موج میں کھو گیا تھا میں — تم اضطراب نہ سمجھو یہ اضطراب نہ تھا

کلیم، طور، تجلی کلام ، بے ہوشی — بتائیے تو کس انداز میں حجاب نہ تھا

گرا دیا مجھے کیوں چشم پارسائی نے — خراب بادہ تھا میں ، بادہ خراب نہ تھا

ہماری غفلت پیہم نے ہم کو لوٹا ہے — یہ انقلاب کا دھوکا تھا انقلاب نہ تھا

نگاہ شوق نے زیبا طلسم باندھے تھے

حریم حسن میں ہنگامہ شباب نہ تھا

(3)

آج اک نغمہ بے دار سنائی تو دیا — ہم نوا کوئی گلستاں میں دکھائی تو دیا

مہر یا قہر کچھ انجام دکھائی تو دیا — عشق کو حسن کا فرمان سنائی تو دیا

جس قدر پر تھے وہ صیاد نے سب نوچ لیے
خیر جو کچھ بھی کیا حکم رہائی تو دیا

دو قدم وہ جو چلے جی اٹھے مرنے والے
حشر برپا تو ہوا شور سنائی تو دیا

دیکھ کر ہوش بجا اپنے رہے یا نہ رہے
جلوہ ہوش ربا ہم کو دکھائی تو دیا

گو برائی سے کسی شوخ نے چھیڑا لیکن
ذکر، ارباب محبت کا سنائی تو دیا

داد خواہی کیلئے حشر میں آئے عشاق
اک نئی شان کا ہنگامہ دکھائی تو دیا

ہم نے باتیں ہی بس انجمن ناز سنیں
کچھ دکھائی نہ دیا خیر سنائی تو دیا

قصۂ حضرت یوسف پہ کوئی غور کرے
حسن بھی عشق کا دیوانہ دکھائی تو دیا

اب وہ آئیں کہ نہ آئیں مرے غم خانے تک
اک پیام ان کی طرف سے یہ سنائی تو دیا

رہ رو عشق کا پایا نہ کوئی نام سراغ
بار بار اک بگولہ سا دکھائی تو دیا

دل کی آواز پہ خود کہنے لگا حسن ازل
سرمدی شان کا اک نغمہ سنائی تو دیا

پوچھنے مجھ کو چلی آئی اجل غربت میں
کوئی زیبا مری بالیں پہ دکھائی تو دیا

(4)

سپرد گردش دوراں ہے دیکھئے کیا ہو
حواس باختہ انساں ہے دیکھئے کیا ہو

اب الٹی رسم گلستاں ہے دیکھئے کیا ہو
چمن فروش نگہ باں ہے دیکھئے کیا ہو

وہ جلوہ آج نمایاں ہے دیکھئے کیا ہو
نگاہ دست و گریباں ہے دیکھئے کیا ہو

دم ستم ہے تبسم بھی ان کے ہونٹوں پر
نوازشات کا امکاں ہے دیکھئے کیا ہو

جمال اپنی جگہ مطمئن حجاب میں ہے
نگاہ شوق پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو

قدم قدم پہ جہان جنون الفت ہے
فریب خضر و بیاباں ہے دیکھئیے کیا ہو

چلا ہوں حشر میں لے کر گناہ کا انبار
نظر میں رحمت یزداں ہے دیکھئیے کیا ہو

بہار، پھول، فضا، رنگ، بو، صبا، غنچہ
چمن میں جو ہے پریشاں ہے دیکھئیے کیا ہو

بہار آئی ہے زیبا خدا ہی خیر کرے
جنوں کو دعوت زنداں ہے دیکھئیے کیا ہو

(5)

پھر بہار آئی، جلا میں دل خود کام کے ساتھ
پھر پکاریں گے مجھے لوگ نئے نام کے ساتھ

رنگ بدلے گا چمن گردش ایام کے ساتھ
فتنے ابھریں گے ابھی ہر سحر و شام کے ساتھ

جان بھی جائے گی میری تو بڑے کام کے ساتھ
دم جو آئیگا لبوں پر تو ترے نام کے ساتھ

میرے صیاد نے یہ گھات نکالی ہے نئی
آشیاں بھی نظر آتا ہے مجھے دام کے ساتھ

چشم ساقی کے اشارے پہ مجھے چلنا تھا
میری تقدیر بھی گردش میں رہی جام کے ساتھ

بے خبر، خاک بسر، ضبط زدہ، سودائی
وہ خطابات یہ لکھتے ہیں مرے نام کے ساتھ

دل کے دو حرف محبت میں ہیں دوبارہ گراں
نام ہی نام نہیں، دال بھی ہے لام کے ساتھ

جو نہ ملنے تھے ملے وہ بھی سب القاب تمام
دیکھئیے اب وہ پکاریں مجھے کس نام کے ساتھ

کھیلتی رہتی ہے مے خانے میں رندوں کی نظر
کبھی خم سے کبھی شیشے سے کبھی جام کے ساتھ

ظلمت یاس میں قسمت کا ستارہ ڈوبا
بجھ گیا دل بھی مرا شمع سر شام کے ساتھ

ہاتھ سے لکھتے ہیں پیروں سے مٹا دیتے ہیں
دشمنی ہے ازلی، ان کو مرے نام کے ساتھ

حشر سے پہلے ہوئی حشر کی صورت پیدا
صبح کے فتنے ابھر آئے مری شام کے ساتھ

بساطِ عشق پہ رہ رہ کے دل کو مات ہوئی   تری نظر کا نشانہ یہ کائنات ہوئی

دھوئیں میں آہ کے ہر داغ دل چمک نکلا   چراغ جلنے لگے ہر طرف جو رات ہوئی

فسانۂ غم حسرت کی ہوش کیا تکمیل   ہزار اشک بہائے تو ایک بات ہوئی

حلال ہے یہ تصدق حواس ہوش ہوئے   جواب صبح ازل میکدے کی رات ہوئی

غم گراں سے گراں تر سہی محبت میں   مزاج دل پہ گراں کب تمھاری بات ہوئی

کوئی ہے اور کہ روئے ہیں پھول گلشن میں   یہ کس کے اشکوں کی بارش تمام رات ہوئی

لرز کے رہ گئے تارے چمک ابھر نہ رہے -----   ہماری بات ہوئی یا تمھاری بات ہوئی

کہاں ہیں کھوئے ہوئے شاطران عشق و وفا   وہ چال چل گیا کوئی وہ سب کو مات ہوئی

چلا نہ سحر کوئی گریہ و تبسم کا   چمن میں شبنم و گل سے نہ کوئی بات ہوئی

وہ بے نقاب سر شام ادھر جو آ نکلے   اندھیری رات ہماری بھی چاند رات ہوئی

یہ ابتدا کہ فقط مشت خاک تھا انساں   یہ انتہا کہ سر عرش ان سے بات ہوئی

اکیلے بیٹھ کے آنسو بہا لیے ہم نے   سکوت شب میں بیاں دل کی واردات ہوئی

ہم اپنے دوست کی باتیں بتائیں کیا زیبا

خلاف عقل ہوئی جو بھی دل کی مات ہوئی

(8)

یا تو یوں کہئے کہ یہ دنیا مرے قابل نہیں   یا تو میری ذات ہی شائستہ محفل نہیں

وہ کسی کے درد کی راحت فزا منزل نہیں   شام کی تاریکیاں جس صبح میں شامل نہیں

حاصل ہستی کہاں ان کا ابھرنا ڈوبنا   جو ستارے میرے اشک شوق کی منزل نہیں

ہے اسی کے زیر پا طوفان محشر آفریں　　جو سفینہ بحر میں آسودہ ساحل نہیں

اے نگاہ شوق بس تھوڑی سی جرات چاہئیے　　جائزہ لینا تجلی کا کوئی مشکل نہیں

مختلف شکلوں کے دو حرفوں کا مجموعہ ہے بس　　اور کچھ اس کے علاوہ کائنات دل نہیں

میرے ان کے درمیاں ہے جیتے جی یہ فاصلہ　　آنکھ جب جھپکی تو پھر کوئی حد فاصل نہیں

ڈگمگاتی پھر رہی ہیں حسرتوں کی کشتیاں　　کون کہتا ہے کہ دل دریائے بے ساحل نہیں

دل کی خاطر دل کے وہ ارماں کہاں سے لائیں ہم　　سیج سونی ہے کوئی آسودہ منزل نہیں

سعی لا حاصل سمجھ رکھ اے دل پر اضطراب　　بے قراری میں نگاہ دوست اگر شامل نہیں

ڈھونڈتا ہے کوئی لیلی پھر دل شوریدہ سر　　نجد ہے مجنوں بھی ہے ناقہ نہیں محمل نہیں

سر جھکائے ان کی صورت دیکھتا رہتا ہوں میں　　دل نہیں ہے، آئینہ ہے، آئینہ ہے دل نہیں

صاف دھوکا ہے یہ بے داری یہ ہنگامے فریب　　زندگی کی انجمن اک خواب ہے محفل نہیں

دل لگی اچھی، مگر دل کی لگی بھی چاہئیے

کیا بتائیں اب وہ اے زیبا مذاق دل نہیں

(۹)

ادھر لبوں پر ستم کا چرچا ادھر تمنا کی داستاں ہے　　نہ حسن معصوم کم سخن ہے نہ عشق مظلوم بے زباں ہے

مری نظر کے فسوں نہ پوچھو یہ ہر نظر ایک داستاں ہے　　نظر تجلی نظر تحیر نظر زباں ہے نظر بیاں ہے

وفا کہانی جفا بہانہ محبت و دل بھی اک فسانہ　　نہ رزم کوئی نہ بزم کوئی نہ ممتحن ہے نہ امتحاں ہے

ہمیں تو دونوں کو نذر کرنا ہمیں تو حسن ادا پر مرنا　　اسے وہ جانیں اسے وہ سمجھیں یہ نقد دل ہے یہ نقد / جاں ہے

یہ کیسی منطق یہ فلسفہ کیا کسی طرح تو کھلے یہ عقدہ　　نگاہ گردش میں ہے ہماری کہ سارا عالم رواں دواں ہے

تمہاری محفل میں کس کو روکوں اسے نہ ٹوکوں کہ اسکو ٹوکوں　　بقید فطرت بقدر جرات نثار نظر ہے زباں زباں ہے

ہزار مایوسیاں ہوں لیکن رہیں گے ساتھی رہیں گے محسن جہاں حسرت کا ذرہ ذرہ ہمارے دل کا مزاج داں ہے

غضب کا عالم غضب کی باتیں غضب کے تیور غضب کی گھاتیں وہ فتنہ ساماں وہ حشر پیکر ستم میں وہ مثل آسماں ہے

عجب تھا حسن ازل کا منظر کہ اب بھی زیبا ہے روح مضطر

ہمارے پہلو میں دل ہے لرزاں نگاہ آنکھوں میں بھی تپاں ہے

(10)

خواب ہستی کا دور کیا کہیے
رات کٹتی ہے اور کیا کہیے

صبح مے خانہ ہے اداس اداس
دور انجام دور کیا کہیے

عالم غور و فکر ہے دنیا
عالم ذکر و غرور کیا کہیے

ایک چلو شراب لائی رنگ
ذہن ساقی کے طور کیا کہیے

حسن فطرت ہے دامن گل پر
اشک شبنم کو اور کیا کہیے

آپ کی آرزو کا آپ سے ذکر
دل ہے دیوانہ اور کیا کہیے

وہ ہیں مصروف تمکنت زیبا

گفتگو، طرز ، طور کیا کہیے

(11)

سب کہہ رہے ہیں وقت سحر آفتاب ہے
میں کہہ رہا ہوں ان کا ابھرتا شباب ہے

اے کم نگاہ جرات تنقید سے گزر
داغ جگر نہیں طبق آفتاب ہے

دل مست، شوق مست، نظر مست، روح مست
موج ہوائے گل نہیں، موج شراب ہے

لطف حیات کچھ نہیں واعظ پئے بغیر
پینا جو ہے عذاب تو جینا عذاب ہے

تر وہ جبیں نہیں عرقِ انفعال سے — شبنم کی انجمن میں نہاں آفتاب ہے

زیبا مذاقِ شوق سے دامن بچا کے چل

اے میرے دوست دیکھ، زمانہ خراب ہے

(12)

نہ گلِ تر نہ بہاریں نہ گلستاں میرا — میں ہوں زنداں کیلئے اور ہے زنداں میرا

دل گیا ہوش اڑے حسن مٹا عقل چھٹی — آپ نے لوٹ لیا، لٹ گیا ساماں میرا

پھول کھلنے دو گلستاں میں بہار آنے دو — بڑھ کے مل جائیگا دامن سے گریباں میرا

وہ اٹھی پھر نگہِ قہر مرے دل کی طرف — وہ گری برق، ہوا خاک وہ ارماں میرا

گل کھلائے ہیں لہو رو کے مری آنکھوں نے — کوئی دیکھے تو بیاباں میں گلستاں میرا

حلقۂ گیسوئے پیچاں کی اسیری مشکل — یوسفِ عصر نے دیکھا نہیں زنداں میرا

آپ چاہیں تو ابھی دردِ جگر اچھا ہو — غیر ممکن ہے کسی اور سے درماں میرا

میں کسے دوست کہوں کس کو بٹھاؤں دل میں — سینکڑوں ہاتھ ہیں اور ایک گریباں میرا

کس نے جھیلی ہیں شب و روز جفائیں، میں نے — کس کا الفت میں ہوا حال پریشاں، میرا

دل گیا جان بھی ہو جائے گی زیبا صدقے

وہ نظر جانچ رہی ہے ابھی ایماں میرا

مـــآخـــذات

کتابیات

=•=•=•=•=•=•

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتب	مطبوعہ	
1	آزاد ، محمد حسین	آب حیات	لاہور ، منظور پرنٹنگ پریس	سن ندارد
2	احسان دانش	جہان دانش	لاہور ، دانش آباد	1973ء
3	بہزاد لکھنوی	ثنائے حبیب	لاہور ، فروغ اردو ،	سن ندارد
4	جمیل جالبی ، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (دو جلدیں)	لاہور ، ترقی ادب	1975ء
5	حالی ،مولانا الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری	کراچی ، ناظر پریس	سن ندارد
6	خواجہ محمد زکریا ، ڈاکٹر	اردو کی قدیم اصناف شعر	لاہور ، لاہور اکیڈمی	سن ندارد
7	خواجہ محمد زکریا ، ڈاکٹر	اردو میں قطعہ نگاری	لاہور ، ندرت پرنٹرز ،	1977ء
8	خواجہ محمد زکریا ، ڈاکٹر	اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	لاہور ، مجلس ترقی ادب	سن ندارد
9	رفیع الدین اشفاق	اردو میں نعت نگاری	کراچی ،اردو اکیڈمی سندھ	1976ء
10	رفیع الدین ھاشمی ، ڈاکٹر	اصناف ادب	لاہور ، منظور پریس	1979ء
11	رفیق مارہروی ۔ مرتب	زبان داغ	لکھنو، نسیم بکڈپو	سن ندارد
12	سجاد باقر رضوی ،ڈاکٹر	مغرب کے تنقیدی اصول	لاہور ، مطبع عالیہ	1962ء
13	شبلی نعمانی ، علامہ	موازنہ انیس و دبیر	لاہور ، مطبع عالیہ	1964ء
14	شمیم احمد	اصناف سخن اور شعری ھئیتیں	لاہور ، مکتبہ عالیہ	1983ء

نمبرشمار	نام مصنف	نام کتب	مطبوعہ	
15	نعیم احمد	"اقسام شعر" درس بلاغت (مرثیہ)	نئی دھلی، ترقی اردو بیورو،	سن ندارد
16	صفدر حسین	رزم نگاران کربلا	لاھور، سنگ میل پبلیکشنز	" "
17	ضمیر اختر نقوی	اردو مرثیہ پاکستان میں	کراچی، سید ایثڈ ایم جناح روڈ	" "
18	عابد علی عابد	اصول انتقاد ادبیات	لاھور، مجلس ترقی ادب	1966ء
19	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	غزل اور مطالعہ غزل	کراچی، انجمن ترقی اردو	1955ء
20	عرفان رشدی، مولانا	معرکہ حق و باطل	لاھور، مجلس علما پاکستان	سن ندارد
21	عنوان چشتی، ڈاکٹر	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	لاھور، شرکت پرنٹنگ پریس	" "
22	فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقاء	کراچی، سنگ میل	" "
23	فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	اردو کی نعتیہ شاعری	لاھور، آئینہ ادب	" "
24	کلیم قادری، محمد دین	مدینۃ الاولیاء	لاہور، بختیار پرنٹرز	" "
25	نصرت قریشی ـ مرتب	تقریب جانشینی	لاھور، ارباب اردو پاکستان	1962ء
26	نورالحسن ھاشمی، ڈاکٹر	دلی کا دبستان شاعری	کراچی، اردو اکیڈمی،	1966ء

غیر مطبوعہ مواد

1ـ زیبا ناروی کا غیر مطبوعہ کلیات جو راقمہ کو انجم زیبائی صاحب سے حاصل ھوا ـ

2ـ ذوق زیبائی صاحب کا غیر مطبوعہ منظوم ھدیہ جو انھوں نے زیبا ناروی کی وفات پر لکھا، راقمہ کو انجم زیبائی صاحب کی وساطت سے ملا ـ

3- خالد بھٹی صاحب نے زیبا ناروی کی دوسری برسی کے موقع پر منعقد ہونے والی تقریب میں پڑھنے کیلئے ایک مقالہ تحریر کیا جو انہوں نے راقمہ کو بھیجا ۔

4- مطلوب صاحب نے زیبا ناروی کی پہلی برسی کے موقع پر ایک مقالہ پڑھا اور انہوں نے وہ خود راقمہ کو دیا ۔

5- وحید خیال صاحب نے زیبا کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کیے اور راقمہ کو بھیجے ۔

6- ابوالبشر کاظمی صاحب سے 9-10-89 کو لاہور میں کیا گیا انٹرویو ۔

7- اکرم شاہ صاحب سے 20-8-89 " " " "

8- انجم زیبائی صاحب سے 20-6-89 " " " "

9- سید محمد طیب صاحب سے 10-10-89 " " " "

10- عالیہ نسیم سے 8-10-89 " " " "

11- قمر احسانلوی صاحب سے 21-6-89 " " " "

12- مطلوب احمد صاحب سے 26-6-89 " " " "

13- ممتاز ملکہ صاحبہ سے 10-10-89 " " " "

14- نسیم بیگم صاحبہ سے 23-8-89 " " " "

تحقیقی مقالات

=.=.=.=.=.=.=.=.

1- احسن زیدی، ڈاکٹر " اردو میں منقبت نگاری " غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی ، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری 1984ء

ے - ڈی - نسیم ، ڈاکٹر "اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر" غیر مطبوعہ مقالہ برائے
ن ایچ ڈی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری -

معصومہ بخاری " داغ ہندی مسلم تہذیب کی روشنی میں" غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم - اے (اردو)
مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری 1988ء

رسائل و جرائد

آواز	لاہور	1956ء
احسن	رامپور	1950ء
استقلال	لاہور	1948ء
پریم	جموں و کشمیر	1946ء
پنچ	دہلی	1937ء
پنچ	دہلی	1938ء
جمیل	دہلی	1938ء
رہنمائے تعلیم	دہلی	1962ء
شام و سحر نعت نمبر (دو جلد) لاہور	، جنوری ، فروری ،	1922ء
شاہکار	لاہور	1950ء
صریر خامہ - قصیدہ نمبر	سندھ یونیورسٹی -	1948ء
عکس نو	کراچی	1974ء

عکس نو	کراچی	1976ء
فلم لائٹ	لاھور	1953ء
مشہور	دھلی	1945ء
نگار (اصناف شاعری نمبر)	کراچی	نومبر، دسمبر 1967ء
نگارستان	کراچی	1953ء
نیرنگ خیال	لاھور	1947ء